قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

فروری 2025 قیمت ₹25

ماہنامہ

اُردو دُنیَا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچوں کا کتب خانہ

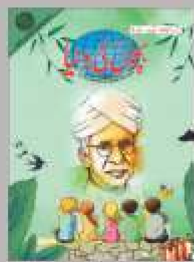

ان کے علاوہ:

- کہکشاں ◆ زبان شناسی
- میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب
- بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
نئی دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:27، شمارہ:2، فروری 2025

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : عبدالرشید اعظمی، شاداب شمیم

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
سالاسار امیجنگ سسٹمس
A-97، سیکٹر 58، نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/25 روپے سالانہ -/240 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔ 500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
- ہماری بات 4

خطوط
- ربط والتفات — قارئین کے خطوط 5

زبان و تعلم
- اردو ذریعۂ تعلیم اور موجودہ تکنیکی منظر نامہ: این ای پی 2020 کے تناظر میں — محمد نعمان خاں 7

ادب زاویے اور جہات
- ترجمہ نگاری اور علمی اشتراک دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے حوالے سے — محمد خالد اعظمی 10

- بوعلی شاہ قلندر کی فارسی شاعری میں صوفیانہ عناصر — امیر عباس 13
- مسئلۂ تذکیر و تانیث اور مطالعۂ جلال — شاہ نواز فیاض 16
- اردو نثر کے فروغ میں ناصر نذیر فراق کی ادبی خدمات — صابر ریاض خاص 19
- قاضی عبدالودود کا تصور تحقیق و تدوین — بلوندر سنگھ 22
- امتیاز علی عرشی کی تدوینی خدمات — فیضان اشرف 25
- شمس الرحمن فاروقی کے افسانوں کی تخلیقی زبان اور پس نوآبادیاتی مباحث — اقبال حسین 29

- کھورٹھا میں لوک ادب — محمد طیب 32

چراغ راہ
- بھگوت گیتا — حسن الدین احمد 36
- نالاڈیار — غازی حمید اللہ خاں 38
- رامائن کا ایک مترجم شنکر دیال فرحت لکھنوی — افتخار احمد 41

شخصیات
- طوطی ہند امیر خسرو کی شخصیت اور شاعری — حامد اشرف 44

- فانی بدایونی کی فارسی غزل گوئی — نیلوفر حفیظ 47
- وقت کی نوک سے ٹپکتا لمحہ: بانی — شاذیہ عمیر 51
- جنوبی ہند میں فکر غالب کا مینار: علامہ شاکر نائطی — ابوبکر ابراہیم عمری 54
- راز کا شعری جہاں — اکمل نعیم صدیقی 56
- مظفر حنفی کی شاعرانہ انفرادیت — محمد اسرار 60

عالمی ادبیات
- عربی زبان کی امتیازی خصوصیات — عبدالحلیم ندوی 62

سائنس
- فخر ہندوستان: دوم، خلا میں سورج کی مشاہدہ گاہ ایل-اول — انیس الحسن صدیقی 64

فلسفہ
- اپنشد — رائے شیو موہن لعل ماتھر 67

خصوصی گفتگو
- اردو کا صوتی ذخیرہ اور صوتی نظام لاثانی ہے: پروفیسر رئیس انور — خان محمد رضوان 70

سلسلۂ صحافت
- ماہنامہ شاعر اور افتخار امام صدیقی — قمر احمد 73

کتابوں کی دنیا
- تعارف و تبصرہ — ادارہ 77

خبرنامہ
- اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 82

ہماری بات

عالمی سطح پر جو نظری، فکری تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں، ان تغیرات کے اثرات ہمارے افکار و اقدار پر بھی پڑ رہے ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے بھی ہمارے ذہنی اور فکری منظرنامے کو بہت حد تک تبدیل کیا ہے، اسی لیے آج کے عہد میں ہم سب اپنی فکر کا سلسلہ سائنس اور تکنیک سے جوڑنے پر مجبور ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ماضی کے مقابلے اکیسویں صدی میں تکنیکی ایجادات و اختراعات کی پیش رفت غیر معمولی قدم ہے۔ اس کی وجہ سے ہماری معاشرت کا طور وطرز بھی بدلا ہے، ہمارے انداز فکر میں بھی بہت حد تک تبدیلی اسی کی دین ہے، خاص طور پر بہت سے ایسے تکنیکی وسائل نے جنم لیا ہے جس کی وجہ سے ہماری بہت سی مشکلیں آسان ہوگئی ہیں۔ پہلے جس کام میں ہمارے کئی مہینے اور سال صرف ہو جایا کرتے تھے، اب جدید تکنیک کی وجہ سے چند گھنٹوں اور دنوں میں وہ سارے کام پایہ تکمیل کو پہنچ سکتے ہیں۔ یہ اور بات کہ ایسے کام کی معنویت پر اب سوالات اٹھنے لگے ہیں۔ خاص طور پر مصنوعی ذہانت کے تعلق سے ہمارے ذہنوں میں بہت سے خدشات بھی جنم لے رہے ہیں کیونکہ دانشوران کے ایک بڑے حلقے کا خیال ہے کہ انسانی ذہن کی بات ہی کچھ اور ہے۔ یہ مصنوعی ذہانت بھی تو دراصل انسانی ذہن ہی کی تخلیق کردہ ہے، اس لیے اس میں انسانی ذہن سے زیادہ قوت یا طاقت شاید نہ ہو، پھر بھی جدید تکنیک آج کے عہد کی ایک ضرورت بن گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تکنیک کے کچھ منفی اثرات کے باوجود آج مصنوعی ذہانت کا ہر سطح پر سہارا لیا جا رہا ہے۔

مصنوعی ذہانت اس وقت ایک ایسا موضوع بن گیا ہے جس پر مختلف ممالک کے مفکرین غور و فکر بھی کر رہے ہیں۔ اس کے تمام زاویوں اور جہات کا جائزہ بھی لے رہے ہیں، اس لیے مصنوعی ذہانت کے حوالے سے لوگوں کی رائیں بھی مختلف ہیں۔ کچھ لوگوں کے لیے یقینی طور پر مصنوعی ذہانت غیر اطمینان بخش عمل ہے کیونکہ اس میں اغلاط کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں، لیکن کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ مصنوعی ذہانت سے انسانی ذہانت کو تھوڑی بہت راحت تو ضرور ملی ہے کہ کسی بھی کام میں جو دشواریاں پیدا ہوتی تھیں، کم از کم اس سے کچھ دشواریوں میں کمی تو آجاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ماہرین نے کمپیوٹر سسٹم کو اس انداز سے ڈیزائن کیا ہے کہ وہ انسانی ذہن کی طرح کام کرتا ہے اور کمپیوٹر کو جس طرح کا کمانڈ دیا جاتا ہے اسی طرح وہ کام انجام بھی دیتا ہے اور یہ ترقی کے منازل طے کر کے اس مقام پر پہنچ چکا ہے کہ وہ خود صحیح اور غلط کا فرق کرنے کے ساتھ ساتھ جذبات کو بھی محسوس کر سکتا ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں اس کا عمل دخل دیکھنے کو مل بھی رہا ہے۔ اے آئی (AI) (مصنوعی ذہانت) ایسی چیز ہے جس میں انسانوں کی طرح سوچنے، سمجھنے، سیکھنے، سکھانے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج کے عہد میں ترقی کی کلید ٹکنالوجی ہی ہے۔ اس سے اگر گریز کیا جائے تو ترقی کی راہ میں دشواریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اسی لیے حکومت ہند بھی ٹکنالوجی کے استعمال پر زور دے رہی ہے، خاص طور پر این ای پی 2020 میں ٹکنالوجی پر خصوصی توجہ دی گئی ہے کہ اس کے ذریعے تعلیمی نظام کو زیادہ بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ تعلیم و تدریس کی راہ میں جو دشواریاں ہیں انھیں بھی اس کے ذریعے دور کیا جا سکتا ہے اور اسی کے ذریعے زبانوں کو بھی وسعت دی جا سکتی ہے اور امکانات کے نئے در کھل سکتے ہیں۔ اس لیے ٹکنالوجی سے خوف زدہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے بلکہ اگر اس کا مثبت استعمال کیا جائے تو اس کے بہت مفید اور مثبت نتائج برآمد ہوں گے۔

بہت ساری زبانوں نے ٹکنالوجی سے اپنا دائرہ وسیع کیا ہے، عصری ٹکنالوجی کے میدان میں جو نئے تجربات کیے جا رہے ہیں، ہمیں بھی ان سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے، بس ذرا احتیاط رہ کر۔ اگر ٹکنالوجی سے استفادے کا عمل جاری رکھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس سے ہماری زبان، ادب اور اس کے متعلقات کو فائدہ نہ ہو، اس ٹکنالوجی سے ہماری رسائی کا دائرہ محدود ہونے کے بجائے وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا، اور اس سے زبان و ادب کو بھی فروغ ملے گا کہ اب دور دراز علاقوں اور ملکوں تک رسائی کا واحد ذریعہ یہی ٹکنالوجی ہے۔ اسی کے ذریعے ہم پوری دنیا سے جڑ سکتے ہیں اور اجنبی ملکوں کی تہذیب و معاشرت سے بھی آگاہ ہو سکتے ہیں۔

شمس اقبال

ربط والتفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

ماہنامہ 'اردو دنیا' جنوری 2025 کا شمارہ ملا۔ اس کا دیدہ زیب سرورق دیکھ کر مسرت کا احساس ہوا۔ یہ رسالہ ایک طرف جہاں بہت خوش رنگ ہے وہیں اس کے مضامین بھی نوع نوع کے ہیں۔ خطوط، سمینار رپورٹ، ادب زاویے اور جہات، زبان وتعلیم، روشن مینار، ترسیل ادبیات واقدار، شخصیات، تہذیب وتاریخ، خراج عقیدت، فلم، نیا آسمان نئے ستارے، کتابوں کی دنیا، خبرنامہ جیسے خوبصورت اور قابل قدر ذیلی عناوین قائم کیے گئے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں تو بہت خوشی ہوتی ہے کہ اردو دنیا نت نئی ترقیوں کے منازل طے کر رہا ہے۔ روز نئی چیزیں اس میگزین میں نظر آرہی ہیں۔ مضامین اور ذیلی عناوین کا یہ تنوع اس بات کا اظہار ہے کہ اردو دنیا میں شعوری طور پر مختلف النوع مضامین کو شائع کرنے کی کوشش جاری ہے۔ تاکہ زندگی سے تعلق رکھنے والے مختلف مضامین اس میں شائع ہوں اور یکسانیت باقی نہ رہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ بہت سارے ایسے رسائل اور میگزین ہیں جن میں ایک ہی طرح کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ یا ایک ہی موضوع پر مستقل مضامین چھپتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان رسالوں میں کوئی زندگی ہی نہیں، یا رسالے کی معنویت قائم کرنے کے لیے اس میں تنوع کی اشد ضرورت ہے لیکن بیشتر رسائل ان مضامین کو شائع کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں جو آسانی سے ہاتھ آجائیں۔ اس کے لیے کوئی کوشش نہیں کرتے۔ اس تعلق سے اردو دنیا کی اپنی انفرادیت ہے اور اپنا امتیاز ہے۔ میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ اردو دنیا میں جن لوگوں کے مضامین شائع ہوجاتے ہیں، پھر کئی مہینوں تک ان کے مضامین شائع نہیں ہوتے جبکہ اردو کے بعض رسائل ایسے بھی ہیں جن میں چند افراد ہمیشہ چھپتے رہتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ عوامی رسائل نہ ہوکر چند افراد کے رسائل ہیں۔ اس حوالے سے بھی اردو دنیا کی انفرادیت اور امتیاز مسلم ہے۔ اس نے ہمیشہ ان خرابیوں اور کوتاہیوں سے خود کو دور رکھا ہے۔ اس بار یہ دیکھ کر بھی بہت خوشی ہوئی کہ اردو دنیا میں دیگر ادبی مضامین کے علاوہ ترسیل ادبیات واقدار کے تحت بھی ایک ذیلی عنوان قائم کیا گیا ہے۔ اردو والے عام طور پر صرف اردو میں لکھے گئے ادب پر ہی اپنی توجہ صرف کرتے ہیں۔ دوسری زبان وتہذیب اور کلچر کی طرف ان کی نگاہ بہت کم متوجہ ہوتی ہے۔ سبرامنیم بھارتی جدید ترسیل ادب کے حوالے سے بہت اہم نام ہے۔ ہندوستانی ادب پر ان کا گہرا اثر ہے۔ ان کی شخصیت اور ادبی کارناموں کے حوالے سے طیب خرادی کا مضمون بہت عمدہ ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر سبرامنیم بھارتی کی زندگی اور ادبی سرمائے سے گہری واقفیت ہوتی ہے۔ اس طرح کے مضامین اردو رسالوں میں بہت کم شائع ہوتے ہیں۔ اس نوع کے مضامین پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ہم صرف اپنے ہی ادبی سرمائے میں دفن ہوگئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو رسائل دوسری زبانوں کے ادب اور ادیبوں کی طرف بھی مائل ہوں تاکہ ہم داخلی اور روحانی طور پر خود کو ثروت مند محسوس کریں۔ ہمارا علمی، تہذیبی اور سماجی رشتہ اس کوشش وعمل سے نہ صرف مستحکم ہوگا بلکہ زندگی کا نیا شعور بھی ہمارے اندر پیدا ہوگا۔ دنیا کو نئی نظر سے دیکھنے کا زاویہ خلق ہوگا اور ہماری بصیرتوں میں اضافہ ہوگا۔ اس شمارے میں اس قدر خوبصورت اور علم ونظر میں روشنی پیدا کرنے والے مضامین شامل ہیں کہ انفرادی طور پر ان سب پر بات کرنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک خط میں تمام مضامین پر بات نہیں کی جاسکتی۔ اگر کی جائے تو پھر اس خط کی بھی صورت ایک مضمون کی ہوجائے گی۔ آخر میں صرف سمینار رپورٹ کے تحت پیش کیے گئے مضمون 'معاصر اردو ادب کا تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی منظرنامہ' پر ضرور بات کرنا چاہوں گا۔ اس مضمون کی حیثیت روداد کی ہے۔ اس روداد میں

سمینار کی تقریباً تمام باتیں آگئی ہیں۔ جے این یو کی ریسرچ اسکالر شہلا کلیم نے بہت خوبصورتی کے ساتھ اس روداد کو پیش کیا ہے۔ سمینار بھی بہت اہم موضوع پر تھا اور بہت اچھے مقالے اس سمینار میں پڑھے گئے۔ قومی کونسل نے آن لائن بھی اس سمینار کو پیش کیا تھا لہٰذا جو لوگ جے این یو نہیں جاسکے انھوں نے آن لائن اسے دیکھا اور اپنے علم میں اضافہ کیا۔ اس مضمون میں جو تصویریں لگائی گئی ہیں وہ بہت خوبصورت ہیں، انھیں دیکھ کر بھی سمینار کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور سمینار کے متعلق خبر ملتی ہے۔

جاوید رئیس، دہرادون، اتراکھنڈ

'اردو دنیا' جنوری 2025 کا تازہ شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ ایڈیٹر جناب ڈاکٹر شمس اقبال صاحب نے سچ کہا: (ہمارے ملک میں) ''الگ الگ زبان اور کلچر کے باوجود ہندوستانیت ہر زبان کے خمیر میں شامل ہے۔'' ادب زاویے کے کالم میں 'مخطوطہ شناسی اور ادبی تحقیق' بہت ہی اہم مضمون ہے۔ مضمون نگار امتیاز احمد نے تعریف و تفہیم اور اصول پر بڑی مفصل بحث کی ہے۔

زبان و تعلیم کے کالم میں 'طلبا کی تعلیم پر گھر اور اسکول کے ماحول کا اثر' مضمون نگار شفاعت احمد نے بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق کافی اچھی گفتگو کی ہے۔

کتابوں کی دنیا میں شہر برہان پور کے نوجوان قلمکار محترم تنویر رضا برکاتی (چیئرمین دارالسرور ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، برہان پور) کا ماہنامہ اردو آنگن کے 'ڈاکٹر محمود شیخ نمبر' پر بہترین تبصرہ شامل ہے، جسے دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس مشہور و معروف اور مقبول رسالے میں ہمارے شہر برہان پور قلمکار بھی شائع ہورہے ہیں۔ اردو دنیا کی ادارتی ٹیم کا شکریہ۔ مجموعی طور پر پورا شمارہ ہی مطالعے کے لائق ہے۔

صائمہ نکہت، مدرس: مدرسہ فاروقیہ سلطان العلوم، مومن پورہ، برہان پور (ایم پی)

'اردو دنیا' کا شمارہ ماہِ دسمبر 2024 باصرہ نواز ہوا۔ سرورق پر قلم اور دوات کی رونمائی شمارہ کی رعنائی میں اضافہ کیے ہوئے ہے۔ پس منظر سادہ ہے۔ قلم خاموشی سے اس بات کا اعلان کررہا ہے کہ 'من شاہِ جہانم'۔ بے شک سرورق آنکھوں میں رچ بس گیا۔ خط لکھتے وقت عزیز نبیل کے شعر نے مدد کی۔

چمک اٹھا ہر ایک پل، مہک اٹھے قلم دوات
کسی کے نام دل کا انتساب لکھ رہے تھے ہم

ہماری بات میں مدیر محترم نے اردو زبان پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ ابتدائی پانچ سطروں میں اردو کی عظمت کا بیان ہے۔ بعد از آں مستقبل کے لیے اردو کے روڈ میپ کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ یہ باتیں دعوتِ فکر دینے والی ہیں۔ بزمِ جہاں کے انداز کو دیکھتے ہوئے بلاشبہ ہمیں اپنا انداز بدلنا ہوگا، کیونکہ معاصر ادب کے معاملات و مسائل جب تک ہماری زبان کا حصہ نہیں بنیں گے تب تک ان کی اہمیت نہ ہوگی۔ آپ کی اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بھی درست ہے کہ ہمیں اپنے ملک اور مٹی کا قرض اتارنا ہوگا کہ اس زبان کے خمیر میں محبت ہے، ایثار بھی اور قربانی بھی۔ اس باب میں مدیر موصوف نے لال چند فلک کا شعر بھی نقل کیا ہے۔ بہت خوب۔ ادبی مباحث کے زیرِ عنوان 'وہاب اشرفی کے افسانے' اس شمارہ کا بہت عمدہ مضمون ہے۔ اس سے یقیناً وہاب شناسی میں مدد ملے گی۔ شخصیات کے تحت 'انجم مانپوری.. ایک منفرد طنز نگار' پڑھ کر خوشی ہوئی۔ انجم صاحب کی جھلک پر شنکر دیال شرما کا گمان ہوا۔ بحیثیت مجموعی سال رواں کا آخری شمارہ بھی یادگار ہے۔

محمد رفیع انصاری، 'المدنی' 734 بھوسار محلہ، بھیونڈی 421302 ضلع تھانے، مہاراشٹر

ماہنامہ 'اردو دنیا' دسمبر 2024 کا شمارہ بروقت موصول ہوا۔ سرورق پر قلم اور دوات یعنی علم و تعلیم کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ ہماری بات میں مدیر ڈاکٹر شمس اقبال نے اردو کی بقا و ترقی کے تعلق سے عصری انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کی منشا اور غرض و غایت یہ ہے کہ اردو کو عصری ٹکنالوجی سے مکمل مربوط کیا جائے۔ انھوں نے اس بات کا انکشاف کیا کہ اردو صرف شاعری کی زبان نہیں بلکہ سائنس اور ٹکنالوجی کی بھی زبان ہے اور بہت سارا سائنسی اور سماجی مواد اردو میں موجود ہے۔ 'ربط و التفات' کالم برقرار رکھیں، اس میں مضامین سے متعلق جو تبصرے شائع ہوتے ہیں وہ بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ اس سے ہر شمارے کی قدر و قیمت اور مقام کا پتا چلتا ہے۔ عمران احمد نے فارسی تذکروں کے تنقیدی اثرات اردو تذکروں میں بہت اہم نکات کی طرف اشارے کیے ہیں۔ فہیم اشرف نے وہاب اشرفی کے افسانوں کا عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ شبیر عالم نے 'انجم مانپوری ایک منفرد طنز نگار' بھی معلوماتی مضمون ہے۔ نصرت پروین نے 'دہلی کی تہذیبی روایت کا امین بشیرالدین احمد دہلوی'، حنا کوثر 'ہندوستانی تہذیب کا عکاس نظیر اکبرآبادی'، نایاب حسن نے 'کیا ناول نگار کشادہ ذہن ہوتا ہے'، 'محمد فیروز عالم نے 'فاصلاتی تعلیم آج کی ضرورت'، شکیل احمد 'ودربھ کا لسانی، علمی، ادبی و تہذیبی منظرنامہ'، قیصر سرمست 'آنکھ' کے مضامین عمدہ اور معلوماتی ہیں۔ رسالے میں شامل بقیہ مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ماہنامہ 'اردو دنیا' جنوری 2025 کا شمارہ بھی موصول ہوا۔ ہر مہینے وقت پر رسالے ملنے سے دلی خوشی ہوتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' کے مدیر ڈاکٹر شمس اقبال اپنے اداریے میں اردو زبان و ادب سے متعلق فکر انگیز، بصیرت افروز افکار و نظریات پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے زبانوں کی اہمیت، عظمت اور افادیت کو واضح کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ زبانیں علاقائی حدود و قیود سے مبرا ہوتی ہیں۔ زبانیں ملک کی تعمیر و تشکیل میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہماری ہندوستانی بھاشائیں دراصل انسانیت اساس ہیں کیونکہ یہاں لسانی اور ثقافتی اقدار و افکار پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ہندوستان ہمہ لسانی ملک ہے جتنی زیادہ زبانیں ہوں گی کلچر اتنا ہی مضبوط و طاقتور ہوگا۔ رسالے میں شامل سمینار رپورٹ سے جدید نئے معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ مشمولات کی نوعیت و موضوعات نئے انداز سے لکھے گئے ہیں۔ ان میں جدت و ندرت کے ساتھ جدید معلومات کا خزانہ موجود ہے۔ کتابوں کی دنیا، خبرنامہ سے ہندوستان میں اردو کی حالیہ ادبی سرگرمیوں سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔ ادبی تبصرے بھی توازن والے ہوتے ہیں۔ اس میں خوبیوں اور خرابیوں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ 100 صفحات کے اس رسالے میں اسکالر اور طلبات کے لیے بہت کچھ ملے گا۔ اس کو پڑھ کر ادبی تاریخ میں اضافہ کرکے مستقبل کو درخشاں اور تابناک بناسکتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ و اکیڈمک سینٹ ممبر، تلنگانہ یونیورسٹی، حیدرآباد، تلنگانہ، موبائل 9603018825

محمد نعمان خاں

اردو ذریعۂ تعلیم اور موجودہ تکنیکی منظر نامہ: این ای پی 2020 کے تناظر میں

ہندوستان کثیر آبادی والا جمہوری ملک ہے جو عالمی سطح پر بڑی اقتصادی طاقت بننے کی جانب گامزن ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے مسودے کے مطابق نئے قومی، تعلیمی، ایجنڈے کے مقاصد و اہداف میں عالمی تعلیم کے ترقیاتی ایجنڈے کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے تاکہ ''جامع اور مساوی معیار کی تعلیم کو یقینی بنایا جائے اور تدریس وآموزش کے مواقع فراہم کیے جاسکیں۔''

مشینی لرننگ اور مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence) جیسی روزافزوں سائنسی وتکنیکی ترقیات کے سبب عالمی سطح پر زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح تعلیمی امور میں بھی جو اہم تبدیلیاں واقع ہورہی ہیں انھیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ تبدیل شدہ نئے حالات کے تناظر میں آموزگاروں کو عصری مسائل سے ہم آہنگ کرنے، منطقی اور تخلیقی ذہن کے ساتھ سوچنے، بین العلومیت کی اہمیت وضرورت کو سمجھنے اور حاصل شدہ نئی معلومات کا نئے حالات کی روشنی میں استفادہ کرنے کے مواقع میسّر آسکیں اس کے لیے طریقۂ تعلیم وتدریس کو مزید تجرباتی انکشافی، جامع، منضبط، پُرلطف، مؤثر اور مفید بنانے کی ضرورت ہے۔

تعلیمی پالیسی ایسی ہو جو طلبہ کی ہمہ جہت صلاحیتوں کے فروغ کے ساتھ ان کی کردارسازی، جذبۂ حب الوطنی، انسان دوستی اور انہیں اچھا شہری بنانے میں معاون ثابت ہو اور وطن پرستی، زبان وتہذیب وثقافت کے تئیں نہ صرف بیداری اور حساسیت پیدا کرے بلکہ ماضی کی شان دار روایات کے تحفظ کے احساس کے ساتھ مستقبل کے معاملات ومسائل وحالات کی چنوتیوں کے تئیں مثبت تعمیری اقدامات کا سبب بن سکے۔ 'قومی تعلیمی پالیسی 2020' میں طلبہ کی تخلیقی اور تفکیری صلاحیتوں کو فروغ دینے پر خاص زور اس وجہ سے دیا گیا ہے کہ علم، دانش وری اور حق کی تلاش کو ہندوستانی فکری اور فلسفیانہ روایات میں ہمیشہ اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ ہندوستان میں عہدِ عتیق ہی سے حصولِ علم یا تعلیم کا مقصد محض روزگار اور تعلیم حاصل کرنا ہی نہیں بلکہ اعلیٰ انسانی صفات اور ادراکِ نفس کی صلاحیت کا حصول بھی رہا ہے۔ نالندہ، تکشلا اور ولبھی جیسے عالمی معیار کے اداروں نے تعلیم وتدریس کے مختلف شعبوں میں تدریس وتحقیق کی اعلیٰ مثالیں پیش کر کے مقامی اور غیر مقامی طلبہ کو مستفیض کیا تھا۔ یہی وہ نظامِ تعلیم ہے جس نے چرک، آریہ بھٹ، بھاسکراچاریہ، برہما گپت، چانکیہ، پانینی، پتنجلی، ناگارجن، شنکردیو وغیرہ ماہرین علوم دانشوروں کو جنم دیا۔ جنھوں نے ریاضی، فلکیات، علم طب وتکنیک، فنِ تعمیر، یوگ اور فنون لطیفہ میں ایسی اہم ترین خدمات انجام دی ہیں کہ ان کے اثرات آج بھی دیکھے اور محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ قومی تعلیمی، پالیسی اس امر پر اصرار کرتی ہے کہ نئی نسل کے طلبہ ان پر نہ صرف تحقیق کریں بلکہ ان کی فتوحات کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

'قومی تعلیمی پالیسی 2020' میں استاد کی اہمیت، ضرورت اور مرکزیت کو نہ صرف تسلیم کیا گیا ہے بلکہ ان کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو عصری تقاضوں کے بموجب فروغ دینے میں ہرممکن کوشش کرنے کی تاکید بھی کی گئی ہے۔

یہ تعلیمی پالیسی ہر طبقے کے طلبہ کو معیاری تعلیم فراہم کرنے کی پُرزور سفارش کرتی ہے تاکہ اس کے ذریعے سماج میں مساوات کی فضا، باہمی شراکت وشمولیت کی عادت اور بہتر معاشرتی اور معاشی صورتِ حال پیدا ہو اور ملک وقوم کو ہر شعبے میں پائداری اور استحکام حاصل ہوسکے اور آئین کی پاسداری اور اس کی تکثیریت کو عملی شکل دی جاسکے۔

اس تعلیمی پالیسی کا وژن ہندوستانی اقدار اساس نظامِ تعلیم کا نفوذ ہے جس کے تحت معیاری تعلیم فراہم کر کے تعلیمی امور میں ہندوستان کو عالمی معیار عطا کر کے ایسا مثالی صحت مند علمی معاشرہ بنانا ہے جس پر ہر ہندوستانی فخر محسوس کرے اور یہ عملاً اس کے افکار واعمال اور رویوں میں بھی ظاہر ہو اور وہ حقوقِ انسانی کی پاسداری اور عالمی فلاح وبہبود کے تصور کے ساتھ عملی زندگی گذار سکے۔

'قومی تعلیمی پالیسی - 2020' میں جہاں تمام صحت مند قدیم روایات واقدار کو ملحوظ رکھا گیا ہے وہیں تعلیم کے جدید عالمی معیار کے ان تمام پہلوؤں پر بھی خاص توجہ صرف کی گئی ہے جو کہ ماضی کا رشتہ حال اور مستقبل سے منسلک کر کے عصرِ حاضر کی نسلِ نو کو باعمل اور بہتر انسان بنانے اور تعلیم کی عالم گیر رسائی کو یقینی بنانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

موجودہ ثقافتی اور سماجی تناظر میں قدیم وجدید کی صحت مند روایات واقدار کا تحفظ اور ان پر عمل پیرا ہونا اس لیے ضروری ہے تاکہ ہمارے آج اور آنے والے کل کو سنوارنے اور بہتر بنانے میں خاطر خواہ مدد مل سکے۔

'قومی تعلیمی پالیسی - 2020' میں جو اہم سفارشات اور تجاویز شامل ہیں، ان میں قومی تشخص مرکز قائم

کرنے اور جنرل ایجوکیشن کونسل (GEC) کے تحت نیشنل پروفیشنل اسٹینڈرڈ سیٹنگ باڈی (NPSSB) کی تشکیل کے ذریعے عمومی گائڈ لائن مرتب کرنے نیز تعلیمی اہداف کے حصول کے لیے خصوصی تعلیمی علاقہ (Special education zone)، صنفی شمولیاتی فنڈ کے قیام و نفاذ کی تجاویز شامل ہیں تاکہ پائدار ترقیاتی مقاصد (SDG-4) کی جانب پیش رفت کی جاسکے۔

'قومی تعلیمی پالیسی - 2020' کا مطمحِ نظر علوم جدیدہ کے حصول کے ساتھ ہندوستانی اقدار اساس نظام تعلیم کا ایسا نفاذ ہے جو مقامیت یا ہندوستانیت کے ساتھ عالم گیر تعلیمی معیار کو بھی یقینی بنا سکے تاکہ 'عالمی سوچ اور مقامی عمل' کے منصوبے پر عمل درآمد ہو سکے اور ہمارا تعلیمی معیار بہتر اور مثالی بن جائے اور وسیع تر آزادانہ تعلیم (Liberal Education) کا تصور، عملی شکل اختیار کر سکے۔

مذکورہ بالا امور و اہداف کی حصول یابی کے لیے تمام تعلیمی اداروں اور کمیونٹی اور سول سوسائٹیز کے مابین باہمی شراکت داری کو فروغ دینے کے لیے حکومت اور اداروں سے وابستہ ذمے داران کا عملی تعاون ضروری ہے تبھی حاشیے پر رہنے والے سماج کے کمزور طبقات کی تعلیمی اصلاح و فلاح کے کام کی جانب پیش رفت ہو سکے گی۔

'قومی تعلیمی پالیسی - 2020' میں جہاں بچوں کے ذہنی و تعلیمی نشوونما پر توجہ دی گئی ہے وہیں نصابی، تدریسی اور امتحانی نظام میں اصلاحات کے ساتھ اساتذہ کی پیشہ ورانہ تربیت کی سفارش بھی کی گئی ہے اور اس کے تحت زبان کی تعلیم، بالخصوص مادری زبان کے ذریعے تعلیم کے حصول پر خاص توجہ دی گئی ہے کیونکہ زبان ترسیل خیالات کا اہم و موثر وسیلہ ہے۔ مادری زبان میں تدریس و آموزش اس لیے ضروری ہے کہ اس کے سبب طلبہ کم محنت اور کم وقت میں بآسانی نہ صرف حصول علم کر سکتے ہیں بلکہ ان کی ہمہ جہت ترقی نیز شخصیت و تشخص کی تعمیر و تشکیل میں بھی مدد ملتی ہے اور حصول تعلیم کے بنیادی مقاصد کی بھی تکمیل ہوتی ہے۔ باہمی رابطہ قائم کرنے، اپنی تہذیب و ثقافت کو فروغ دینے میں مادری زبان اہم کردار ادا کرتی ہے۔

مخصوص قدیم تہذیب و تمدن و ثقافت نیز کثیر الادیان اور کثیر اللسان ہونے کے سبب ہندوستان

'قومی تعلیمی پالیسی 2020' میں استاد کی اہمیت، ضرورت اور مرکزیت کو نہ صرف تسلیم کیا گیا ہے بلکہ ان کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو عصری تقاضوں کے بموجب فروغ دینے میں ہر ممکن کوشش کرنے کی تاکید بھی کی گئی ہے۔

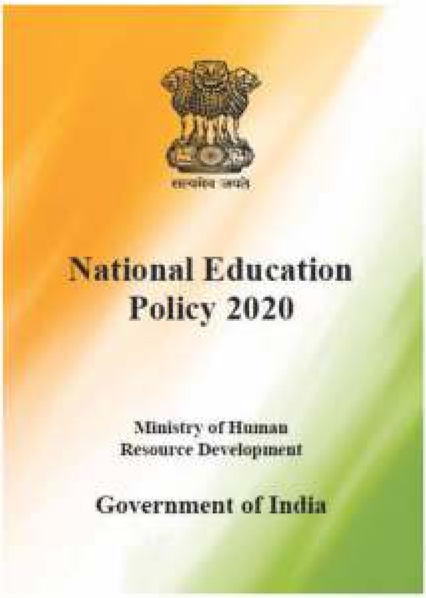

کو زبانوں کا گھر بھی کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں متعدد علاقائی بولیاں اور زبانیں رائج ہیں۔ دستور ہند کے آٹھویں شیڈیول میں جو اہم اور مقبولِ عام ہندوستانی زبانیں مندرج ہیں، اُن میں اردو بھی شامل ہے۔

تمام ماہرینِ تعلیمات اور لسانیات اس امر پر متفق ہیں کہ بچوں کی ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان ہی میں دی جانی چاہیے۔ دستور ہند کے سیکشن '350-A' کے ساتھ ساتھ مختلف تعلیمی کمیشنوں، قومی تعلیمی پالیسیوں، این سی ای آر ٹی کے درسیاتی خاکوں RTE-2009 اور دیگر تعلیمی دستاویزات میں بھی طلبہ کی مادری زبان میں تعلیم و تدریس کی اہمیت اور ضرورت پر اصرار کیا گیا ہے۔ سابقہ قومی تعلیمی پالیسیوں کی طرح نئی 'قومی تعلیمی پالیسی - 2020' میں بھی مادری زبان میں تعلیم و تدریس کی اہمیت نیز جدید ذرائع ترسیل و ابلاغ کو اختیار کرنے پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

'قومی تعلیمی پالیسی - 2020' کا خاص مقصد ہندوستانی نظامِ تعلیم میں مطلوبہ اصلاحات نیز تبدیلیوں کے ذریعے اُسے 21 ویں صدی کے تعلیمی تقاضوں اور ضروریات کے عین مطابق بنانا ہے تاکہ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی درجات میں خواندگی اور عددی ماحصل کو نہ صرف فروغ حاصل ہو سکے، ڈراپ آؤٹ کی شرح میں کمی واقع ہو سکے بلکہ اعلیٰ تعلیمی نظام میں کثیر شعبہ جاتی بین العلومی طرز رسائی کی ایسی سہولیات بھی بہم ہو سکیں جو کہ طلبہ کی ہمہ جہت صلاحیتوں کو فروغ دینے اور ان کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں معاون ثابت ہوں۔

زبان یوں تو زندگی کے ہر شعبے میں اہم کردار ادا کرتی ہے لیکن تعلیم و تدریس و آموزش کے سلسلے میں اسے بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ مضمون خواہ کوئی بھی ہو اس کی تدریس زبان کے ذریعے ہی عمل میں آتی ہے۔ بچہ جب اسکول میں پہلی بار آتا ہے تو وہ کئی الفاظ کا ذخیرہ اپنے ساتھ لاتا ہے۔ جو زبان اس کے گھر اور اطراف میں بولی جاتی ہے دراصل وہی اس کی مادری زبان ہوتی ہے جس میں وہ دیگر زبانوں کے مقابلے میں بآسانی اکتسابِ علم کر سکتا ہے۔

زبان و ادب کی تدریس و آموزش کے ساتھ دیگر سماجی، سائنسی اور تکنیکی علوم کی تدریس و آموزش میں بھی مادری زبان کی لفظیات، مصطلحات اور تراکیب زیادہ موثر اور معاون ثابت ہوتی ہیں۔

'قومی تعلیمی پالیسی - 2020' میں اسکولی تعلیم، اعلیٰ تعلیم اور دیگر مختلف تعلیمی معاملات و حکمتِ عملی کو چار زمروں میں منقسم کیا گیا ہے۔ 'قومی تعلیمی پالیسی - 2020' کے مسودے کی شق نمبر 4.11 میں چھوٹے بچوں کی مادری زبان / گھر کی زبان میں جہاں تدریس و آموزش کی سفارش کی گئی ہے وہیں جن بچوں کی مادری زبان ذریعۂ تعلیم نہیں بن سکی ہے ان کے لیے ذولسانی ذریعۂ تعلیم یا طرز رسائی کی تجویز شامل ہے۔

'قومی تعلیمی پالیسی - 2020' کی شق 4.12 میں کثیر لسانیت کی بات کہی گئی ہے تاکہ طلبہ میں دو سے آٹھ سال کی عمر کے درمیان، ایک سے زیادہ زبانیں سیکھ لینے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اسی کے ساتھ مادری زبان کے ساتھ دیگر زبان کے سیکھنے، زبان کی تدریس دلچسپ مکالماتی انداز میں کیے جانے اور جدید

تکنیکی ذرائع وسائل کا استعمال کیے جانے کی تاکید کی گئی ہے اور تین زبانوں میں کسی ایک ہندوستانی زبان کو پڑھنا لازمی قرار دیا ہے۔

'قومی تعلیمی پالیسی۔2020' کی شق نمبر 4.16 میں ہر طالب علم کے لیے 'دی لینگویج آف انڈیا' پر ایک ایسا پروجیکٹ تیار کرنے کی تجویز شامل ہے جس کے ذریعے ہندوستانی زبانوں کے مابین باہمی ربط پیدا کرنے اور آدی باسی زبانوں کی ساخت اور نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تاکہ مشترکہ ہندوستانی ثقافت کی اہمیت واضح ہوسکے۔

شق نمبر: 4.17 میں کلاسیکی ہندوستانی زبانوں اوران کے ادب کی اہمیت کے پیشِ نظر خاص توجہ دیے جانے کی بات کہی گئی ہے۔

شق نمبر 22.9 میں ہندوستانی زبانوں اوران کے ادب کے مابین تقابلی مطالعے اور دیگر فنونِ لطیفہ کی بات بھی شامل ہے۔

شق نمبر 4.20 میں غیر ملکی ثقافتوں کی تفہیم کے لیے غیر ملکی زبانوں کے مطالعے کے تئیں رہنمائی فراہم کی گئی ہے۔

شق نمبر 2.8 میں مختلف ہندوستانی زبانوں کی تدریس میں پُرلطف آموزش کے لیے دلچسپ ادبِ اطفال کو شامل کیے جانے، کتب خانوں میں حسبِ ضرورت کتابیں مہیا کرانے اور تکنیکی ذرائع سے معیاری تراجم کی تجویز شامل ہے۔

شق نمبر 4.21 اس لیے اہم ہے کہ اس میں زبان کی تدریس وآموزش کو معیاری، دلچسپ اور مؤثر بنانے کے لیے جدید تکنیکی طریقوں اور شمولیاتی طرزِ رسائی پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ زبان کے لسانیاتی اور ثقافتی پہلوؤں کو مستحکم بنانے کے لیے جدید تر تکنیکی ذرائع و وسائل مثلاً: مختلف Apps، پورٹلس، انٹرنیٹ، فلم، کمپیوٹر، ویب سائٹس، CD's، ٹوئٹرس، فیس بک، یو-ٹیوب، تعلیمی چینلس، ای لائبریری وغیرہ کے ذریعے تعلیم کو حقیقی عصری زندگی سے جوڑنے، تعلیمی نظام کو مؤثر اور تجرباتی بنانے پر اصرار کیا گیا ہے۔ اس جدید تکنیکی عمل میں شمولیاتی طرزِ رسائی کے لیے خصوصی ضروریات کے حامل بچوں یا نابینا بچوں کے لیے اشاراتی زبان کی تکنیک کو فروغ دینے کی خاطر خصوصی درسیاتی مواد تیار کرنے کا مشورہ بھی شامل ہے۔

شق نمبر 22.19 کے مطابق ہندوستانی زبانوں کی تدریس وآموزش کے لیے مختلف ویب سائٹس پر مبنی پلیٹ فارم/ پورٹل یا وکی پیڈیا پر درسی مواد کی فراہمی ویڈیوز اور رکارڈنگ وغیرہ کی سہولت دستیاب کی جائے گی اور ترجمہ نگاری کی صلاحیت کو فروغ دیا جائے گا تاکہ ہندوستانی زبانوں کے ادب پاروں کے علاوہ غیر ملکی زبانوں کے ادبی شاہکار اور تدریسی مواد کو آموزگاروں کو فراہم کیا جاسکے۔ اس اہم کام کے لیے "Institute of Translation and Interpretation"(ITI) قائم کرنے کی تجویز بھی شامل ہے۔

اردو زبان و ادب کے فروغ کی غرض سے جن سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے اردو ویب سائٹس بنا کر عوامی مقبولیت حاصل کی ہے، ان میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، انجمن ترقی اردو ہند، ریختہ آرگ/ ای باکس اور مختلف ریاستی اردو اکادمیوں کے علاوہ تعلیمی اداروں میں CIET، NCERT، NCTE، NIOS، CBSE، جامعہ اردو، علی گڑھ، اے ایم یو علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ہمدرد، Ignou، زکوٰۃ فاؤنڈیشن آف انڈیا، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد، انجمن اسلام ممبئی، اعظم کیمپس پونہ وغیرہ کے ذریعے اہم خدمات انجام دی جارہی ہیں۔

NCERT کی تیار کردہ پہلی سے بارہویں جماعت کے طلبہ وطالبات کے لیے تمام مضامین کی درسی کتب معاون درسی کتب، ہندی، اردو، انگلش میڈیم میں دستیاب ہیں۔

NCERT کے تکنیکی شعبے CIET کے ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے بھی درسی مواد براہ راست نشر کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ حکومتِ ہند کی جانب سے کئی نئے خصوصی ویب سائٹس، پورٹلس اور لرننگ مینجمنٹ پلیٹ فارم پر مختلف جماعتوں اور مضامین کے طلبہ وطالبات کی تدریس وآموزش کے لیے جو آن لائن، براہ راست خصوصی تعلیمی پروگرام نشر کیے جارہے ہیں، اُن میں 'ای۔ پاٹھ شالا'، 'ای۔ متر'، 'دِکشا'، 'سہوگ'، 'کشورمنچ اور پورٹل 'NISHTHA (National Initiatives for School Heads & Teachers Holistic Advancement) اور MOOC (Massive Open Online Courses)، "SWAYAM (Study Webs of Active Learning for Young Aspiring Minds) "PRABHA" وغیرہ کے نام بہ طور خاص قابلِ ذکر ہیں جن کے تحت "e-content" اور "e-Resources" درسی مواد کی نشریات کو قومی تعلیمی پالیسی۔2020 کے مطابق، ماہرین کے ذریعے براہِ راست پیش کیا جاتا ہے۔

کئی اردو پورٹل مثلاً: urdu sukhan.com، urdu life.com، urdu dost.com، sherosukhan.com، universal urdu، post.com، adab.com، urdu manzil.com وغیرہ کے اہم کردار ادا کرنے کے سبب اردو کے سائبر اسپیس میں خاصی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ اردو طلبا، رسرچ اسکالرس، اساتذہ خاطر خواہ استفادہ کرکے اردو زبان وادب کو نئی جہتوں سے ہم کنار کررہے ہیں۔ اردو بھی اب سائبر اور کمپیوٹر کی زبان بن گئی ہے۔ اردو میں بھی e-book، e-box اور ڈیجیٹل لائبریری کی دستیابی نے فاصلاتی نظامِ تعلیم کے لیے بھی راہیں ہموار کردی ہیں۔ ذرائع ابلاغ ICT نہ صرف تعلیمی اور سماجی ترقی کا پیمانہ بن چکے ہیں بلکہ دنیا یک قطبی یا عالمی گاؤں میں تبدیل ہوچکی ہے اور سمٹ کر ہمارے ڈرائنگ روم یا کلاس روم میں آگئی ہے۔

عصرِ حاضر میں انٹرنیٹ اور کمپیوٹر یا موبائل ایک بنیادی ضرورت ہی نہیں بلکہ ہماری روزمرّہ زندگی کا جزوِ لاینفک بن گیا ہے۔ یونی کوڈ فارمیٹ اور ویب سائٹس نے دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان وادب کی ترسیل وابلاغ کو بھی آسان تر بنادیا ہے۔

اردو سائبر اسپیس نے نئے امکانات کے ساتھ ایک نیا جہانِ معانی پیدا کردیا ہے۔ تکنیکی ذرائع ابلاغ نے اردو زبان و ادب اور اس کی تعلیم و تدریس کو انقلاب آفریں ترقیات سے ہم کنار کرکے اس کی مقبولیت اور دائرۂ اثر میں نہ صرف خاصی وسعت پیدا کردی ہے بلکہ اردو زبان کو Global Language کا درجہ عطا کردیا ہے۔

■

Mohammad Nauman Khan
204, Gulshan-E-Dasnavi
Green Valley, Airport Road
Bhopal - 462030 (M.P.)
Mob.: 9891424095
mnkhanncert@gmail.com

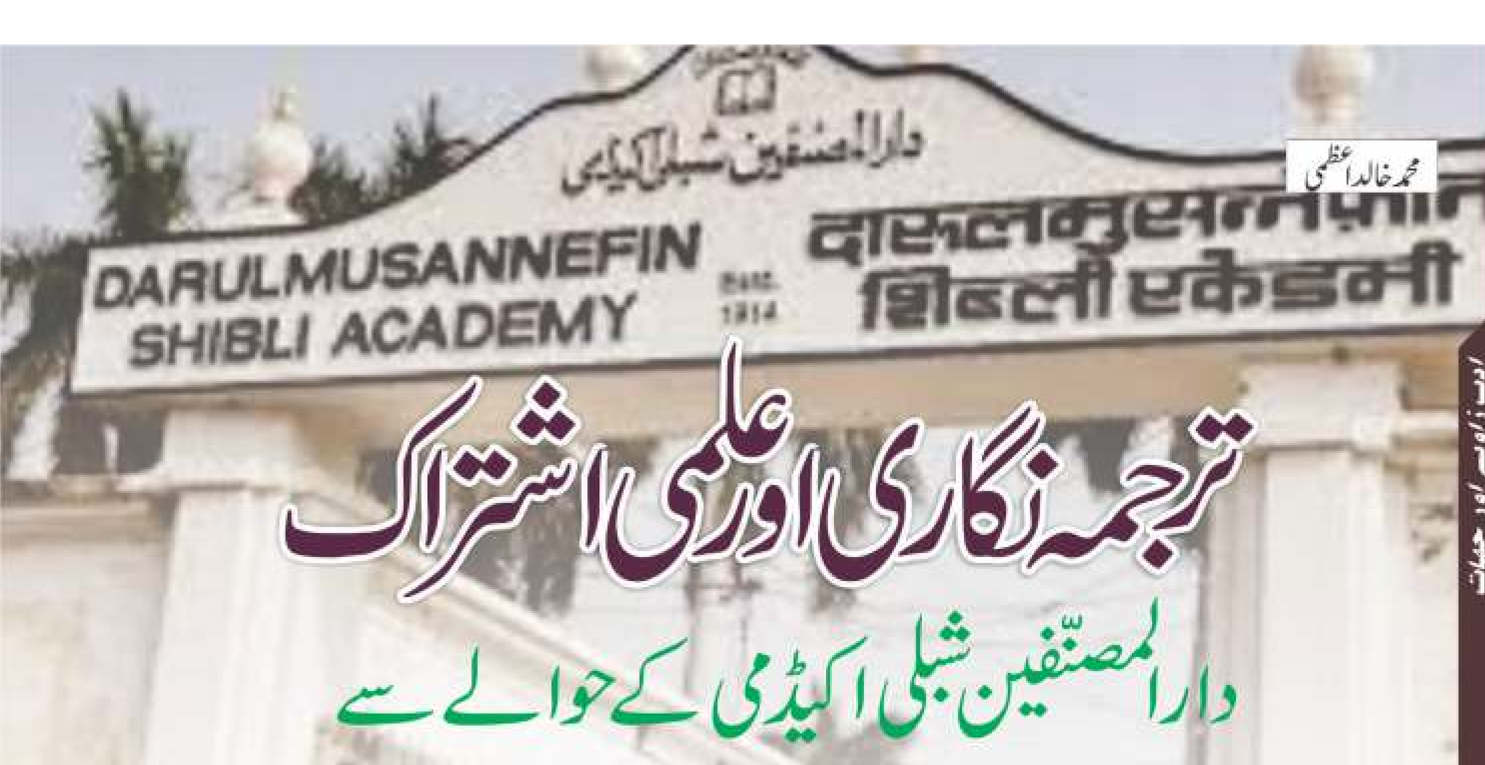

محمد خالد اعظمی

ترجمہ نگاری اور علمی اشتراک

دار المصنّفین شبلی اکیڈمی کے حوالے سے

ترجمہ اور ترجمہ نگاری کی اہمیت

آج کے زمانے میں جس تیزی کے ساتھ مختلف علوم کی ترقی ہورہی ہے ماضی میں اس کی مثال ذرا مشکل سے ہی ملے گی۔ ایک وقت تھا کہ علوم کی کمیت، کیفیت اور اس کا حجم کہیں دو چار صدیوں میں دو گنا ہوتا تھا اور اب حالت یہ ہوگئی ہے کہ نئے علوم کی تخلیق و ترسیل کی موجودہ رفتار سے صرف ایک دہائی کے اندر موجود علوم کا حجم دو گنا ہوجاتا ہے۔ دنیا کے مختلف ملکوں اور ان کی مادری زبانوں میں ہورہی علوم کی یہ تیز رفتار ترقی، جسے عالمی سطح پر پھیلانے اور ان کی عوامی پذیرائی کے لیے دوسرے ملکوں کی زبانوں میں ان کا ترجمہ اور ترسیل کا آسان ہونا بھی ضروری ہے۔ اسی سیاق میں اہل علم کے درمیان اشتراک علوم (Knowledge sharing) کا چلن و ترغیب آج کے آسان اور کم خرچ مواصلاتی دور میں بالکل عام ہے۔ مختلف طرح کے علوم کی وسعت و ترقی اور عوامی رسائی کے لیے ماہرین علم بلا تردد اپنی تحقیقات اور خیالات سماجی ذرائع ابلاغ کے صفحات پر شائع کرتے ہیں جو ہر خاص و عام کے لیے بغیر قیمت ہر جگہ دستیاب ہوتے ہیں۔ اسی ضمن میں علمی تعاون، اشتراک علوم اور تبادلہ خیال کے لیے مختلف ملکوں اور زبانوں کے علم وحکمت پر مبنی ادبی شہ پاروں، سائنسی تحقیقات اور دیگر مفید عام تحریروں کا ایک دوسرے کی زبانوں میں ترجمہ کرنا اور اسے اپنے ہم زبان عوام کے علم و تخیل میں اضافہ کے لیے قابل عمل بنانا بھی شامل ہے۔ مسلم تمدن کے سنہری دور میں ہندوستانی، یونانی و دیگر علوم کا عربی زبان میں ترجمہ اور مسلمانوں کی تدوین شدہ جدید سائنس، ادب اور معاشرتی علوم کا یوروپی زبانوں میں ترجمہ علم کی وسعت و ترقی اور یوروپ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بنیاد تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے مغل دور حکومت میں فارسی مخطوطات کا سنسکرت اور ہندی میں ترجمہ اور ہندوستانی زبانوں کے علمی کارناموں کا فارسی اور عربی میں ترجمہ بھی ہندوستان میں جدید علوم کی ترقی کے لیے بہت اہم تصور کیا جاتا ہے۔ اسی طرح برطانوی دور حکومت میں فورٹ ولیم کالج نے اردو زبان کی وسعت کے لیے جہاں ماہرین زبان سے اردو کی کتابیں تصنیف کروائیں وہیں بہت ساری کتابوں کا اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو اور فارسی میں ترجمہ بھی کروانے کا کام کیا۔

عالمگیریت اور عالمی وحدت کے جدید تصورات نے ترجمے کی اہمیت کو مزید واضح اور اسے عوامی مقبولیت حاصل کرنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے تا کہ عالمی پیمانے پر ہونے والی سیاسی و معاشی تبدیلیوں اور منصوبوں کی مختلف علاقوں اور ممالک میں تشہیر کی جا سکے۔ عالمی اداروں کے ذریعے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے لیے کی جانے والی مختلف زمروں کی منصوبہ بندی اور ان کے عالمی اثرات کی کما حقہ جانکاری دنیا بھر کے عوام اور اور پالیسی ساز اداروں کو ان کی اپنی زبان میں حاصل ہوسکے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ کسی بھی علاقے کی سماجی ومعاشی ترقی زبان وادب، فن بلاغت کی ترقی اور اظہار مدعا کی پختگی کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتی۔ زبان وادب کی ترقی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دوسری زبانوں کے ادبی اور تمدنی علوم کا گہرا مطالعہ بہت اہمیت کے ساتھ کیا جائے جو دوسری زبان کے علم اور اپنی زبان میں اس کے ترجمے کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ بات ہمیشہ ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ ترجمہ نگاری ایک پیچیدہ فن ہے جس میں ہر دو زبانوں کا وسیع و عمیق مطالعہ، اس کا علم، الفاظ، محاورے اور ادبی قواعد کی جانکاری کے ساتھ ترجمہ نگار کا ذاتی تجربہ، اور حالات کو پرکھنے کی صلاحیت اور وسعت نظری بھی بہت ضروری ہے کہ بغیر اس کے ترجمانی کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔

ترجمہ نگاری اپنے آپ میں صرف کسی ایک زبان کی تخلیقات و تصنیفات کو دوسری زبان میں ہو بہو منتقل کر دینے کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ خود ایک تخلیقی کارنامہ اور ایک بہترین تخلیقی ذہن ہی ایک عمدہ ترجمانی کے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ اردو زبان میں ترجمہ نگاری کے شروعاتی ادوار میں تحت اللفظ یا ایک زبان کے الفاظ کو بالکل اسی طرح دوسری زبان میں منتقل کر دینے کو ایک بہتر طریقہ مانا جاتا تھا۔ جہاں یہ ترجمے کی صداقت اور حقانیت پر دلیل ہے، وہیں اس کا ایک نقصان یہ تھا کہ اس لفظی ترتیب کو بالکل ویسے ہی قائم رکھنے کی وجہ سے ترجمے کی زبان اور عبارت بھی بالکل نامانوس، ادق اور بار گراں ہوجاتی تھی جسے پڑھنے اور سمجھنے میں قاری کو نہایت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بعد کے دور میں اہل علم نے ترجمے کی اس روایت سے انحراف کرتے ہوئے اسے تحت اللفظ کے بجائے عبارت اور جملوں کے مفہوم کی ادائیگی کو اہمیت دی جس کی وجہ سے زبان آسان اور پر لطف ہونے کے ساتھ قاری کو دوسری زبان کی تصانیف اور ادبی لٹریچر کو پڑھنا اور سمجھنا

آسان ہوگیا، لیکن اس طرح کی ترجمہ نگاری کے لیے زبان پر عبور ہونے کے ساتھ ترجمہ نگار کا ادبی ذوق اور تحقیقی ذہن کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔

ترجمہ نگاری جہاں ایک علم کی حیثیت سے دنیا میں اپنا اہم مقام بنا چکی ہے، وہیں یہ ایک فن کے طور پر بھی اہل زبان کے درمیان مقبولیت حاصل کر رہی ہے جس میں آزاد برجستہ اور بامحاورہ ترجمے کو تحت اللفظ کے مقابلے زیادہ مقبولیت اور عروج حاصل ہوا اور اب دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ نگاری کافی دنوں سے اسی طرز پر کی جارہی ہے۔ دنیا کا بیشتر نثری اور شعری ادب دنیا کی دیگر زبانوں میں ترجمہ ہوکر خاص وعام کے دلوں میں اپنی جگہ بنا رہا ہے۔

اردو میں ترجمہ نگاری کی شروعات کب سے ہوئی اور پہلا ترجمہ کس کتاب کا کب کیا گیا، یہ ایک مشکل سوال ہے۔ کچھ محققین اسے مشہور صوفی بزرگ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے پوتے عبداللہ حسینی سے جوڑتے ہیں جنھوں سب سے پہلے ایک عربی کتاب 'نشاۃ العشق' کا اردو میں ترجمہ کیا لیکن یہ بات بالکل حتمی طور پر نہیں کہی جاسکتی۔ کچھ محققین ملا وجہی کی 'سب رس' کو شاہ جی نیشاپوری کی فارسی کتاب 'دستور عشاق' کا اردو ترجمہ مانتے ہیں، کچھ لوگ فضل علی فضلی کی کتاب 'کربل کتھا' کو ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب 'روضۃ الشہدا' کا اردو ترجمہ مانتے ہیں۔ ان سب باتوں میں محققین کے درمیان اختلاف تو ممکن ہے، لیکن ایک بات جو خاص طور سے اور وثوق سے کہی جاسکتی ہے مذکورہ کتابیں اگر چہ آزاد ترجمہ نگاری کے ضمن میں آسکتی ہیں لیکن ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ وتلخیص کے کام میں بھی فورٹ ولیم کالج کی خدمات کو اولیت حاصل ہے۔

اردو زبان کی خاصیت ہے کہ اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ کو سمیٹنے اور جذب کرنے کی بہت گنجائش اور وسعت موجود ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب زبان میں الفاظ، محاورے، ذومعنی جملوں کی کثرت ہو اور اس کا زبانی تخلیقات میں استعمال بھی عام طور پر ہوتا ہو۔ اردو اگر چہ اس معاملے میں بہت امیر اور الفاظ وتراکیب سے مالا مال ہے لیکن اس سمت اور بطور خاص یوروپین زبانوں میں موجود ادبی اور سائنسی لٹریچر کا اردو میں ترجمے کی جانب اہل علم کی توجہ بہت کم ہے، اور ساری ادبی خصوصیات اور اضافی لسانی فوائد کے باوجود اردو زبان میں ترجمے کا کام موجودہ دور کی علمی ضرورت سے کم ہو رہا ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ زبان کی وسعت وترقی میں جہاں ایک طرف احوال و واقعات میں ماحول کی منظرکشی اور بیانیہ کی ندرت اہمیت کی حامل ہے، وہیں تخیل اور توصیفی کلمات کی ادائیگی کے لیے منظوم قصائد کی کشید بھی عوام کے دلوں میں زبان کی لطافت اور پسندیدگی کے لیے بنیادی اصول کی حامل ہے۔ جس طرح کی وسیع اللسانی اور متنوع کیفیت نگاری کے لیے حرف والفاظ اردو زبان میں موجود ہیں، وہ اس بات کی متقاضی ہے کہ دوسری زبانوں کے علمی وادبی ذخائر کو اس میں منتقل کیا جائے کیونکہ دیگر زبانوں کی ترجمانی اور اسے اپنے دامن میں جذب کر لینے کی گنجائش اس زبان میں بدرجہ اتم موجود ہے، ساتھ ہی صوتی اور لسانی ہم آہنگی کے ساتھ دوسری زبانوں کے الفاظ کے لیے جذب و اختلاط کے لیے مناسب ذخیرۂ الفاظ اس زبان میں موجود ہے۔

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، سوسال سے زائد عرصے سے ایک ادارے کے طور پر علمی، ادبی، مذہبی حلقوں میں جس طرح کی عظمت اور وقار کے ساتھ علمی وتحقیقی خدمات انجام دے رہا ہے، اس کے لیے کسی مزید تعارف اور شناخت کی ضرورت نہیں ہے۔

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، سوسال سے زائد عرصے سے ایک ادارے کے طور پر علمی، ادبی، مذہبی حلقوں میں جس طرح کی عظمت اور وقار کے ساتھ علمی وتحقیقی خدمات انجام دے رہا ہے، اس کے لیے کسی مزید تعارف اور شناخت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ادارہ برصغیر کا شاندار علمی ورثہ، علم وادب، مشرقی علوم، تاریخ وسیرت کی کتابوں کی تصنیف اور اشاعت کے ساتھ رسالہ معارف کی وقیع تحقیقی اشاعت کے لیے بھی قابل تعریف ہے کہ 1916 میں اپنی پہلی اشاعت سے لے کر آج تک اس علمی رسالے کی ماہانہ اشاعت میں ایک بھی تاخیر یا ناغہ درج نہیں ہے خواہ حالات کتنے ہی غیر موافق رہے ہوں۔ علامہ شبلی نعمانی کی مشہور عالم سیرت النبی کے ساتھ الفاروق، المامون، الغزالی، شعر العجم، موازنہ انیس و دبیر، علم کلام اور علم الکلام جیسی نادر تصنیفات کی اشاعت کے علاوہ علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا شاہ معین الدین ندوی، مسعود عالم ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی جیسے اور بھی دیگر علما اور محققین کی بے شمار تصنیفات اس ادارے سے شائع ہوکر مقبول عام ہوئی ہیں۔ اگر چہ یہ ادارہ ملک کی آزادی کے بعد سے ہی مالی وسائل کی کمی سے دوچار ہے اس کے باوجود بھی اس ادارے نے اپنے بنیادی مقصد اور علمی وقار سے کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ ملک میں مشرقی علوم، تاریخ اور ادب کی تحقیقات کے لیے جو چند ادارے جانے جاتے ہیں ان میں دارالمصنفین آج بھی سر فہرست ہے۔ دارالمصنفین کا سارا ادبی اور تحقیقی لٹریچر اردو زبان میں ہے ماسوائے علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی چند فارسی کتب اور عربی رسائل کے۔ اگر چہ شبلی اکیڈمی کی تمام تر تصنیفات اعلیٰ پائے کی تحقیق اور اس کے مسلمہ اصولوں پر کھری اترتی ہیں نیز اپنے موضوعات اور مخصوص زبان وادب کے زمرے میں عالمی شہرت کی حامل ہونے کے باوجود ان تمام تصنیفات کے تراجم اور دیگر ملکی یا غیر ملکی زبانوں میں ان کی اشاعت وتوسیع پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

آج کے جدید ترقی یافتہ دور میں جب کہ دنیا کے مخصوص زبان وادب کے علوم، منظوم لٹریچر، فکشن، خاکوں اور سفر ناموں کے ساتھ اعلیٰ پائے کی سائنسی تحقیقات دیگر علمی وادبی تصنیفات اور علم کے ذخائر کا ترجمہ دنیا کی تمام زندہ زبانوں میں ہوکر اپنی اپنی سطح پر قبولیت حاصل کرنے کے علاوہ معیاری علوم وتحقیقات میں اضافے کا سبب بھی بن رہے ہیں۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ترقی نے دنیا بھر میں ترجمہ اور علوم کی دیگر زبانوں میں منتقلی کے کام کو آسان تر کر دیا ہے لیکن جس سطح اور طرز پر تراجم کا کام دنیا کی دیگر زبانوں میں ہو رہا ہے، دنیائے اردو ابھی اس سطح پر پہنچنے سے قاصر نظر آتی ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ دارالمصنفین نے اردو اور فارسی زبان وادب کے مشرقی علوم اور تاریخ پر جس طرح کا علمی اور محققانہ کام کیا ہے وہ اپنی مثال آپ

ہے، لیکن اتنے اعلیٰ پائے کی علمی تصانیف کا ترجمہ انگریزی یا دنیا کی دیگر زندہ زبانوں میں کرنے پر بھرپور توجہ نہیں دی گئی اور آج بھی ادارہ ترجمے کی صنف میں بہت زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کر رہا ہے۔ تمام تر تکنیکی سہولتوں کے باوجود بھی ترجمے کے بنیادی اصولوں اور اوریجنل تصنیف کے معیار و مقصد اور مصنف کی منشا کے مطابق کام کرنے کے لیے مالی وسائل کی فراہمی بہت اہم ہے جس کی وجہ سے بھی ادارہ اس طرح کے کام کو بہت آگے تک لے جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔

دارالمصنفین نے علامہ شبلی کے علمی کارناموں کی اشاعت کا کام بڑے پیمانے پر کیا ہے اور علامہ شبلی کی کچھ مخصوص کتابوں کے تراجم بھی ہوئے ہیں۔ علامہ شبلی کی تصنیف کردہ سیرت النبی کی پہلی دو جلدیں اپنے آپ میں ایک شاہ کار کا درجہ رکھتی ہیں اور سیرت کی یہ کتاب اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کا ترجمہ انگریزی کے ساتھ دنیا کی دیگر زبانوں میں بھی کیا جائے لیکن شبلی اکیڈمی کی جانب سے اس سمت میں کوئی قابل ذکر کوشش نظر نہیں آ رہی ہے۔ سیرت النبی کی ان دو جلدوں کا ترجمہ ہندوستان میں طیب بخش بدایونی نے کیا تھا جسے قاضی پبلی کیشنز نے شائع کیا تھا۔ آج کی جدید تکنیکی سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امیزن جیسے تجارتی ادارے بھی سیرت النبی کا انگریزی ترجمہ شائع کر کے فروخت کر رہے ہیں، لیکن یہ کتنا مستند اور قابل اعتبار ہے اس پر کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ علامہ شبلی کی دیگر تصانیف میں الفاروق کا ہندی زبان میں ترجمہ ادارے کی جانب سے جناب عبداللہ دانش نے کیا ہے اور دوسرا ترجمہ بہ زبان ہندی اعظم گڑھ کی معروف شخصیت فیض احمد ایڈوکیٹ نے اپنے شوق، علم دوستی اور علامہ شبلی سے اپنی عقیدت کے اظہار کے طور پر کیا ہے جو ایک عمدہ گٹ اپ اور جلد و جیکٹ کے ساتھ 2019 میں لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔ الفاروق کا عربی ترجمہ ڈاکٹر سمیر عبدالحمید ابراہیم نے کیا ہے جو ریاض سے شائع ہوا ہے۔ الفاروق جیسی مایۂ ناز کتاب کے کسی انگریزی یا دیگر یوروپین زبان میں ترجمے کی کوئی جانکاری شبلی اکیڈمی سے نہیں مل سکی۔ اس کے علاوہ علامہ کی مشہور تصنیف اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر کا انگریزی زبان میں ترجمہ عالمگیر کے نام سے شبلی اکیڈمی کے سابق ناظم جناب صباح الدین عبدالرحمٰن نے کیا ہے۔ علامہ شبلی کی دیگر مایۂ ناز کتب کا دیگر زبانوں میں ترجمہ شبلی اکیڈمی کے محدود وسائل اور انتظامی دشواریوں کے سبب ابھی ممکن نہیں ہے، ہوسکتا ہے مستقبل میں اس اہم کام کی کوئی سبیل پیدا ہو جائے۔

علامہ شبلی کے بعد دارالمصنفین کی دوسری اہم شخصیت ان کے شاگرد رشید جناب سید سلیمان ندوی کی ہے، جنھوں نے علامہ کے بہت سارے ادھورے علمی کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ سید سلیمان ندوی کا سب سے منفرد اور اعلیٰ کارنامہ علامہ شبلی کی تصنیف 'سیرت النبیؐ' کی تکمیل ہے، جس کے لیے ان کی خدمات کو کبھی بھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ 'سیرت النبیؐ' کے بعد کی پانچ جلدیں انھیں کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ ان کا دوسرا وقیع علمی کارنامہ حیات شبلی اور مکاتیب شبلی کی ترتیب و تدوین ہے۔ سید سلیمان ندوی کی کتابوں میں کچھ کے تراجم ہندی زبان میں ہوئے ہیں جن میں خطبات مدراس کا ترجمہ اکیڈمی کی جانب سے جناب عبداللہ دانش نے کیا ہے، اسی کتاب کا ہندی ترجمہ ڈاکٹر ڈی این چترویدی نے اپنی جانب سے کیا ہے جسے ستیہ مارگ پرکاش لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ سید صاحب کی دوسری اہم کتاب عرب و ہند کے تعلقات کو بھی عبداللہ دانش اور بابورام چندر ورما دہلی نے الگ الگ ہندی کا جامہ پہنایا ہے۔ 'سیرت عائشہؓ' ہندی میں عبداللہ دانش اور عربی زبان میں عمر رضا کحالہ نے ترجمانی کی ہے۔ اسی طرح رحمت عالم جو سید سلیمان ندوی کا ایک مختصر کتابچہ ہے اسے محمد الیاس الاعظمی نے ہندی میں منتقل کیا ہے جبکہ عربوں کی جہاز رانی، جو سید صاحب کی مشہور کتاب ہے، کا ترجمہ Arab Navigation کے نام سے سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے کیا ہے۔ سید صاحب کی دو مشہور تصانیف تاریخ ارض القرآن اور بہادر خواتین اسلام کا ترجمہ دارالمصنفین کی جانب سے دی گئی معلومات کے مطابق اب تک کسی زبان میں نہیں ہوا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں اس پائے کی ہیں کہ ان کا یوروپین زبانوں میں ترجمہ اور اشاعت ہونی چاہیے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے شبلی اکیڈمی میں رہتے ہوئے بہترین تصنیفی کام کیا جس میں اقبال کامل، حکمائے اسلام اور ابن خلدون خاص طور سے قابل ذکر ہیں لیکن ان کا بھی کسی دیگر ہندوستانی، عربی اور یوروپین زبان میں اب تک ترجمہ نہیں ہوسکا اور علم کا اتنا بڑا اور نایاب کام صرف اردو جاننے والے قارئین تک محدود ہے۔ مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی مشہور زمانہ کتاب ہے جس کا ہندی ترجمہ عبداللہ دانش نے کیا ہے اور جسے دارالمصنفین شبلی اکیڈمی نے شائع کیا ہے جبکہ اسی کتاب کا دوسرا ہندی ترجمہ رضا لائبریری رامپور سے شائع ہوا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ پر ان کی دیگر کتب بھی اس پائے کی ہیں کہ ان کا ہندوستانی یا دنیا کی دیگر زبانوں میں ترجمہ ہو لیکن بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر دارالمصنفین کے ذریعے یہ کام اب تک نہیں ہوسکا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ اگرچہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی مشرقی علوم اور مستشرقین پر تحقیقی کام کرنے کے لیے نہایت مناسب اور مثالی جگہ ہے، لیکن محدود مالی وسائل اور جدید سہولتوں کے فقدان کی وجہ سے یہ ادارہ اب اس پائے کا تحقیقی کام نہیں کر پا رہا ہے جو ماضی میں اس کا طرۂ امتیاز ہوا کرتا تھا۔ موجودہ دور کی علمی ضروریات اور تحقیق کے جملہ لوازمات کی تکمیل کے لیے تکنیک کا استعمال اب بالکل عام ہو چکا ہے۔ اداروں اور کتب خانوں میں علمی اشتراک، حواشی کی تلاش، لٹریچر سروے اور اسی ضمن کی دیگر علمی ضروریات کے لیے انٹرنیٹ، لیپ ٹاپ، کمپیوٹر، پرنٹر اور فوٹو کاپی مشینوں کی سہولت کے بغیر اب کسی طرح کا تحقیقی یا ترجمہ نگاری کا کام نہیں ہوسکتا۔ مالی وسائل اور جدید سہولیات کے فقدان کی وجہ دارالمصنفین بھی انھیں مسائل سے نبرد آزما ہے۔ شبلی اکیڈمی کی تمام تر تصنیفات اس اعلیٰ پیمانے کی ہیں کہ ان کا دنیا کی سبھی ترقی یافتہ زبانوں میں ترجمے کے ذریعے منتقل کیا جانا چاہیے لیکن محسوس ہوتا ہے کہ اس طرز کا علمی کام شبلی اکیڈمی کے دائرہ کار میں نہیں ہے، اسی لیے اس پر کام بالکل نا کے برابر ہو رہا ہے۔ ترجمہ نگاری کا کام اب تجارتی بنیاد پر بھی کیا جا رہا ہے جس میں مغربی علوم کی محققانہ کتابوں کا مشرقی زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ تجارتی بنیاد پر ان کتب کو فروخت کر کے آمدنی بھی پیدا کی جا رہی ہے۔ شبلی اکیڈمی میں ان خطوط پر بھی ترجمہ نگاری کا کام فروغ دیا جاسکتا ہے۔

■

Mohd Khalid Azmi
Dept of Economics
Shibli National College,
Azamgarh-276001(UP)

امیر عباس

بوعلی شاہ قلندر کی فارسی شاعری میں صوفیانہ عناصر

سید شرف الدین بوعلی شاہ قلندر کے والد سید سالار فخر الدین عراقی، شاہ نعمت اللہ ہمدانی کے مرید تھے، جو 600ھ یعنی 1203 عیسوی میں عراق سے ہندوستان تشریف لائے اور یہیں 604ھ میں صوبہ ہریانہ کے شہر پانی پت میں بوعلی شاہ قلندر پیدا ہوئے۔ قتال قطب ابدال، عاشق الٰہی رومی ثانی اور بخشی ہند آپ کے القاب ہیں۔ آپ کی والدہ بی بی حافظہ جمال سید السادات شاہ نعمت اللہ ہمدانی کی ہمشیرہ تھیں۔ فارسی آپ کی مادری زبان تھی۔ آپ والد کی طرف سے حسنی سید ہیں، سلسلہ نسب چند واسطوں سے امام حسن مجتبیٰ بن علی سے ملتا ہے۔

قلندر صاحب ایک روایت کے مطابق قطب جمال مجرد ہانسوی کے خالہ زاد بھائی اور مرید تھے۔ قلندر اوائل عمر میں مروجہ علوم مولانا سراج الدین مکی سے حاصل کرکے چالیس سال تک پانی پت میں علم فقہ و حدیث کا درس دیتے رہے۔ مزید تعلیم کے لیے دار الحکومت دہلی کا رخ کیا اور مدرسہ بام بہشت میں وقت کے جید علما کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور تقریباً بیس سال تک مسجد قوت الاسلام میں مفتی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس وقت دہلی اہل علم و ادب اور سیاست کا بڑا مرکز تھا اور قلندر سے اس عہد کے سلاطین مثلاً سلطان غیاث الدین بلبن، جلال الدین خلجی اور علاء الدین خلجی بڑی عقیدت واحترام سے پیش آتے تھے۔

آپ کے معاصرین مشائخ اور علما میں مولانا ضیاء الدین سنامی، خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی، شیخ جلال الدین کبیر الاولیا، خواجہ نجم الدین قلندر، خواجہ نظام الدین اولیا اور امیر خسرو قلندر سے محبت وعقیدت رکھتے تھے۔ جیسا کہ مشہور ہے امیر خسرو سلطان علاء الدین خلجی کے تحائف کے ساتھ قلندر کے یہاں حاضری دی اور ان کو اپنے اشعار سنائے تھے اور ان کا کلام بھی سنا تھا۔ خسرو نے جو غزل سنائی تھی اس کا مطلع حسب ذیل ہے۔

ای کہ گوئی ہیچ سختی جز فراق یار نیست
گر امید وصل باشد آنچنان دشوار نیست

ترجمہ: ''اے یہ کہنے والے شخص کہ کوئی مصیبت یار کے فراق جیسی نہیں ہے۔ اگر وصل کی امید ہو تو یہ اس قدر سخت بھی نہیں ہے۔

قلندر نے خسرو کی یہ غزل سن کر ان کو داد و تحسین کے کلمات سے نوازا اور پھر خود فی البدیہہ غزل پڑھی۔

دیہیم خسروی بر ما نعل استر است
خسرو کسیکہ خلعت تجرید در بر است
یمرغ وار روئی نہفتم بقاف عشق
کز ہر دو کون دانہ روحم نہ درخوراست
وحدت ورای کنگرہ کبریا کشد
کو عارفی کہ منظر او عرش اکبر است
ماییم کوی عشق وخرابات بی خودی
وین رسم و سیرتیست کہ خاص قلندر است
درس شرف نبود ز الواح ابجدی
لوح جمال دوست اورا در برابر است

ترجمہ: ''بادشاہی تاج ہمارے نزدیک خچر کے نعل کے برابر ہے۔ حقیقی بادشاہ وہ ہوتا ہے جس نے تجرید کا لباس زیب تن کیا ہو۔ میں نے سیمرغ کی طرح عشق کے کوہ قاف میں اپنے چہرے کو چھپا رکھا ہے، کیونکہ میری روح کی غذا کے لیے دونوں جہان کا خزانہ بھی مناسب نہیں ہے۔ وحدت تو سالک کو ذات کبریا کے کنگرے کے بھی اس پار لے جاتی ہے ایسا عارف کہاں ہے جس کے نظارے کا مقام عرش اکبر ہے۔ ہم ہیں اور عشق کا کوچہ ہے اور پھر بیخودی کا میخانہ بھی ہے۔ یہ وہ طور طریقے ہیں جو قلندر کے لیے خاص ہوتے ہیں۔ شرف کا سبق ابجد کی تختیوں کے ذریعے نہیں ہوتا، بلکہ اس کے سامنے تو محبوب حقیقی کے حسن و جمال کی تختی ہوتی ہے۔

بوعلی صرف ایک مجذوب صوفی کامل اور قلندر کی حیثیت ہی سے معروف نہیں بلکہ ایک اچھے عالم، صاحب قلم اور عمدہ شاعر کی حیثیت سے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ نثر میں مکتوبات بنام اختیار الدین اور حکم نامہ شرف الدین کا ذکر ملتا ہے:

بقول شاہ عبدالحق محدث دہلوی: ''اورا مکتوب است

بہ زبان عشق ومحبت مشتمل بر معارف وحقائق توحید وترک دنیا وطلب آخرت ومحبت مولی۔' (اخبار الاخیار، ص125)

قلندر نثر سے کہیں زیادہ نظم میں جیسے نعت، قصیدہ، غزل، رباعی اور مثنوی میں دسترس رکھتے تھے۔ وہ خود کو ایک پرگو شاعر اور نظامی گنجوی اور خاقانی شروانی کا مد مقابل سمجھتے تھے۔

شرف در عشق روی تو کلام از قدس آوردہ
نہ چون نظم نظامی وآن نہ چون اشعار خاقانی

ترجمہ: ''شرف تیرے چہرے کے عشق میں عالم قدس سے کلام لایا اس کے شعر نہ نظامی کی نظم کی طرح ہیں نہ خاقانی کے اشعار کی طرح کسی بلکہ وہبی ہیں۔ قلندر نے متقدمین شعرا جیسے سلمان ساوجی اور ظہیر فاریابی کے کلام کا مطالعہ کیا تھا اور ان کی تقلید پر افتخار بھی کرتے ہیں۔

برادریم من وساوجی زما ہریک
ہمان قدر کہ بود جاگی مناسب برد
کر دم مطابقت بہ ظہیر آنکہ گفت او
شرح غم تو لذت شادی بہ جان دہد

قلندر ہندوستان میں پیدا ہونے کے ساتھ ہند پرست بھی تھے لیکن عراقی ہونے پر فخر کرتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ ان کی ولایت اور شاعری کی شہرت ہندوستان کے باہر روم وخراسان میں بھی پہنچ گئی ہے۔

شرف بہ ہند در عارفی کشاد وفشرد
ولی بہ روم وخراسان ولایتش دانند
مراگلہ زہندوستان است ہندوی
شرف بہ ہند پرست ولیکن عراقیست

ان کے آثار میں دو مثنویاں اور ایک کلیات یادگار ہیں۔ یہ مثنوی کنز الاسرار اور رسالہ عشقیہ کے نام سے مشہور ہیں۔ کنز الاسرار مختلف حکایات کا مجموعہ اور رسالہ عشقیہ تین سو باسٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ کلیات میں تقریباً سترہ سو اشعار ہیں، جس میں قصیدہ، رباعی، قطعہ اور غزل کے عمدہ نمونے ہیں۔ عشقیہ قلندر کی مشہور ترین مثنوی ہے۔ بقول شخصے: ''ہر بیتش از متاع عرفان معمور وہر شعرش عارفان را موجب وجد وسرور'' ترجمہ: قلندر کا ہر شعر معرفت سے پر وجد وسرور کا موجب ہے۔

قلندر نے متقدمین شعرا میں عطار نیشاپوری کی مثنوی منطق الطیر کی زمین میں اور اسی بحر رمل مسدس محذوف میں ایک مکمل مثنوی 'گل بلبل' کے نام سے کہی جس کے چند شعر بطور نمونہ پیش ہیں۔

مرحبا ای بلبل باغ کہن   از گل رعنا بگو با ما سخن
مرحبا ای ہدہد فرخندہ فال   مرحبا ای طوطی شکر مقال

ترجمہ: ''آو آو اے! بلبل پرانے باغ کی خوشنما گل کی بات ہم سے کر، شاباش اے ہمارے تیز زبان قاصد، تو ہر دم ہمارے یار کی خبر دیتا ہے۔''

قلندر کا کلام پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کے معروف شعرا جیسے سعدی شیرازی اور مولانا بلخی کی پیروی میں اشعار کہے جیسے سعدی کی غزل۔

امشب سبکتر می زنند این طبل بی ہنگام را
یا وقت بیداری غلط بود است مرغ بام را

اسی زمین اور اسی بحر میں قلندر نے کہا۔

ساقی ما از شراب کہنہ پر کن جام را
خاک برسر کن چو بینی زاہدان خام را
عاشق بی ننگ و نامم نعرہ خوش می زنم
من نخواہم ننگ را ومن جویم نام را

ترجمہ: ''اے! ساقی ہمارے لیے پرانی شراب کو جام میں ڈالو اور جہاں کہیں تمھیں خشک اور خام زاہد ملیں ان کے سر پر مٹی ڈالو۔ اس شعر میں شراب کہنہ سے یوم الست کے اسرار مراد ہیں۔ میں بے ننگ و نام عاشق ہوں اور خوشی کا نعرہ مار رہا ہوں۔ میں اپنے ناموس کا طالب ہوں نہ اپنی شہرت کا۔

مولانا رومی کا اثر ان کے بیشتر اشعار میں موجود ہے۔ خاص طور رسالہ عشقیہ اور مثنوی کنز الاسرار کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے بلکہ بعض اشعار پر تو گمان ہوتا ہے کہ وہ مولانا کے کہے ہوئے ہیں۔

رومی کی مثنوی کی منظوم حکایتوں کی جھلک قلندر کی مثنوی میں نظر آتی ہے۔ مثلاً: 'داستان ماہی و مگر'، 'الماس وپسر مالدار'، 'استاد وشاگرد احول' اور 'داستان قلندر وزیر ماکر چھووان کہ درمیان نصرانیان فساد انگیخت' 'محقق نصر الدین وافضل'، 'مرد جاہل در محفل دانایان'، 'دو نابینا وچہار رفیقان کہ شبوتی یافتند' اور 'شاعر پسر بوالہوس وشیخ سادہ لوح ومریدان'

اس کے علاوہ رسالہ عشقیہ میں بعض عنوانات جیسے حکمت عارفان، عشق و عاشق، ایمان کامل، ظاہر وباطن، علم الیقین وعین الیقین وحق الیقین، حقیقت ذات حق، خود شناسی وغیرہ نظم میں بیان کیے ہیں۔ اگر ہم ان کی گہرائی اور گیرائی میں جائیں تو مولانا کی صدائے بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔

قلندر کی مثنوی کے وہ اشعار جن میں مولانا کے خیالات کا عکس نظر آتا ہے۔ ذیل میں دلیلوں کے پیش خدمت ہیں۔ مولانا نے عشق کو جالینوس اور افلاطون قرار دیا ہے۔ دیکھیے قلندر اسے کس طرح پیش کرتے ہیں۔

عشق می داند ہمہ بازی و پیچ
غیر عشق آخر چہ باشد ہیچ ہیچ
عشق شور انگیز باشد در جہان
او خبر دارد ز خورشید نہان
چیست اسرار نہان عشقت وبس
کی شناسد عشق را بوالہوس
عشق چون مستی کند ای ہوشیار
صد ہزاران می کشد دریای دار

ترجمہ: ''زندگی اور دنیا کا سارا سوز وساز عشق پر مبنی ہے

بغیر عشق کے کچھ نہیں۔ عشق شرابی کی طرح ہے۔ اے! ہوشیار یہ سیکڑوں، ہزاروں کو مارتا ہے۔''

قلندر نے اپنے کلام میں مولانا کے الفاظ، کلمات اور محاورات کو استعمال کر کے اپنے کلام کی زینت بنایا اور بعض اصطلاحات کو بغیر کسی تبدیلی کے اپنے کلام میں موزوں کیا ہے۔ مولانا کے ایک لفظ 'سوفسطائی' کو قلندر نے اس طرح استعمال کیا ہے۔ بیت

گفت سوفسطائی آن دانائی دہر
کین جہاں وہم و خیال ست در نگر

ترجمہ: ''انھوں نے کہا خردمندی، دانشوری زمانے کی حکمت ہے۔ دنیا وہموں سے بھری پڑی ہے۔''

قلندر کے ان خیالات کو اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو یہ اندازہ ہوگا کہ وہ مولانا کے ہم خیال ہی نہیں بلکہ ان کے افکار وخیالات کے ترجمان ہیں۔ وہ تمام جذبات و مستی، شور ہیجان، ہمہمہ وولولہ اور وجدانی کیفیت جو مولانا کے اشعار میں ہے قلندر کے کلام میں اس کا پرتو نظر آتا ہے۔

بوعلی قلندر کی غزلیات بھی فارسی زبان وادب میں خاص کر متصوفانہ شاعری میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں ان کی اعلی غزل گوئی، معنی آفرینی، قادر الکلامی اور شاعرانہ عظمت کی دلیل ہیں۔ انھوں نے مثنوی کی طرح اپنی غزلیات میں بھی فلسفہ عشق کو موضوع سخن بنایا ہے۔ ان کے کلام میں عشق حقیقی کی گرمی شدت سے محسوس ہوتی ہے اور وہ فنافی اللہ نظر آتے ہیں۔

گر عشق نبودی و غم عشق نبودی
چندین سخن نغز کہ گفتی کہ شنودی
گر عشق نبودی بخدا کس نرسیدی
حسن ازلی پردہ زرخ بر نکشیدی

ترجمہ: ''اگر عشق اور غم عشق نہ ہوتا تو ایسی پیچیدہ باتیں کون کہتا اور کون سنتا۔ اگر عشق نہ ہوتا تو کوئی خدا تک نہ پہنچتا اور حسن ازلی چہرے سے پردہ نہ اٹھاتا۔ قلندر کا خیال ہے اگر عشق نہ ہوتا تو اس دنیا کا وجود نہ ہوتا اس کائنات میں ہر آدمی عشق کی لذت سے لطف اندوز ہوتا ہے اور خدا تک رسائی کا یہی واحد ذریعہ ہے۔ غرض ان کی نظر میں عشق الٰہی ہی کمال معراج ہے۔

اس کے علاوہ قلندر کے تمام اشعار میں صنائع وبدائع پائے جاتے ہیں۔ جیسے تشبیہات، استعارہ، کنایہ، اشتقاق، ترصیع، تکرار، قطار البعیر، مراعات النظیر،

بو علی قلندر کی غزلیات بھی فارسی زبان وادب میں خاص کر متصوفانہ شاعری میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں ان کی اعلی غزل گوئی، معنی آفرینی، قادر الکلامی اور شاعرانہ عظمت کی دلیل ہیں۔ انھوں نے مثنوی کی طرح اپنی غزلیات میں بھی فلسفہ عشق کو موضوع سخن بنایا ہے۔

تضاد اور تلمیحات کا برملا استعمال کیا ہے۔ انھوں نے غزلیات میں تاریخی واقعات کو قلمبند کر کے کلام میں معنویت اور اثر پیدا کر دیا ہے۔ انبیاء علیہم السلام سے منسلک تاریخی اور مذہبی واقعات ومعجزات کو کمال خوبی سے نظم کیا ہے، مثلاً حضرت آدمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے معجزات وخصوصیات کو عشق حقیقی کے سراپا میں جلوہ گر کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے اور حضرت یوسفؑ اور زلیخا کے حسن وعشق کی جانب اشارہ ہے۔

رخ او نور مقدس لب او روح مصفا
جعد او افعی موسی کف او چو ید بیضا
مریم از قدس لبش حاملۂ روح اللہ
آدم ازپرتو رویش زگلی یافتہ احیا
یوسف از عکس جمالش نگزیدی در خواب
مست وسرگشتہ شدی چوبر او بود زلیخا

ترجمہ: ''اس کا چہرہ نور مقدس ہے اور لب روح مصفا اس کی زلف عصائے موسیٰ ہے اور ہاتھ ید بیضا ہے۔ اس شعر میں قلندر نے محبوب کے روے پرنور ولب پر پرکیف اور زلف پرشکن کی توصیف باحسن الوجوہ بیان فرمائی ہے۔ مریم اس کے لبوں کی پاکیزگی سے روح اللہ کی حامل بنیں آدم اس کے چہرے کے پرتو سے مٹی سے زندہ ہوئے۔ یوسف اس کے جمال کا عکس خواب میں دیکھتے تو مجنوں ہو جاتے جس طرح ان پر زلیخا تھی۔''

غزل کی طرح قلندر کی رباعیات بھی ان کے صوفیانہ عشق کی حامل ہیں۔ ایک مقام پر وہ حضرت امام علیؑ سے غائبانہ اور والہانہ محبت وعقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

بنوشتہ چو بوعلی بطغرای منست
در حیدریان بلند تر جای منست
مولائم آن را بولا و بوفا
آن حیدر کرار کہ مولای منست

ترجمہ: ''جو بوعلی نے لکھا وہ میرا طغرا ہے۔ حیدریوں میں وہ اونچا مقام بس میرا ہے۔ وہ میرا مالک ہے عش و وفا بھی۔ وہ حیدر کرار جو میرا مختار ہے۔''

غرض متقدمین ومعاصرین شعرا کی پیروی کو پیش نظر رکھ کر قلندر پانی پتی نے شاعری کی ہر صنف میں شاعرانہ جوہر دکھاتے ہوئے اپنے صوفیانہ مسلک کو کمال خوبی سے بیان کیا ہے۔ قلندر کے کلام میں سادگی، سلاست، روانی، رنگ وآہنگ، سوز وگداز، جوش وخروش، جذب واستغراق اور کشش اس قدر پائی جاتی ہے کی قاری اور سامع کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ بلکہ عرفان کا ایسا گہرا سمندر ہے جس میں عشق، معرفت، استغنا، توحید، ترک دنیا، طلب آخرت، محبت مولا، فنا اور وصل کے موتی پائے جاتے ہیں۔ ان کے تمام اشعار تصوف اور اخلاق، عشق توحید، مدح حضرت رسول اکرمؐ وامام علیؑ میں سرشار ہیں۔

حوالہ جات:

1 الخاموشی بشیر انصاری، تذکرہ اولیاء کرام پانی پت، قلندر چوک، پانی پت، 1974، ص10,11
2 دہلوی عبدالحق محدث، اخبار الاخیار، انجمن آثار مفاخر فرہنگی، تہران 1383ھ ص125
3 شبلی محمد صدیق خان، ترجمہ دیوان بوعلی قلندر مع مثنوی، ترکمان گیٹ، دہلی 2005، ص16,37
4 عباس امیر، مطالعہ انتقادی شعر بوعلی شاہ قلندر پانی پتی، (ایم فل، ڈیزرٹیشن) مانو، حیدرآباد 2017، ص135,136
4 طاہر میر: دیوان سید شرف الدین بوعلی قلندر، تکیہ خاکسار، تہران، چاپ دوم، 1360ھ/ش۔ ص5
5 محمد اقبال ڈاکٹر، فارسی ادب کے ارتقا میں پانی پت کا حصہ، دریا گنج، دہلی 1996، ص131,141,142,149
6 نظامی، محمد عطا وحبیب اللہ مظہر، مفتاح الغیب شرح دیوان بوعلی قلندر، سیالکوٹ، 1933، ص313, 320

■

Dr. Ameer Abbas
71-B, Near Chappar Wali Masjid
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi- 110025
Mob.:9793214180
Email.: abbasameer59@gmail.com

مسئلہ تذکیر و تانیث اور مطالعۂ جلال

شاہ نواز فیاض

تذکیر وتانیث کا اختلافی مسئلہ اردو زبان میں بہت پہلے سے ہے، اس حوالے سے اکابرین و ماہرین کے نظریات اور مطالعے سامنے آتے رہے، اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اردو املا، حروف تہجی اور تذکیر وتانیث کا مسئلہ ہمیشہ ہی سے مختلف فیہ رہا ہے، لیکن زبان کا معیاری نمونہ شعر وادب ہے، اس حوالے سے جب کلاسیکی متن کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ مسئلہ وہاں بھی درپیش نظر آتا ہے۔ اس اختلافی مسئلے میں لوگوں نے اپنی رائے ضرور پیش کی ہے، لیکن مکمل طور پر ایک رائے نہیں بن سکی۔ جلال لکھنوی نے 'مفید الشعرا' میں اس کے متعلق لکھتے ہوئے دبستان لکھنؤ اور دبستان دہلی دونوں کو پیش نظر رکھا، لیکن ترجیح دبستان لکھنؤ کو دی۔

جلال لکھنوی نے اپنے اس رسالے (مفید الشعرا) کی اشاعت ثانی کے لیے اہم ترمیم واضافے کیے۔ اس سلسلے میں انھوں نے خود لکھا ہے:

''...اس ہیچمداں کی تالیفات سے جو پہلے رسالہ کارآمد شعرا بحث وتذکیر وتانیث میں 1293 میں طبع ہوا تھا وہ ناقص وناتمام اور نہایت غلط چھپا تھا۔''

(مفید الشعرا،ص2)

اس رسالے میں جلال لکھنوی نے اسمائے غیر ذوی العقول کی تذکیر وتانیث کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ اسمائے ذوی العقول اس بحث سے اس لیے خارج ہیں کہ ذوی العقول جو مذکر ہے اس کا اسم ہر حال میں مذکر ہی آئے گا اور جو مونث ہے اس کا اسم لازماً مونث ہوگا۔ اس سلسلے میں اہم مسئلہ غیر ذوی العقول کا ہے۔ جلال نے اسی حوالے سے گفتگو کی ہے، لیکن کہیں کہیں ذوی العقول کے متعلق بھی بات کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے خود لکھا ہے:

''...الا غیر ذوی العقول کے اسما کے کہ وہ البتہ حاجت تذکیر وتانیث کے بیان کی رکھتے ہیں کہ مذکر یا مونث حقیقی نہیں۔ بلکہ مجازی یعنی فرضی ہیں۔ پس اسمائے غیر ذوی العقول کی تذکیر وتانیث کی بحث بتا تمہ کی گئی ہے۔'' (مفید الشعرا،ص4)

جلال لکھنوی نے اس بات کا بھی اہتمام کیا ہے کہ جن لفظوں میں اہل زبان تذکیر وتانیث کے معاملے میں متفق ہیں، اس کو محض بیان کر دیا ہے، اس کی مثال نہیں دی ہے، جب کہ جن لفظوں میں اہل زبان تذکیر وتانیث کے معاملے میں متفق نہیں ہیں، اس کو مع مثال پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ جلال نے مثال پیش کرتے ہوئے معتبر شعرا کے کلام اور لکھنؤ کے زبان دانان کی مثال دی ہے، جب کہ دوسرے اسکول (دبستان دہلی) کو یا تو نظر انداز کیا ہے یا فوقیت نہیں دی ہے۔ اس سلسلے میں جلال نے دبستان لکھنؤ کو ترجیح دی ہے، جب کہ زبان کا مسئلہ یکساں ہونا چاہیے، ایسے میں اہل لکھنؤ اور دہلی میں جو اختلاف کی صورت در آئی ہے، اسے اپنے اپنے طور پر صحیح تصور کیا جائے گا۔ جلال نے لکھا ہے:

''جن الفاظ کی تذکیر خواہ تانیث میں فصحا کا اتفاق ہے ان کو بے اسناد ونظائر لکھا ہے اور جن میں اختلاف ہے۔ یعنی جو الفاظ بعض فصحا کے نزدیک مذکر ہیں اور بعضوں کے عندیہ میں مونث ہیں۔ یا اس اعتبار سے مختلف فیہ ہیں کہ ایک معنی پر اپنے مذکر بولے جاتے ہیں اور دوسرے معنی پر مونث آتے ہیں یا جن کی تذکیر وتانیث میں ابہام ہے وہ بیشتر ساتھ اسناد ونظائر کے لکھے گئے ہیں اور اسناد ونظائر کے اشعار کلام اساتذہ معتبر وشعرائے نامور اور اردو زبان دانانِ لکھنؤ سے اخذ کر کے درج کیے گئے ہیں۔'' (مفید الشعرا،ص4)

جلال لکھنوی کے خیال میں زبان کے جتنے نام ہیں سب مونث ہیں۔ اس کی وجہ بھی بالکل واضح ہے۔ لیکن جلال نے اردو کو مذکر لکھا ہے۔ جب کہ اردو اپنے استعمال کے اعتبار سے تذکیر وتانیث میں بدلتی رہتی ہے۔ اردو اگر اسم نکرہ استعمال ہے تو مذکر اور اسم معرفہ تو مونث۔ اس سلسلے میں جلال نے کوئی مثال نہیں پیش کی ہے، جبکہ یہ بالکل واضح ہے کہ اردو کی تذکیر وتانیث اسم نکرہ اور معرفہ کے ساتھ مختلف ہے۔ جلال لفظ اردو کی تذکیر کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''زبان کے جتنے نام ہیں مانند عربی، یونانی، عبرانی، رومی، ترکی، فارسی، انگریزی، ہندی، بھاکا، پشتو، سنسکرت وغیرہ سب مونث بولے جاتے ہیں۔ سوا اردو کے کہ یہ مولف ہیچمداں کے عندیہ میں مذکر ہے۔''

(مفید الشعرا،ص6)

اردو کے متعلق نور اللغات میں مذکر ومونث دونوں لکھا ہے، لیکن مصحفی کے جس شعر کو بطور مثال پیش کیا گیا ہے، اس میں لفظ اردو مونث استعمال ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

اس تعلق سے داغ کا شعر بھی ملاحظہ کیجیے جس سے اردو

کی تانیث ہی مستفاد ہوتی ہے۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اس سلسلے میں ماہر لسانیات پنڈت دتاتریہ کیفی کے بھی دوشعر ملاحظہ کیجیے۔

اردو بنی ہے مسلم وہندو کے میل سے
دونوں نے صرف اس پہ دماغ اور دل کیے

———

اردو ہے جس کا نام ہماری زبان ہے
دنیا کی ہر زبان سے پیاری زبان ہے

مذکورہ اشعار پر غور کریں تو واضح ہوتا ہے کہ تمام اشعار میں 'اردو' کا لفظ بطور اسم زبان استعمال کیا گیا ہے اور بقول جلال زبان کے جتنے نام ہیں سب مونث بولے جاتے ہیں کے عین مطابق ہے۔ البتہ جلال نے جو یہ کہا کہ ''سوا اردو کے کہ یہ مولف ہیچمدان کے عندیہ میں مذکر ہے'' کی کچھ وضاحت نہیں ہوتی۔ یعنی یہاں یہ واضح نہیں ہوتا کہ جلال کے نزدیک 'اردو' بطور اسم زبان مذکر ہے یا اپنی اصل کے اعتبار سے۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ بطور اسم زبان 'اردو' کا استعمال بہت بعد میں شروع ہوا۔ اس سے پہلے یہ لفظ شہر، دارالحکومت، قصر، قلعہ اور خیمے کے معنوں میں رائج تھا اور ان تمام معنوں میں اردو کا استعمال مذکر ہی ہے۔ بہر حال جلال کا عندیہ غیر واضح ہے۔ جلال نے محض مذکر کہا ہے، جبکہ دونوں صورتوں کی وضاحت ضروری تھی۔ دلی ہو یا لکھنؤ دونوں جگہ کے شعرا نے اردو کو بطور اسم زبان مونث ہی استعمال کیا ہے۔ لہٰذا اگر یہ واضح بھی ہوجائے کہ جلال کے نزدیک لفظ اردو بطور اسم زبان مذکر ہے تو اسے جلال کا تفرد سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے گا۔ لہٰذا اس لفظ کے تعلق سے ہماری زبان میں تذکیر وتانیث کا کوئی حقیقی اختلاف نہیں رہ جاتا۔

چونکہ زبان کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہوتا ہے، اردو میں یہ مسئلہ کئی صورتوں میں ہے مثلاً حروف تہجی اور رسم الخط وغیرہ۔ ایسے میں مسئلۂ تذکیر وتانیث بھی بہت الجھا ہوا نظر آتا ہے۔ کیونکہ بعض الفاظ ایسے ہیں جو دبستان دہلی میں مذکر تو دبستان لکھنؤ میں مونث بولے جاتے ہیں اور دونوں درست ہیں۔ جلال نے اس مسئلے کو بہت خوبی سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

جلال لفظ املا کی تذکیر کے قائل ہیں، لیکن اسے

اردو املا، حروف تہجی اور تذکیر وتانیث کا مسئلہ ہمیشہ ہی سے مختلف فیہ رہا ہے، لیکن زبان کا معیاری نمونہ شعر وادب ہے، اس حوالے سے جب کلاسیکی متن کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ مسئلہ وہاں بھی درپیش نظر آتاہے۔ اس اختلافی مسئلے میں لوگوں نے اپنی رائے ضرور پیش کی ہے، لیکن مکمل طور پر ایک رائے نہیں بن سکی۔ جلال لکھنوی نے 'مفید الشعرا' میں اس کے متعلق لکھتے ہوئے دبستان لکھنؤ اور دبستان دہلی دونوں کو پیش نظر رکھا، لیکن ترجیح دبستان لکھنؤ کو دی۔

مختلف فیہ بھی قرار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ لکھنؤ کے استاد شاعر میر رشک نے املا کو مونث استعمال کیا ہے۔ رشک کا شعر ملاحظہ کیجیے۔

نامۂ جاناں ہے کیا لکھا مری تقدیر کا
خط کی انشا اور ہے لکھنے کی املا اور

مندرجہ بالا شعر سے املا کی تانیث مستفاد ہوتی ہے۔ اب ایسے میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ جس لفظ کو جلال لکھنوی مذکر کہہ رہے ہیں، اسے دبستان لکھنؤ کی شاعری کو بام عروج عطا کرنے والے میر علی اوسط رشک مونث استعمال کر رہے ہیں۔ رشک کا شعر اس سلسلے میں اوپر نقل کیا گیا ہے۔ نوراللغات میں 'املا' کو مذکر لکھا ہے۔ ترجیح بھی تذکیر کو ہی دی گئی ہے۔ مولف نوراللغات نے بھی تانیث کے لیے رشک کا وہی شعر نقل کیا ہے جو اوپر درج کیا گیا ہے، لیکن تسلیم کا یہ شعر بھی نقل کیا گیا ہے، جس میں لفظ املا کا استعمال مذکر ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

عالم وحشت میں جب لکھا کوئی خط فراق
ربط بگڑا میری انشا کا غلط املا ہوا

صاحب فرہنگ آصفیہ نے املا کے تعلق سے کسی اختلاف کا ذکر نہیں کیا اور اسے اسم مذکر قرار دیا ہے۔ جلال لکھنوی نے ایسے الفاظ کو مونث قرار دیا ہے جن کے آخر میں الف آئے یہ استثنائے چند الفاظ۔ معلوم ہوتا ہے کہ رشک اس سلسلے میں کسی استثنا کے قائل نہیں تھے اور انھوں نے روزمرۂ اہل زبان کے خلاف جاکر اصولی طور پر 'املا' کو مونث نظم کیا ہے۔ چونکہ رشک نہ صرف ایک استاد شاعر، بلکہ ماہر زبان اور فصحائے زبان میں سے بھی تھے، اس لیے جلال نے ان کے تفرد کی بنا پر پاس ادب کے خیال سے اس لفظ کو مختلف فیہ قرار دیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ لفظ املا کا اختلاف تذکیر وتانیث کے سلسلے میں ضرور ہے، لیکن ترجیح تذکیر کو ہی حاصل ہے، کیونکہ یہی کثیر الاستعمال ہے۔

لفظ مالا کا استعمال بھی مختلف فیہ ہے، لکھنؤ میں مالا کا استعمال عام طور پر مذکر ہے، لیکن فصحائے دہلی اس لفظ کی تانیث کے قائل ہیں۔ ناسخ کا شعر ملاحظہ فرمائیں جس میں انھوں نے مالا کو مذکر استعمال کیا ہے۔

تیرا مالا موتیوں کا قتل کرتا ہے مجھے
اے پری مالا سروہی کا یہ مالا ہوگیا

جلال نے تذکیر وتانیث کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے جس طرح کی دلیل پیش کی ہے، وہ یقیناً اہم ہے، لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ فصحائے لکھنؤ کو ترجیح دی ہے۔ مالا دہلی میں مونث اور لکھنؤ میں مذکر

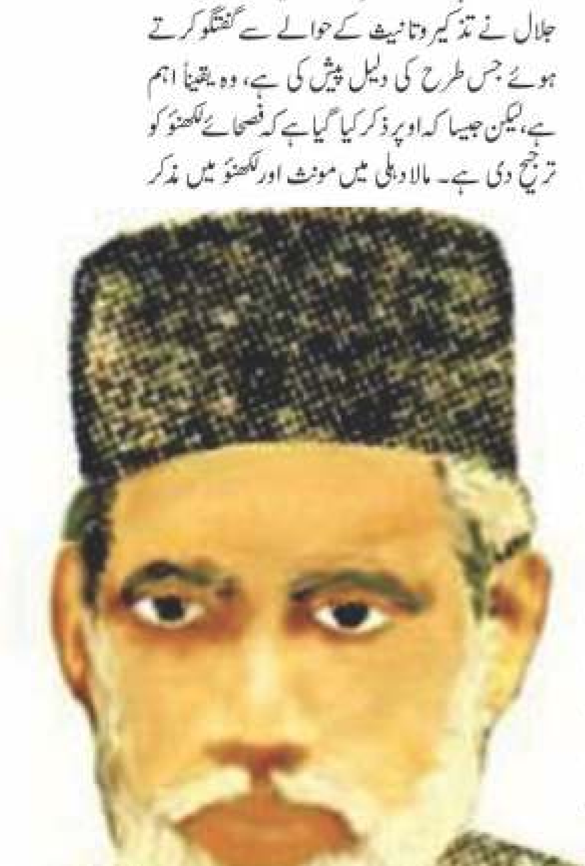

استعمال ہے۔ لفظ مالا دونوں اسکولوں (دہلی اور لکھنؤ) میں تذکیر وتانیث کے اختلاف کے ساتھ مستعمل ہے اور دونوں رائج بھی ہے۔

لفظ آب کو جلال نے مذکر لکھا ہے اور اسی کے قائل بھی ہیں۔ لفظ آب / آبہ فارسی اور سنسکرت دونوں زبان میں مستعمل ہے۔ اردو میں یہ لفظ فارسی سے آیا۔ یہ لفظ کثیر الاستعمال مذکر ہی ہے اور مولف نور اللغات نے بھی مذکر ہی لکھا ہے۔ دبستان لکھنؤ کے دو عظیم شاعر تذکیر وتانیث میں مختلف رائے رکھتے ہیں۔ ناسخ نے مونث استعمال کیا ہے تو آتش نے مذکر۔ اس ضمن میں پہلے ناسخ کا شعر ملاحظہ فرمائیں۔

دانت تیرے دیکھتے ہی ہوگیا ناسخ شہید
ہائے کیا ان موتیوں میں آب ہے شمشیر کی

اس ضمن میں آتش کا شعر دیکھیں جس میں لفظ آب کا استعمال مذکر کیا ہے۔

آتش نشہ ہی میں یا الٰہی میکشوں کو موت دے
کیا گہر کی قدر جب آب گہر جاتا رہا

فصحائے لکھنؤ میں بھی اس لفظ کے متعلق اختلاف ہے، لیکن جلال کا خیال ہے کہ لفظ آب جہاں پانی کے معنی پر مستفاد ہے وہ مذکر بولا جائے گا اور جہاں آبداری یا مرادف تاب ہے وہ مونث استعمال ہوگا۔ اب مذکورہ دونوں شعر پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ نے آب بمعنی چمک استعمال کیا ہے اسی لیے ناسخ کے شعر میں لفظ آب مونث ہے، جبکہ آتش نے آب بمعنی پانی استعمال کیا ہے، اسی لیے آتش کے شعر میں آب مذکر استعمال ہوا ہے۔ اس سلسلے میں میر کے اشعار ملاحظہ فرمائیں، جہاں آب بمعنی پانی استعمال ہے وہاں مذکر اور جہاں آبداری کے معنی میں ہے، وہاں مونث۔

جلال نے بالکل واضح طور پر بیان کردیا ہے کہ وہ الفاظ جن میں اختلاف نہیں ہے، اسے محض بیان کردیا گیا ہے، لیکن جس میں اختلاف ہے، اس کی مثالیں پیش کی گئی ہیں اور دہلی میں اس لفظ کو مذکر یا مونث استعمال کرتے ہیں اس کی بھی وضاحت پیش کی گئی ہے۔

دل لے گیا تھا زیر زمیں میں بھرا ہوا
آتا ہے ہر مسام سے میرے کفن میں آب

———

مت ڈھلک مژگاں سے اب تو اے سرشک آبدار
مفت میں جاتی رہے گی تیری موتی کی سی آب

ان مثالوں سے یہ واضح ہوا کہ آب بمعنی پانی مذکر اور بمعنی آبداری یا تاب مونث استعمال ہے۔ جلال نے اپنا عندیہ جو پیش کیا ہے، وہ اس اعتبار سے کافی اہم ہے کہ انھوں نے لفظوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ معنی کے حوالے سے بھی گفتگو کی ہے۔

مفید الشعرا جلال لکھنوی کا ایک بڑا کام ہے، جسے انھوں نے بڑی دقت نظر سے کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے جلال کی زبان دانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس رسالے کے حوالے سے کئی مضامین منظر عام پر آئے، جن میں ایک مضمون عبدالباری آسی کا بھی ہے۔ مفید الشعرا کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

''کسی مختلف فیہ لفظ کے لیے اس کی تذکیر وتانیث کا فیصلہ کرنا اور یہ بھی نہ بتانا کہ لکھنؤ میں یوں ہے، اور دہلی میں یوں، یا دونوں جگہ ایسا ہی ہے، یا ایک جگہ مختلف فیہ ہے، ایک جگہ نہیں، سوائے اس کے کہ دیکھنے والوں کو غلطیوں اور گمراہیوں کا سبق دیا جائے اور کیا ہے۔ مولف دہلی کی زبان کے ماہر نہ تھے تو یہی کہہ دیتے کہ یہ صرف لکھنؤ کی زبان ہے، تو ایک حد تک ان کی ذمہ داری کم ہوجاتی۔'' (عبدالباری آسی، ص53)

عبدالباری آسی اس مضمون کی ابتدا میں مفید الشعرا کی اہمیت سے انکار بھی نہیں کررہے ہیں۔ وہ خود لکھتے ہیں:

''بہر حال یہ رسالہ سنہ 1301ھ میں پہلی مرتبہ چھپا۔ اور چونکہ دوسرے رسالے اس وقت نہ ملتے تھے، اہل ضرورت نے اس کو غنیمت سمجھ کر اسی سے کام لینا شروع کیا۔'' (ایضاً ص51)

عبدالباری آسی کے مذکورہ اقتباس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کا اس طرح سے مطالعہ ہی نہیں کیا یا جان بوجھ کر قارئین کو گمراہ کیا۔ اس کا اعتراف تو وہ کرتے ہیں کہ اس حوالے سے دوسری کوئی کتاب نہیں ملتی تھی، گویا کہ اس حوالے سے جلال کا یہ ابتدائی کام تھا، جلال کی یہ ابتدائی کوشش دراصل ایک بڑے کام کا پیش خیمہ تھی۔ جلال نے بالکل واضح طور پر بیان کردیا ہے کہ وہ الفاظ جن میں اختلاف نہیں ہے،

جلال نے تذکیر وتانیث کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے جس طرح کی دلیل پیش کی ہے، وہ یقیناً اہم ہے، لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیاہے کہ فصحائے لکھنؤ کو ترجیح دی ہے۔ مالادھلی میں مونث اور لکھنؤ میں مذکر استعمال ہے۔ لفظ مالا دونوں اسکولوں(دھلی اور لکھنؤ) میں تذکیر وتانیث کے اختلاف کے ساتھ مستعمل ہے اور دونوں رائج بھی ہے۔

اسے محض بیان کردیا گیا ہے، لیکن جس میں اختلاف ہے، اس کی مثالیں پیش کی گئی ہیں اور دہلی میں اس لفظ کو مذکر یا مونث استعمال کرتے ہیں اس کی بھی وضاحت پیش کی گئی ہے۔ جلال نے صاف لکھا ہے کہ فصحائے لکھنؤ کو ترجیح دی گئی ہے۔ ایسے میں آسی نے جو باتیں لکھی ہیں وہ بر بنائے حقیقت نہیں۔

جلال لکھنوی کے اس کارنامے کا اختلاف کے باوجود سب نے اعتراف کیا، اس ضمن میں مخالفین اور موافقین کی قید نہیں۔ اس رسالے کے بعض مندرجات سے اختلاف کیا گیا، لیکن اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا گیا۔ جلال نے جو مثالیں پیش کی ہیں وہ اس لیے قابل غور ہیں کہ انھوں نے تذکیر وتانیث میں لفظ کے استعمال اور معنی پر زور دیا، جیسے لفظ آب بمعنی پانی مذکر لیکن یہی آب جب کسی اور معنی میں استعمال ہوا تو مونث۔ اس لفظ پر اس زمانے کے کئی اہم استاد نے اپنی رائے ظاہر کی تھی، جس میں امیر مینائی بطور خاص ہیں۔ جلال کے اس کارنامے پر تب بھی لکھا گیا اور اب بھی لکھا جارہا ہے۔ اختلاف کے باوجود جلال کی اس کاوش کی ہمیشہ پذیرائی ہوئی۔ تذکیر وتانیث کا مسئلہ ابتدا سے ہے اور اب بھی ہے، لیکن ہمارے کلاسیکی شعرا نے جو استعمال کیا ہے، وہ ہمارے لیے رہنمائی کا ذریعہ ہیں۔

■

Dr. Shahnewaz Faiyaz
Department of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Deli- 110025
Mob.:9891438766
sanjujmi@gmail.com

صابر ریاض خاص

اردو نثر کے فروغ میں ’ناصر نذیر فراق‘ کی ادبی خدمات

اردو نثر کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ وہاں ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد یہ شمالی ہند پہنچی۔[1] شمالی ہندوستان میں نثرنویسی کا آغاز فضل علی خاں فضلی کی کتاب ’دہ مجلس‘ سے مانا جاتا ہے۔[2] ابتدائی دور میں اردو نثر عربی و فارسی الفاظ کے ساتھ مسجع و مقفی عبارات میں ڈوبی ہوئی تھی (مثال کے طور پر ملا وجہی کی ’سب رس‘)۔ فورٹ ولیم کالج کے ذریعے اردو نثر خاص کر داستان کو فروغ ملا۔ داستان نویسی کے بعد اردو نثر ناول نگاری کے منازل طے کرتے ہوئے افسانہ نگاری تک پہنچی۔ ان افسانوی اصناف کے ساتھ ساتھ اردو نثر نے غیر افسانوی ادب میں بھی اپنے ارتقائی منازل طے کیے۔ مثلاً مضمون نگاری، انشائیہ نگاری، سوانح نگاری، خاکہ نگاری، خطوط نگاری اور سفرنامہ وغیرہ کے ذریعے اردو نثر کے ذخیرے میں اضافہ ہوا۔ اردو نثر نگاری کے فروغ میں متعدد فنکاروں نے اہم رول ادا کیے۔ مثال کے طور پر ملا وجہی (سب رس)، فضل علی فضلی (کربل کتھا)، میر امن (باغ و بہار)، انشاء اللہ خاں انشاء (رانی کیتکی کی کہانی)، رجب علی بیگ سرور (فسانۂ عجائب)، سرسید احمد خاں (آثار الصنادید و خطبات احمدیہ)، نذیر احمد (مراۃ العروس و توبۃ النصوح) اور پنڈت رتن ناتھ سرشار (فسانۂ آزاد) وغیرہ نے قابل قدر تخلیقی کام سرانجام دیے۔ سرسید احمد خاں کے مضامین اور مرزا غالب کے خطوط نے اردو نثر کو عربی و فارسی زبان کے دقیق الفاظ سے پاک کر دیا۔ سرسید کی اصلاح پسندی اور سہل نثر نگاری کو حالی، شبلی اور نذیر احمد نے آگے بڑھایا۔ نذیر احمد کی اصلاحی اور سجاد حیدر یلدرم کی رومانی کاوشوں کو آگے بڑھانے والوں میں ناصر نذیر فراق دہلوی کا نام بھی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں حکیم خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے سبب ممتاز شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی تحریریں قدیم دلّی کی ٹکسالی اردو کی عکاس ہیں۔ ان کی نثر نگاری پر قلم اٹھانے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے احوال کا مختصراً جائزہ لیا جائے۔

ناصر نذیر فراق 3 ربیع الاوّل 1282ھ بمطابق 16 اگست 1865 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔[3] حکیم خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی کا اصل نام ’نذیر‘ اور تخلص ’فراق‘ تھا۔[4] اپنے خاندانی دستور کے مطابق نام سے پہلے ’ناصر‘ لکھتے اور تحریر کی پیشانی (Header) پر ’ہوالناصر‘ درج کرتے تھے:

’’فراق دہلوی جس خاندان کا وسیلہ پکڑتا ہے اس کے مورث سید السادات خواجہ سید محمدؐ ناصر حسینی عندلیب تخلص خواجہ میر درد دہلوی کے والد بزرگوار تھے آپ نے فرمایا میرے نام کو خدا نے قبول کر لیا ہے اور مجھ سے وعدہ کیا کہ تیری آل اولاد اور تیرے آستانہ کے غلاموں کے لیے لفظ ’ناصر‘ میں برکتیں رکھ دی گئیں جو اپنے نام کے ساتھ اسے شامل کرے گا یا اپنی کتاب یا خط کی پیشانی پر ’ہوالناصر‘ لکھے گا اسے وہ برکتیں دی جائیں گی... اسی یادگار میں ہم لوگ اپنی کتاب اور رسالوں اور خطوط پر ہوالناصر لکھا کرتے ہیں۔‘‘[5]

ناصر نذیر فراق کا تعلق علمی و ادبی خاندان سے تھا۔ ان کے والد کا نام ’سید محسن علی‘ اور ماں کا نام ’شمس النساء بیگم‘ تھا۔[6] انھوں نے کتاب میخانۂ درد میں اپنا نسب نامہ قلم بند کیا ہے۔ جہاں ان کے والد ماجد کا نام سید محسن علی درج ہے۔ اردو ادب کے معروف و مقبول شاعر ’خواجہ میر درد‘ کی پوتی ’بی امانی بیگم صاحبہ‘ کی شادی ’مولوی ناصر جان صاحب محزون‘ سے ہوئی۔ ان سے بی عمدہ بیگم (فراق کی نانی) پیدا ہوئیں۔ چنانچہ ناصر نذیر فراق کا خواجہ میر درد سے خاندانی رشتہ ثابت ہوتا ہے۔[7] ناصر نذیر فراق اور خواجہ میر درد کے رشتے سے متعلق شاہد احمد دہلوی (مدیر رسالہ ساقی) لکھتے ہیں:

’’حضرت فراق حضرت خواجہ میر درد کے نواسے میں اور صحیح معنوں میں وارث الادب ہیں۔‘‘[8]

حکیم خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی کی ادبی زندگی کا آغاز نثر نگاری سے ہوا۔ انھوں نے اس کا ذکر اپنی تصنیف ’چار چاند‘ کے دیباچے میں اس طرح کیا ہے:

’’بچپن سال سے میری جاں دامِ نثر میں صید ہے۔‘‘[9]

ناصر نذیر فراق نے کثیر تعداد میں مضامین، ناول، افسانے اور انشائیے تخلیق کیے۔ ان کے مضامین ملک کے بیشتر رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ فراق دہلوی رسالہ مخزن (1910) کے ابتدائی دور کے لکھنے والوں میں سے تھے۔ ان کے مضامین ’لال قلعہ کی ایک جھلک‘ کے عنوان سے رسالہ ساقی میں قسط وار (32-1930) شائع ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ ان کے مضامین خطیب (دہلی)، بہارستان، نظام المشائخ، عصمت، نیرنگ خیال، ادبی دنیا (لاہور) اور اس دور کے دوسرے مشہور و معروف رسائل میں بھی شائع ہوتے تھے۔ ان مضامین کے علاوہ ناصر نذیر فراق کی متعدد نثری تصانیف بھی ہیں۔ میخانۂ درد، مضامین فراق، دلّی کا اجڑا ہوا لال قلعہ، لال قلعہ کی ایک جھلک، سات طلاقنوں کی کہانیاں، نجوگ یا دکن کی پری، چار چاند، دلّی میں بیاہ کی ایک محفل اور بیگموں کی چھیڑ چھاڑ، درد جانستاں، اختر محل اور المور کہایا مرقع اردو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ناصر نذیر فراق کا تعلق اس عہد سے ہے جس میں

کہانی اپنے داستانوی روپ کو بدل کر ناول کی شکل اختیار کر رہی تھی۔ یہ ناول اصلاحی و رومانی طرز پر لکھے جارہے تھے۔اردو نثر نگاری ناول کے ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے مختصر افسانہ کی جانب قدم اٹھارہی تھی۔ فراق دہلوی کی تحریروں میں ناول اور افسانہ نگاری کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ان کے فن پاروں میں داستانوی اسلوب کا رنگ نمایاں ہے۔

بیسویں صدی کا ربع اول اردو ادب میں رومانی تحریک کے شباب کا زمانہ تھا۔اس دور میں متعدد ادیبوں نے انشائیے لکھے۔ ناصر نذیر فراق نے بھی اپنے تخیل و تصور اور زور بیان کا ثبوت دیتے ہوئے انشائیے تخلیق کیے۔ ان کے نمائندہ انشائیوں کو یکجا کر کے کتابی شکل میں 'مضامین فراق' کے نام سے شائع کیا گیا۔ انشائیہ نگاری میں ان کی شان اور خوش بیانی کی عظمت کا اندازہ درج ذیل اقتباس کے ذریعے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

''کوئل کی باتوں نے مور کے زخمی دل پر مرہم کا اثر دکھایا اور اس نے اپنی بپتا اس طرح شروع کی۔حسن آباد میں عالم افروز نام ایک نازنین تھی، جس کی خوبصورتی اس درجہ کی تھی کہ چاند سورج اس کے ناخنوں میں پڑے چمکا کرتے تھے۔اس کا بوٹا سا قد، اٹھتی جوانی، سر سے پاؤں تک نور ہی نور تھی۔ ریشمی لباس، پھولوں کا گہنا، ویسے تو طرح طرح کے زیور پہنتی تھی، مگر جھومر کا اور خاص کر جڑاؤ جھومر کا اُسے بڑا شوق تھا۔ اور جھومر اسے لگتا بھی ایسا بھلا تھا کہ جو دیکھتا اپنا کلیجہ پکڑ کر رہ جاتا۔''10

ناصر نذیر فراق کا ایک انشائیہ بہ عنوان 'دلّی میں بیاہ کی ایک محفل اور بیگموں کی چھیڑ چھاڑ' ہے۔اس میں انھوں نے 'خط کی تکنیک' کا استعمال کرتے ہوئے دلّی کی ایک شادی کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اس میں شوخی، فلسفہ، طنز و مزاح، قدیم دلّی کے رسم و رواج، قلعۂ معلّی کی بیگماتی زبان اور ان کی آپسی تکرار کا پیکر تراشا گیا ہے۔ فراق دہلوی نے اس فن پارے میں اپنی خوش اسلوبی اور قدیم دلّی کی ٹکسالی اردو کا مظاہرہ بڑے فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔اس کا ایک نمونہ درج ذیل اقتباس میں دیکھا جاسکتا ہے:

''ایک دن حضرت بیگم اور حسن جہاں کا محیڈہ ہو گیا۔ حضرت بیگم کے دل میں حسن جہاں بیگم کی طرف سے ناحق کا بخار تو بھرا ہی ہوا تھا۔ انھیں دیکھ کر ایک بیوی سے کہنے لگیں اے بوا رضیہ سلطان سنتی بھی ہو قلعہ کی بیگمیں بلّی کو نکٹی کہا کرتی تھیں یہ چھوٹی ناک بھی کیا بُری معلوم ہوتی ہے ... حسن جہاں کی ناک بھی چھوٹی تھی اور رنگ بھی ان کا ٹپکا پڑتا تھا سمجھ گئیں کہ پھبتی مجھ پر ہی ڈھالی گئی ہے۔ وہ بھلا کب چوکنے والی تھیں کہنے لگیں پھیکا شلجم تمباکو کے پنڈے سے تو ہر طرح اچھا ہوتا ہے اور مجھے بڑی ناک دیکھ کر گھن آتی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سل کا بٹا کسی نے چہرے پر دھر دیا ہے۔''11

انشا پردازی علم ادب کا ایک فن ہے۔اس کے ذریعے فنکار اپنے علمی مشاہدات و تجربات کو موثر انداز میں تحریر کرتا ہے۔ یہ فن پارے قاری کو محظوظ کرتے ہیں اور اس کے ذہن پر اپنا نقش چھوڑتے ہیں۔ ناصر نذیر فراق کی سب سے بڑی خوبی ان کی انشا پردازی ہے۔ وہ اپنے عہد کے معروف و مقبول انشاء پرداز تھے۔ فراق دہلوی کے بارے میں نیاز فتح پوری رقم طراز ہیں:

ناصر نذیر فراق کا تعلق اس عهد سے هے جس میں کهانی اپنے داستانوی روپ کو بدل کر ناول کی شکل اختیار کر رهی تهی. یه ناول اصلاحی و رومانی طرز پر لکھے جارهے تهے.اردو نثر نگاری ناول کے ارتقائی منازل طے کرتے هوئے مختصر افسانه کی جانب قدم اٹها رهی تهی. فراق دهلوی کی تحریروں میں ناول اور افسانه نگاری کے ابتدائی نقوش ملتے هیں.

''سید ناصر نذیر فراق دہلی کے مشہور انشا پرداز تھے۔''12

فراق دہلوی کو تاریخی و حقیقی واقعات کی پیش کش پر دسترس حاصل تھی۔ان کے فن پاروں میں زبان کی چاشنی، روز مرہ کے استعمال اور ندرت انداز بیاں کے ذریعے حقیقی واقعات کا لطف اور بڑھ جاتا ہے۔انھوں نے قاری کو عہد مغلیہ اور قدیم دلّی کی سماجی، سیاسی، معاشی، اخلاقی، تہذیبی و ثقافتی جھلکیاں اپنے مضامین کے ذریعے دکھائی ہیں۔ 'دلّی کا اجڑا ہوا لال قلعہ' اور 'لال قلعہ کی ایک جھلک' اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

''صاحب عالم (مرزا شاہ رخ) اٹھے اور اپنے دست مبارک میں وہ پنجرا لیا اور محل سرا میں تشریف لے گئے۔آپ کی دادی شاہ عالم بادشاہ کی والدہ ماجدہ زندہ تھیں، وہ پنجرا اُن کے سامنے لے جا کر رکھ دیا اور کہا دادی حضرت دیکھیے ہمارے لیے ایک شخص مصیبت پیٹ کر عنقا لایا ہے۔ بیگم نے پنجرا اٹھا کر چڑیا کو غور سے دیکھا اور مسکرا کر فرمایا نوج یہ عنقا نہیں ہے یہ تو موئی دو کوڑی کی پدڑی ہے۔''13

لال قلعے کی ایک جھلک فراق دہلوی کی معروف و مقبول کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے عہد مغلیہ اور قدیم دلّی کے واقعات بیان کیے ہیں۔ان کی نثر نگاری کا کمال یہ ہے کہ تمام واقعات قاری کی آنکھوں کے سامنے چھا جاتے ہیں۔شاہد احمد دہلوی کتاب 'لال قلعہ کی ایک جھلک' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لال قلعہ کی ایک جھلک میں آپ نے (فراق) اپنے ادبی کمال کی جھلک دکھائی ہے۔''14

ناصر نذیر فراق نے تاریخی حالات پر مبنی ایک ناول 'المور کہا یا مرقع اردو' لکھا۔ یہ ناول شرر کی تاریخی ناول نگاری کا چربہ نظر آتا ہے۔شرر کی طرح المور کہا کے کردار، واقعات، مناظر اور سرزمین سب ایرانی ہیں۔المور کہا سے متعلق عبدالقادر رقم طراز ہیں:

''اس مضمون کی ابتدا گو تاریخی حالات سے ہوئی ہے لیکن حضرت فراق کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ انجام میں عجیب عجیب خیالات بامحاورہ شیریں زبان اردو میں تین باب میں تقسیم ہو کر آئندہ اشاعت میں یکے بعد دیگرے ختم ہوں گے۔''15

ناصر نذیر فراق کی متعدد کہانیوں میں تصوف کے رنگ بھی جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ تصوف ان کا خاندانی سرمایہ ہے۔انھوں نے تاریخی واقعات اور عشق کی مختلف واردات کے ذریعے اپنی تحریروں میں تصوف کا رنگ بکھیرا ہے۔اس کا ثبوت درجہ درج ذیل نمونے سے بخوبی ملتا ہے:

''حزن بھی عشق کے ساتھ جاتا تھا مگر حضرت یعقوب نے اسے روک لیا اور اس کے نام پر بیت الاحزان نام مکان بنا کر اس میں اسے ٹھیرایا اور اسّی برس تک اپنا کلیجہ اور دل جلا جلا کر اسے کھلاتے اور آنسوؤں کا خنک پانی پلاتے رہے... عشق دربار سے نکل کر حیران کھڑا ہوا تھا اور آنکھوں سے آنسو پڑے بہہ رہے تھے جو اس کی خوش قسمتی سے زلیخا وہاں آ نکلی

اوراس کی آنکھیں چار ہوگئیں ۔''16

سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری نے ترکی، عربی وانگریزی افسانوں اور ناولوں کے تراجم پیش کر کے اردو ادب کے دامن کو وسعت بخشی۔ اسی زمانے میں میر ناصر علی، قاری سرفراز حسین، راشد الخیری اور حسن نظامی وغیرہ بھی اس طرف متوجہ ہوئے۔

سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری نے ترجمہ نگاری کے لیے جو راہ ہموار کی اس پر ناصر نذیر فراق نے بھی اپنے قدم اٹھائے۔ انھوں نے لفظی ترجموں کے بجائے آزاد ترجمے کیے۔ موقع محل کے لحاظ سے غیر ملکی فضا اور کرداروں کے نام بھی برقرار رکھے۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ بعض طبع زاد ہیں اور کچھ عربی و فارسی ادب سے مستعار لیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر 'اختر محل' میں بادشاہ کا رات میں بھیس بدل کر نکلنا اور رعایا کے حالات دریافت کرنا ایسے پلاٹ عربی، فارسی اور سنسکرت ادب میں بخوبی ملتے ہیں۔ اختر محل ایک سبق آموز، نصیحت خیز اور اخلاقی قصہ ہے۔ اس میں فراق دہلوی نے نذیر احمد کی اخلاقی واصلاح پسندی کی پیروی کرتے ہوئے کہانی بیان کی ہے۔ درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

''حسینہ بیگم نے سکینہ بیگم کو دیکھ کر منھ بنالیا اور اس غریب سے یہ بھی نہ کہا کہ تو بیٹھ جا یہ آپ ہی بے حیائی سادھ کر جوتیوں کے پاس زمین پر بیٹھی... حسینہ بیگم کو اول تو جب سکینہ رانڈ اور محتاج ہوئی تھی اوسکی صورت سے نفرت ہوگئی تھی اس نے اپنے دل میں ٹھان لی تھی کہ میں حسین مرزا کی شادی کسی ایسے کھاتے پیتے ہوت والوں میں کروں گی جہاں میرا اور میرے بچے کا ارمان نکلے۔''17

ناصر نذیر فراق نے سوانحی انداز میں ایک کتاب 'میخانۂ درد' 1910 میں لکھی۔ اس میں انھوں نے خواجہ میر درد اور ان کے آبا و اجداد کے حالات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ اس کتاب میں فراق دہلوی نے اپنے والد محترم کے ساتھ ساتھ والدہ محترمہ کا بھی شجرہ قلم بند کیا ہے۔ میخانۂ درد سے متعلق حکیم سید ناصر خلیق فگار رقم طراز ہیں:

''حضرت خواجہ میر درد دہلوی قدس سرہ العزیز اور آپ کے حسب نسب اور آل اولاد اور آپ کے سجادہ نشینوں اور شاگردوں اور آپ کے مشائخ کے حالات اور آپ کے ظاہری و باطنی کمالات جناب فضیلت مآب مولانا حکیم خواجہ سیّد ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی مدظلہ العالی نے مرقوم فرمائے ہیں۔''18

ناصر نذیر فراق کے ناولوں اور افسانوں کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ یہ فن پارے اس دور کے ہیں جس میں ناول اور افسانے اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہے تھے۔ ان کے نثری کارناموں کو موجودہ فنی اصولوں پر پرکھنا صحیح نہیں ہے۔ اس زمانے کے بیشتر ناول نذیر احمد کی اخلاقی واصلاحی اور سجاد حیدر یلدرم کی رومانی ناول نگاری کے زیر اثر تخلیق کیے گئے۔ ان ناولوں میں پلاٹ، قصہ نگاری، کردار نگاری، منظر نگاری، زبان کی چاشنی و جادو بیانی، محاورات اور شعریت کا پرتو وغیرہ سب کچھ موجود ہے۔ لیکن فکر وفن کی گہرائی و عُمق سے خالی ہیں۔ ناصر نذیر فراق کے ناولوں، افسانوں اور انشائیوں میں داستانوی اسلوب، زبان و بیان کی دلکشی، شاعرانہ انداز بیان، قدیم دلّی کی ٹکسالی اردو کی رنگینی، روزمرہ و محاوروں کا برجستہ استعمال، قلعۂ معلّی کی بیگماتی زبان کا اور اعلیٰ قسم کی انشاپردازی وغیرہ سبھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ بقول شاہد احمد دہلوی:

''حضرتِ فراق کی جادو بیانی۔ ان کے سلیس بامحاورہ چھوٹے چھوٹے جملے اور دل میں گھب جانے والی اردو کا کیا کہنا۔ صاحب طرز ہیں، قلعہ معلّی کی بیگماتی زبان لکھنے میں اپنا جواب آپ ہیں، دہلی کی ٹکسالی نتھری ستھری زبان میں انشا پردازی کرتے ہیں اور نت نئی بات پیدا کرتے ہیں۔ عروس زبان کو ساری عمر سنوارتے رہے اور اس کو نکھ سے سکھ بنا دیا۔''19

ناصر نذیر فراق کے انداز بیان کی لطافت، ادبی خدمات اور ان کے کارناموں کی عظمت کو حامد حسن قادری نے درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

''میر ناصر نذیر فراق جس دلّی کی خود یادگار تھے، اسی دلّی کی یادگار ان کی زبان اور ان کی کتابیں ہیں۔ انھوں نے کوئی علم وفن کی کتاب نہیں لکھی۔ ان کا قلمی کارنامہ لطف بیان اور حسن بیان کے ساتھ دہلی کی تہذیب وتمدن کا آخری نمونہ پیش کرتا ہے۔ ان کے طرزِ تحریر کی داد ان کے ایک ہم پایہ اور ان سے بزرگ ادیب دیتے ہیں۔''20

غرض ناصر نذیر فراق نے اردو نثر نگاری کو اپنے فن پاروں کے ذریعے وسعت بخشی۔ اردو نثر نگاری کو اپنی انشاپردازی، فنی تخلیقات اور خوش اسلوبِ بیان سے آراستہ کیا۔ ان کے مضامین، ناول، افسانے اور انشائیے اردو نثر کے ارتقا میں اہم کڑی ہیں۔ ان کی تحریریں قدیم دلّی کی تہذیب وثقافت کا آئینہ ہیں اور اردو ادب میں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کو اپنے فنی کارناموں اور اسلوبیات کے ذریعے سجایا، سنوارا اور اس کی درستگی بھی کی۔ فراق دہلوی کو ان کے فنی کارناموں، ادبی خدمات اور ادب لطیف کی وجہ سے اردو زبان وادب میں تا قیامت یاد رکھا جائے گا۔

حواشی

1. اردو کے اسالیب بیان: غلام محی الدین قادری زور، مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی، حیدرآباد، دکن 1927، ص 15,16
2. سیر المصطفیٰ (جلد اول): محمد یحیٰ تنہا، ادارۂ اشاعت ادب میرٹھ، 1976، ص 44
3. میخانۂ درد: ناصر نذیر فراق دہلوی، جید برقی پریس، 1910، ص 236
4. چار چاند: ناصر نذیر فراق دہلوی، دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی 1930، ص 4
5. ایضاً، ص 11
6. میخانۂ درد، ص 229
7. ایضاً، ص 30-229
8. چار چاند: ناصر نذیر فراق دہلوی، دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی 1930، ص 2
9. ایضاً، ص 6
10. مضامین فراق: ناصر نذیر فراق دہلوی۔ محبوب المطابع برقی پریس، دہلی، ص 69
11. بیگموں کی چھیڑ چھاڑ: ناصر نذیر فراق دہلوی، شاہجہاں بک ایجنسی، دہلی۔ ص 27
12. رسالہ ساقی، دہلی، افسانہ نمبر، جولائی 1935
13. دلّی کا اجڑا ہوا لال قلعہ: ناصر نذیر فراق دہلوی، شاہجہاں بک ایجنسی، دہلی، ص 11
14. رسالہ ساقی، دہلی، فروری 1930، ص 2
15. رسالہ مخزن، اگست 1912، ص 47
16. کان ملاحت: ناصر نذیر فراق دہلوی، رسالہ مخزن، جولائی 1912، ص 30
17. اختر محل: ناصر نذیر فراق دہلوی
18. میخانۂ درد، سر ورق
19. چار چاند، ص 3
20. داستان تاریخ اردو: حامد حسن قادری، اے بی سی آفسیٹ پرنٹرز، دہلی 2007، ص 868

Sabir Riyaz Khas
Department of Urdu, Aligarh Muslim University
Aligarh- 202002
Mob.: 9044277505

بلوندر سنگھ

قاضی عبدالودود کا تصورِ تحقیق و تدوین

قاضی عبدالودود اردو تحقیق کا سب سے زیادہ محترم اور مستند نام ہے۔ ان کی پیدائش جہاں آباد (بہار) مئی 1896 میں ہوئی۔ والد کا نام قاضی عبدالوحید تھا، جو علم و ادب کا ستھرا مذاق رکھتے تھے بالخصوص شاعری سے انھیں گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے وحید الہ آبادی، شاگرد آتش کی صحبت پائی تھی اور ان کا کلام 'گلدستۂ فردوسِ خیال' غازی پور میں شائع ہوا تھا۔ ان کی وفات 1908 میں ہوئی۔ قاضی صاحب کی والدہ سید شاہ عبدالرحمٰن متوطن کاکو کی بیٹی تھیں۔ ان کا نام بی بی درگاہن تھا۔ 1924 میں پٹنہ میں ان کا انتقال ہوا۔ قاضی عبدالودود کی ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد کلام پاک حفظ کرنا شروع کیا اور چودہ سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا۔ ہر چند کہ قاضی صاحب ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے اور ان کی ابتدائی تعلیم بھی مذہبی خطوط پر استوار ہوئی تاہم وہ مذہب کے معاملے میں سخت گیر اور متشدد ہونے کے بجائے آزاد اور اعتدال پسند رہے۔

اردو میں سائنٹفک تحقیق کی بنیاد، سرسید اور ان کے نامور رفقا کی مرہونِ منت ہے۔ سرسید محض مصلح اور معمارِ قوم ہی نہ تھے بلکہ جدید اردو نثر اور مدعا نویسی کے بنیاد گزار بھی تھے۔ جس دور میں سرسید کا تحقیقی و تصنیفی شعور پختہ ہو رہا تھا، وہ قدیم معیارِ تحقیق کے لحاظ سے کم اہم نہ تھا۔ آرزو، شیفتہ، غالب اور امام بخش صہبائی علمی اور فنی رموز و نکات کے باب میں محققانہ بصیرت رکھتے تھے۔ سرسید ان سے فیض یاب ہوئے، انھوں نے 'آئینِ اکبری' اور 'تاریخ فیروز شاہی' کی تصحیح کی اور معیاری متن پیش کیے، جسے بجا طور پر تحقیقی تصحیح کہا جا سکتا ہے۔ ان میں زبان اور املا کی درستگی اور الفاظ کے صوری و معنوی رشتوں کی نشاندہی، تقابل اور تجزیے کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ 'آثار الصنادید' کا دوسرا ایڈیشن اسی لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ اسے تحقیق کے طریقِ کار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ذرائع معلومات، مآخذ اور اشاریے کے التزام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

عہدِ سرسید میں غور و فکر کی بنیادیں سماجی، تہذیبی اور اخلاقی مسائل پر کھڑی تھی۔ یہ بدیہی طور پر حقائق کی جستجو اور بازیافت کا عمل تھا جس میں علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر کی کارفرمائی کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ تحقیق کا رشتہ علمی سچائیوں کی روشنی میں سمجھنے اور جاننے کی کوشش سے ہے اور اسی بنیاد پر تحقیق کے طریقہ کار کا تعین ہوتا ہے۔ حالی، شبلی اور مولوی ذکاء اللہ کے یہاں استقرائی تحقیق کی بعض صورتیں ابھرتی نظر آتی ہیں۔ بالخصوص شبلی نے فارسی، عربی اور تاریخ کے مآخذ سے جو معلومات بہم پہنچائی اسے اسی تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ المامون، الفاروق، علم الکلام اور فارسی ادبیات کی کتاب شعر العجم میں انھوں نے مختلف عربی، فارسی شعراء، ادبا، تذکرہ نگاروں اور انگریزی مؤرخین سے استفادہ کیا۔ ان اکابرین کی ادبی، علمی اور تحقیقی خدمات ہماری ادبی تاریخ میں اثاثے کا حکم رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں تحقیق کے مبادیات اور اصولِ تحقیق کے اقدار کے تعین پر بھی ان بزرگوں نے خاطر توجہ نہ دی۔ اس لحاظ سے حافظ محمود شیرانی کو یہ اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے تحقیق اور اس کے اصولوں کے تعین سے دلچسپی لی۔ شیرانی نہ صرف ادبی تحقیق کے باضابطہ بنیاد گزار ہیں بلکہ انھوں نے تحقیق کے اصول پائیدار بنیاد پر قائم کیے اور جدید مغربی اصولوں کو رواج دیا۔

یہ درست ہے کہ قاضی عبدالودود سے قبل اردو میں تحقیق کی روایت قائم ہو چکی تھی تاہم اصول تحقیق و تدوین کے ضمن میں کوئی باضابطہ اصول اور طریقۂ کار وضع نہیں ہو پائے تھے۔ اردو میں مشرقی طریقہ کار سے ایک حد تک واقفیت تھی لیکن عقائد و تصورات اب بھی غالب تھے۔ اردو تحقیق میں قاضی عبدالودود کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک طرف ادب کے عقائد و تصورات کے حصار کو توڑا، وہیں دوسری طرف یک طرفہ مطالعے اور مبالغے پر کاری ضرب لگائی۔ انھوں نے پہلی بار تحقیق کی ایسی تعریف متعین کی جو جدید، سائنٹفک اور مدلل تھی جس کی اہمیت کا اعتراف تمام متقدر محققین اور علما نے کیا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ جو بھی کہا جائے وہ پوری طرح درست اور مدلل ہو۔ علاوہ بریں یہ کہ انھوں نے اس روایت کو بھی غیر ضروری ٹھہرایا جس میں بڑی شخصیت کا فرمایہ ہوا ہر لفظ مستند تصور کیا جاتا تھا، یعنی قاضی عبدالودود نے 'خطائے بزرگاں گرفتن خطا است' کی مثل کو مفروضہ قرار دیتے ہوئے ان کے دعوؤں کو اصولِ صداقت کی کسوٹی پر پرکھنے کی طرح ڈالی۔ اس سلسلے میں انھوں نے قدما کے کارناموں کا احتساب نہیں کیا بلکہ اپنے معاصرین کی تحریروں کی غلط فہمیوں کی بھی نشاندہی کی۔ 'غالب بحیثیت محقق' محمد حسین آزاد اور آبِ حیات کے تعلق سے تحریریں اور 'مولوی عبدالحق بحیثیتِ محقق' جیسے مضامین بطورِ مثال پیش کیے جاتے ہیں۔ قاضی عبدالودود نے تحقیق کے جو آداب سکھائے اور جو اصول مرتب کیے ان کے تصورِ تحقیق و تدوین اور اصول و نظریات کے پرتو بہ درجہ اتم موجود ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب 'تحقیق کا فن' میں قاضی عبدالودود کے ان لفظوں کو کوٹ کیا ہے: قاضی عبدالودود کے نزدیک 'تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے' یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ جب کسی امر کی اصل شکل پوشیدہ یا مبہم ہو تو اس کی اصلی شکل کو دریافت کرنے کا نام تحقیق ہے۔ 'کوشش' لفظ کا استعمال قاضی صاحب نے ارادتاً کیا ہے، وجہ یہ کہ دیکھنا اور دیکھنے کی کوشش الگ الگ ہو سکتی ہیں، کوشش کامیاب بھی ہو سکتی ہے اور ناکام بھی۔ اس عبارت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حقیقت موجود ہے، یہ بات الگ ہے کہ وہ ہماری نظروں سے اوجھل اور پردے میں ہے اسے دریافت کرنے کے لیے ہمارے پاس وسائل اور ذرائع

کامیاب ہیں۔ دوسرے علوم وفنون کی طرح تحقیق بھی مخصوص طبعی ساخت اور ذہنی رویے کا مطالبہ کرتی ہے۔ قاضی عبدالودود کے نزدیک تحقیق کے سلسلے اظہار میں صاف گوئی لازمی ہے۔حق گوئی پر تمام لوگ کاربند نہیں ہوسکتے جس کا تعلق ذاتی صلاحیتوں اور خوداعتمادی سے ہے۔تحقیق میں ایک خاص مزاج کا ہونا لازمی امر ہے، یہاں خاص مزاج سے مراد'حق' میں خوف و مصلحت پسندی کا عمل دخل نہیں ہونا چاہیے۔محقق کے لیے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ عجلت پسند اور سہل پسند نہ ہو اور اس کے اندر شک کا مادہ بہ درجہ اتم موجود ہو۔قاضی عبدالودود نے تحقیقات کے اجزا کو چار حصوں میں منقسم کیا ہے (1) موضوع کا انتخاب (2) مواد کی فراہمی (3) پیرایۂ اظہار (4) اخلاقیات۔

(1) موضوع کا انتخاب: بعض موضوعات ایسے ہوتے ہیں جن پر قلم اٹھانا نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔محقق کو اس قسم کے موضوعات سے گریز کرنا چاہیے۔تحقیقی موضوع کے انتخاب میں اپنی صلاحیتوں کا لحاظ ضروری ہے تاکہ انتخاب شدہ موضوع کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکے۔جو لوگ ذاتی تجربہ نہیں رکھتے انھیں مختصر موضوع تلاش کرنا چاہیے، موضوع زیادہ پیچیدہ نہ ہو نیز تحقیقی کاموں کے لیے تجربہ کار لوگوں سے صلاح اور مشورہ لینا بھی ضروری ہے۔

(2) مواد کی فراہمی: اس ضمن میں قاضی عبدالودود نے تحقیق کے سلسلے میں اپنی رائے دی ہے کہ صرف انھیں کتابوں کا مطالعہ نہیں کرنا چاہیے جن کا موضوع سے براہِ راست تعلق ہو بلکہ ان تمام کتب کا مطالعہ بھی ضروری ہے جن میں موضوع سے براہِ راست بحث نہ کی گئی ہو مگر مواد کا کچھ حصہ ان کتابوں میں موجود ہو۔قلمی اور مطبوعہ دونوں نسخوں کا مطالعہ ضروری ہے، وہ اس لیے کہ ممکن ہے کہ جو باتیں قلمی ہوں وہ مطبوعہ نسخوں میں نہ ہوں۔علاوہ بریں مواد کے سلسلے میں معاصرین اور مختلف اصحاب کی آرا کا جاننا بھی ضروری ہے تاکہ تحقیق میں کسی جز کے چھوٹ جانے کے امکان باقی نہ رہے۔

(3) پیرایۂ اظہار: تحقیق میں پیرایۂ اظہار ظاہری عنصر ہے اس لیے تحقیق کی عبارت دلفریب نہ ہو تو پیچیدہ بھی نہیں ہونی چاہیے۔عبارت، صاف، سادہ اور سلیس ہو جو آسانی سے سمجھی جاسکے۔دلفریب ہو یا نہ ہو لیکن عبارت کا واضح ہونا تحقیقی مضامین کے لیے اشد ضروری ہے۔

(4) اخلاقیات: آداب و اخلاق کا ہونا ہر چیز کے لیے لازمی جز ہے۔ممکن ہے کہ کسی موضوع سے جذباتی تعلق ہو لیکن جذبات کی رو میں بہہ کر حقائق سے گریز مناسب نہیں ہے۔مصلحت ذاتی بھی ہوسکتی ہے اور قومی بھی، لیکن محقق کو مصلحت اندیش نہیں ہونا چاہیے۔محقق اگر ان باتوں پر غور نہیں کرتا تو پھر مضمون کا تعصب زدہ ہونا عین ممکن ہے۔

ان بنیادی اجزا کے علاوہ قاضی عبدالودود نے تحقیق و تدوین کے ضمن میں جو باتیں تحریر کی ہیں انھیں نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ان کے نزدیک تحقیق میں ہر بات اہمیت نہیں رکھتی لیکن بات اہم ہو یا غیر اہم، محقق کو حق ادا کرنا چاہیے۔بعض اوقات کوئی بات جو محض جزوی معلوم ہوتی ہے، غیر معمولی اہمیت اختیار کرلیتی ہے۔ مزید یہ کہ بے احتیاطی اگر عادت بن گئی تو وہ امور جو خود لکھنے والے کی نظر میں اہم ہیں ان سے گریز نہیں۔

تحقیق میں حوالوں کی اہمیت سے صرفِ نظر ممکن نہیں البتہ بعض اصحاب کو حوالے پسند نہیں۔قاضی عبدالودود اس بات سے متفق ہیں کہ ہر بیان کے لیے حوالوں کی ضرورت نہیں، لیکن اگر کوئی نئی بات کہی جائے تو ماخذ کا ذکر ضروری ہے۔تحقیقی مقالات میں ایسے امور جو موضوع سے تعلق نہیں رکھتے اور جن کا ذکر ضمناً آ گیا ہے، ہر دعوے کی سند لازم نہیں۔ قاضی عبدالودود نے صحتِ متن سے خصوصی دلچسپی لی اور متعدد شعرا کے کلام اور دیوان کی ترتیب و تنظیم اس بات کے بین ثبوت ہیں کہ انھیں شعری متون کی غلطیوں کا احساس تھا اور تصحیح متن کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔صحتِ متن کے معیار اور اصلیت کا اظہار کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اصل متن بطور شاذ ہم تک پہنچا ہے۔عموماً نقل درنقل پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ آج کل کی چھپی ہوئی کتابیں مصنفین اور اہلِ مطبع کے احتیاط کے باجود اغلاط طباعت سے خالی نہیں ہوتیں تو تعجب ہے اگر کم فہم اور نا قابل کاتبوں کے لکھے ہوئے مخطوطات اغلاط سے مملو ہوں۔ان اغلاط کی تصحیح اور صحتِ متن کی تیاری وہی لوگ کر سکتے ہیں جن میں اعلیٰ درجے کا علم اور بصیرت موجود ہو۔سقیم متن کی اطمنان بخش تصحیح کی صلاحیت کمیاب ہے۔''[1]

اس عبارت سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ صحتِ متن کے معیار سے بے اطمینانی کا اظہار کر رہے ہیں اس ضمن میں انھوں نے تذکروں اور دیوانِ شعرا سے مثالیں پیش کی ہیں اور از سرِ نو صحتِ متن اور تحقیقِ متن کا احساس دلایا ہے۔انتخابِ کلام میر، نکات الشعرا، تذکرۂ ہند، سرگزشتِ حاتم، تذکرۂ سرور، مجموعۂ نغز، آبِ حیات، دیوانِ فدوی، تذکرۂ میر حسن، دیوان جوش، کلیاتِ میر، دیوانِ مصحفی، دیوانِ جرأت جلد اوّل سے خاص مثالیں پیش کی ہیں۔اس قسم کے متعدد ضابطے اور اصول ان کی تحریروں میں بکھرے نظر آتے ہیں۔

قاضی عبدالودود نے ان باریک نکتوں کی بھی نشاندہی کی ہے جو ایک مدوّنِ متن یا محقق متن کے لیے ضروری ہے اور متن کی تدوین کے عمل میں اس پر توجہ کی جانی چاہیے۔جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے اس کے حسن و قبح پر اظہارِ خیال کی گنجائش تو ممکن ہے، لیکن ایسی عبارت کی نقل کی صورت میں یہ خیال رہنا چاہیے کہ ان کا کوئی ضروری جز حذف نہ ہو۔اگر ضرورت کے لحاظ سے اس میں تصرف کیا گیا ہو تو اس کی بابت وضاحت لازمی ہے۔انھوں نے سنجیدہ اسلوبِ بیان کے علاوہ کسی مواد سے استفادے کی صورت میں اس کا ایماندارانہ اعتراف بھی ضروری قرار دیا ہے۔ان کی یہ عبارت توجہ طلب ہے:

''سوقیانہ لہجہ اختیار کرنا، خود اپنی بدذوقی کا اعلان ہے۔علمی مباحث میں سب وشتم کی گنجائش ہی نہیں۔ دوسروں سے استفادہ ہوا تو اس کا مناسب اعتراف لازمی ہے کوئی کتاب نظر سے نہیں گزری تو اس کا حوالہ اس طرح نہ دیا جائے کہ قاری اس کے خلاف سمجھے۔ دوسروں سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ جو امور ہم اپنے لیے جائز سمجھتے ہیں، ان کے واسطے ناروا قرار دیں۔''[2]

قاضی عبدالودود کے متعدد مضامین اور تبصرے اس اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں کہ ان میں جہاں تحقیق و تدوین کے آداب ظاہر ہوتے ہیں، وہیں ان کے تحقیقی نقطۂ نظر اور تحقیقی اسلوب سے ہمیں واقفیت بہم پہنچتی ہے۔اس طرح کے مضامین میں 'غالب بحیثیت محقق'، 'آزاد بحیثیتِ محقق'، 'عبدالحق بحیثیتِ محقق' خصوصی طور پر اہمیت کے حامل ہیں۔اسی طرح تبصروں میں ذکرِ غالب اشاعتِ ثانی، بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا۔ تذکرۂ سرور، فرہنگ آصفیہ، فرہنگ غالب، وضاحت بیان، رہبر تحقیق وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے دواوین اور تذکروں کی بھی ترتیب و تدوین

سے گہری دلچسپی لی، ان کا مقصد قدما اور متاخرین کے علمی و ادبی کاموں کو حشو و زوائد سے پاک، اصلی شکل میں منظرِ عام پر لاکر انھیں تحفظ فراہم کرنا۔ لیکن قاضی صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ عملی یا اطلاقی تحقیق اور تدوینِ متن کے عمل میں ترتیب و تدوین کے اصولوں کی نشاندہی اور وضاحت بھی کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی کتابیں مآثرِ غالب، دیوانِ جوشش، دیوانِ رضا عظیم آبادی، تذکرہ شعرا ابن امین اللہ طوفان، تذکرہ مسرت افزا مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔

قاضی عبدالودود کی اصول پسندی اور حق گوئی سے ان کے مخالفین بھی انکار نہیں کر سکے۔ انھوں نے بڑے بڑے ادیبوں کے تسامحات نیز قائم کردہ مفروضات اور تصورات کو جس بے رحمی سے چاک کیا وہ انھیں کا خاصہ ہے۔ اس ضمن میں چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

(i) ایک مضمون 'میر کی حالاتِ زندگی' میں رقمطراز ہیں:
''میر نہ منصف ہیں، نہ راست گفتار اور ان کا حافظہ بھی زیادہ مضبوط نہیں تھا۔''

(ii) میر نے اپنی ذات، اپنے بزرگوں اور اپنے مخالفین کی نسبت جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ لازماً قابل قبول نہیں۔''3

انھی خصوصیات کی بنیاد پر اردو کے ممتاز محققین، ادبا اور شعرا نے ان کی علمی، ادبی و تحقیقی شخصیت کا بجا طور پر اعتراف کیا ہے۔ بابائے تدوین رشید حسن خان ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں:

''قاضی عبدالودود صاحب کو اردو میں تحقیق کا معلّمِ ثانی کہنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ نئی نسل تحقیق کے آداب اور انداز سے قاضی صاحب کے توسط سے آشنا ہوئی ہے، پچھلے پچیس تیس برسوں میں احتیاط پسندی کا جو رجحان بڑھا ہے، شک کرنے، یا یوں کہیے کہ مضبوط دلیلوں کے بغیر دعوؤں کو قبول نہ کرنے کا انداز جس طرح فروغ پذیر ہوا ہے اور منطقی استدلال نے جس طرح اہمیت حاصل کی ہے۔ دوسرے لفظوں میں زود یقینی اور خوش اعتقادی نے جس طرح کم اختیاری کی سند پائی ہے، اس میں قاضی صاحب کی تحریروں کا بڑا حصہ ہے۔ ان کی بے پاک شخصیت، ان کے بے جھجک اندازِ گفتگو اور ان کے سخت گیر احتساب نے، اس زمانے میں تحقیق کے طالب علموں کی ذہنی تربیت کی ہے اور ان کی تحریروں نے یہ بتایا کہ تحقیق کی زبان اور پیرایۂ اظہار میں انشا پردازی، مرصع کاری اور الفاظ کے بے محابا استعمال کی مطلق گنجائش نہیں۔''4

قاضی عبدالودود نے تحقیق کا ایک شعبہ قائم کیا اسے نہ صرف تنقید سے ممیز بلکہ ممتاز کر دیا۔ انھوں نے اپنے عالمانہ مضامین سے یہ ثابت کیا کہ تنقید میں صحیح نتائج نکالنے کے لیے تحقیق کی پیروی کرنا ضروری نہیں، بلکہ یہ بھی بتلایا کہ بعض شعرا سے منسوب دواوین ان کے نہیں ہیں یا ان سے منسوب کتابوں میں اکثر شمولیت کے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں وہ بے سروپا ہیں، ان پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تحقیق اور تنقید کو ایک دوسرے سے وابستہ کردیا۔ پروفیسر محمد حسن کے یہ الفاظ قاضی عبدالودود کے تئیں قابل توجہ ہیں، لکھتے ہیں:

''تحقیق کا مقصد نئی معلومات کی دریافت اور ان کا بے کم و کاست بیان ہے قاضی صاحب نے تحقیق کو طرزِ زندگی بنادیا۔ یہ محض علمی مشغلہ نہیں اصول زیست ہے تحقیق کے پُر خطر میدان میں قدم رکھنے سے قبل کتنی زبردست خود احتسابی ضروری ہے، دوسروں کی فروگزاشتوں کا ذکر کرنے سے پہلے اپنی تحریر پر کتنی توجہ کیسی احتیات اور کس قدر ریاضت صرف کرنا ہوگی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بےقوفی سے بات کہنے سے قبل اپنے ہر مقالے کو ممکن اعتراض اور ہر چیلنج سے مبرّا بنانا ہوگا۔ اور یہ سب کام قاضی عبدالودود نے بڑی عرق ریزی، جانفشانی اور لگن سے کیے ہیں۔''5

ملحوظ خاطر رہے کہ قاضی عبدالودود سے قبل اردو تحقیق میں قدما کے بیانات کو دلیل کی روشنی میں دیکھنے کا رواج نہیں تھا۔ اس ضمن میں قاضی صاحب نے بڑی جرأت سے بت شکنی کے فرائض کو انجام دیا اور تحقیق کی راہ میں قدم رکھنے والوں کو تنقیدی بصیرت، فہم اور آگہی عطا کی، جس سے واقعات کی حقیقت اور صداقت تک پہنچنا آسان ہوگیا۔ اس تعلق سے انھوں نے کسی مورخ، تذکرہ نگار، محقق یا نقاد کو جرح اور تنقید سے چھوڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تحریروں کی بدولت اردو میں نہ صرف تحقیق کا رجحان بڑھا اور معیار بلند ہوا بلکہ لکھنے والوں میں شعوری طور پر احتیاط کا مادہ پیدا ہوا۔ ان کی تنقیدوں سے علمی دیانت داری، ذمے داری اور صحیح نتائج کے منطقی استخراج پر اس طرح زور دیا کہ اصل واقعات خود بخود برآمد ہوں، تخلیق کار کو انھیں پیدا کرنے کی کوشش کرنی پڑے۔

اردو ادب پر قاضی عبدالودود کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ آزادی کے بعد انھوں نے محققین کی دو نسلوں کی آبیاری کی۔ ان کی تحقیق کا بنیادی وصف یہ کہ وہ فکر کے بنیادی جوہر پر اصرار کرتے ہیں، مقدمات اور نتائج میں ایک منطقی ربط و ترتیب تلاش کرتے ہیں اور جہاں انھیں ربط نہیں ملتا وہاں بے رحمی سے اس کو رد کر دیتے ہیں۔ اردو تحقیق کو انھوں نے آرائشی پیرایۂ اظہار سے آزاد کیا، سائنسی قطعیت اور ریاضی صراحت کی خاطر اپنی تحریروں میں علامتیں اور نشانات کا استعمال کیا، جو تحقیق میں انھی کی خاص ایجاد تسلیم کی جاتی ہے۔ علاوہ بریں ان کے تحقیقی مضامین، تبصرے یا مقالے محض نئی معلومات کا خزانہ ہی نہیں ہوتے بلکہ ان کے توسط سے وہ آدابِ تحقیق اور اندازِ بیان کے ضابطے کی جابجا صراحت بھی کرتے ہیں۔ قاضی عبدالودود کی وہ خاصیت جو انھیں دوسروں پر فوقیت عطا کرتی ہے وہ یہ کہ وہ کسی سے مرعوب نظر نہیں آتے اور نہ معترضین کی باتوں پر دھیان دیتے ہیں، بلکہ سچائی یہ ہے کہ انھوں نے فرد کے بجائے متن اور نگارشات کو مقدم سمجھا اور متون کی غلطیاں خواہ وہ کسی قسم کی ہوں، ان کی گرفت کرتے تھے۔ مزید یہ کہ انھوں نے صرف گرفت ہی نہیں کی بلکہ ان کی تصحیح بھی کی، تاریخی امور کے بابت اشارے تیار کیے، صحتِ متن پر توجہ مبذول کرائی، غلط منسوب ناموں کے علاوہ اصل شعرا کو بھی دریافت کیا۔

حواشی

1. اردو میں ادبی تحقیق، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ 1995، ص25
2. مونوگراف قاضی عبدالودود، پروفیسر آفتاب احمد آفاقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی 2016، ص56
3. دہلی کالج اردو میگزین، میر نمبر، مرتب نثار احمد فاروقی، 1962، ص27
4. تحقیق کا معلّم ثانی، قاضی عبدالودود نمبر، مرتب کلیم الدین احمد، 1974، ص120
5. معاصر، پٹنہ، قاضی عبدالودود نمبر، مرتب کلیم الدین احمد، 1974، ص56

Dr Balvinder Singh
R/o-Nowshera,P/o-Mahanpur
Tehsil-Mahanpur
Distt-Kathua -184202, J&K (U.T)
Cell: 6006038989
Balvindersingh@bhu.ac.in

فیضان اشرف

امتیاز علی عرشی کی تدوینی خدمات

کسی خاص متن کی بازیافت اور اس کی تصحیح وترتیب کے عمل کو تدوین کہتے ہیں۔ تدوین کے ذریعے قدیم متون کو گمنامیوں سے نکال کر ان کو مصنف کے اصل متن سے قریب سے قریب تر لانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کر کے درست کیا جاتا ہے۔ اس میں مرتب کسی مصنف کی منتشر تخلیقات یا کسی تخلیق کے منتشر اجزا کی تصحیح و ترتیب کر کے جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ کوشش بھی کرتے ہیں کہ کسی بھی قدیم متن کو اس انداز میں پیش کیا جائے کہ جیسا اس متن کو مصنف نے آخری مرتبہ لکھا تھا۔ ترتیب متن کا کام تحقیق وتنقید سے قدرے مختلف ہے اس میں فنی مہارت کے ساتھ دلچسپی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ کام وہی انجام دے سکتے ہیں جن کو قدیم مخطوطات ومتون سے دلچسپی ہو اور یہ دلچسپی ہمیں مکمل طور سے مولانا امتیاز علی عرشی کی تحریروں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ صابر علی سیوانی اپنی کتاب 'تدوین متن کی روایت آزادی کے بعد' میں لکھتے ہیں:

''ان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اردو ادب کو تحقیق کے آداب ورموز سکھائے۔ تحشیہ وتدوین کا معیار قائم کیا اور صحت متن کو اعتبار بخشا... عرشی صاحب نے اپنی تحقیقی کاوشوں سے ادب کو بیش بہا ادبی خزینے سے روشناس کرایا اور ان متون کو صحت متن کے ساتھ پیش کیا، جو نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔''[1]

مولانا امتیاز علی عرشی نے پوری زندگی نادر مخطوطات اور کلاسیکی متون کی دریافت میں وقف کر دی۔ محنت و تجسس مولانا عرشی کا شیوہ تھا وہ اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے جب تک کہ کسی بھی متن کے تمام تر نسخوں کو ملاحظہ نہ کر لیں۔ تحقیق کی شرط اول کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ اس لیے انھوں نے کبھی قیاس آرائی اور افواہ پر یقین نہیں کیا بلکہ خود اس کی تصدیق کی۔ اس لیے ان کے اسلوب میں ہمیں ان کی محنت، تجسس، تخصیص نظر آتی ہیں۔ امتیاز علی عرشی کا تحقیقی دائرہ بہت وسیع ہے انھوں نے اردو زبان کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی زبانوں کی ادبیات پر بھی بیش بہا کارنامے انجام دیے ہیں۔

مولانا امتیاز علی عرشی کا شمار اردو تحقیق میں بحیثیت غالب شناس ہوتا ہے۔ انھوں نے غالب کے تعلق سے جو تحقیقی کارنامے انجام دیے ہیں، ان میں دیوان غالب (نسخہ عرشی)، مکاتیب غالب، انتخاب غالب، فرہنگ غالب قابل ذکر ہیں۔

مولانا امتیاز علی عرشی کا شمار اردو تحقیق میں بحیثیت غالب شناس ہوتا ہے۔ انھوں نے غالب کے تعلق سے جو تحقیقی کارنامے انجام دیے ہیں، ان میں دیوان غالب (نسخہ عرشی)، مکاتیب غالب، انتخاب غالب، فرہنگ غالب قابل ذکر ہیں۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے بحیثیت مدون جو پہلا مقبول ترین کارنامہ انجام دیا وہ 'مکاتیب غالب' ہے۔ اس حوالے سے مشہور محقق رشید حسن خان لکھتے ہیں:

''مکاتیب غالب کے ایک ایک خط کے ذیل میں مرحوم نے بیش قیمت معلومات سے بھرپور حواشی لکھے ہیں اور مقدمہ کتاب کو گنجینۂ معلومات بنا دیا ہے۔''[2]

مولانا امتیاز علی عرشی جب رامپور رضا لائبریری سے وابستہ ہوئے تو ان کی نظر غالب کے ان خطوط پر پڑی جو زمانے سے کتب خانے میں کاغذوں کے انبار میں دبے رکھے تھے۔ مولانا عرشی نے اس وقت کی ریاست رامپور کے چیف منسٹر کرنل بشیر حسین زیدی کے اصرار پر ان تمام خطوط کو جمع کر کے ان پر ایک مبسوط مقدمہ حواشی کے ساتھ مرتب کر کے 1937 میں شائع

کیا۔ یہ سارے خطوط عرصہ دراز سے ردی کی مانند پڑے تھے لیکن مولانا امتیاز علی عرشی نے انھیں خطوط کے ذریعے غالب کی زندگی کے بعض ایسے پہلو واضح کیے جو کہ نہ صرف غالب کی نجی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ اس وقت کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی ماحول کو سمجھنے اور جاننے کے لیے کافی اہم ہیں۔

'مکاتیب غالب' غالب کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے رامپور کے نواب یوسف علی خان اور ان کے جانشین نواب کلب علی خان کے نام تحریر کیے تھے۔ مکاتیب غالب میں خطوط کی کل تعداد 115 اور مکتوب الیہم کی تعداد 6 ہے۔ اور خطوط کے علاوہ اس میں ایک قطعہ اور ایک قصیدہ درج ہے۔ مکاتیب غالب دو حصوں پر منقسم ہے جس کے پہلے حصے میں کرنل بشیر حسین زیدی کی تقریب کے علاوہ مولانا عرشی کا 173 صفحات کا طویل ترین مقدمہ شامل ہے۔ دوسرے حصے میں خطوط شامل ہیں جن کی تعداد 117 ہے۔ مکاتیب غالب کے پہلے ایڈیشن میں مولانا عرشی نے غالب کے متعلق 10 عنوانات قائم کیے تھے اور جب اس کا دوسرا ایڈیشن 1943 میں شائع ہوا تو مولانا عرشی نے اس میں دو اور عنوانات کا اضافہ کیا۔ اس طرح مکاتیب غالب میں عنوانات کی کل تعداد 12 ہو گئی ہے۔

مقدمہ کا پہلا عنوان 'سرگزشت غالب' ہے جس میں غالب کے سوانحی کوائف، تعلیم، معاصرین سے ان کا تعلق، قرض، امراض، وفات، مدفن وغیرہ کو بہت ہی مفصل و محققانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ دوسرا عنوان 'تصانیف' ہے جس میں مولانا عرشی نے غالب کی تمام تحریروں کا احاطہ کیا ہے جس میں غالب کی اردو فارسی کی کتابیں، دیوان اردو، دستنبو، کلیات فارسی، نامۂ غالب اور تاریخ سلاطین تیموریہ کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ تیسرے عنوان میں غالب کے شاگردوں کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق رامپور سے تھا۔ چوتھے عنوان میں غالب کے کاروبار اور قرض وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ پانچویں عنوان میں غالب کے انگریز تعلقات کا ذکر کیا ہے جس میں ان کو انگریزوں سے ملنے والی پینشن اور غدر کے وقت بگڑے حالات کا تذکرہ کیا ہے۔ چھٹا عنوان 'بہادر شاہ ظفر سے تعلقات'، ساتواں عنوان 'تعلقات رامپور'، آٹھواں عنوان 'اصلاح غالب' کے نام سے قلم بند کیا۔ نویں عنوان میں غالب کی انشا پردازی پر بات

'دیوان غالب نسخہ عرشی' مولانا امتیاز علی عرشی کا ماہر غالبیات کی حیثیت سے سب سے اہم کارنامہ ہے۔ یہ نسخہ غالب کے اردو کلام کا مجموعہ جسے تاریخی اعتبار سے ترتیب و تدوین کیا گیا ہے۔

کی گئی ہے۔ دسواں عنوان غالب کے عادات و خصائل پر مبنی ہے جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ غالب کسی بھی خط کا جواب دینے میں عجلت سے کام لیتے تھے۔ شدت مرض اور زیادتی ضعف کے باوجود خط کا جواب جلد از جلد دینے کی کوشش کرتے تھے۔ مولانا امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

''خط کا جواب دینے میں میرزا صاحب بہت باضابطہ تھے۔ وہ یوں تو ہر خط کا جواب فوراً لکھتے، اور غیر اختیاری عذر کے علاوہ اور کسی عذر کے پیش کرنے کا کبھی موقع نہ آنے دیتے۔''3

تحقیق و تدوین کے سلسلے میں 'دستور الفصاحت' مولانا امتیاز علی عرشی کی ترتیب کردہ کتابوں کی فہرست میں اہم مقام رکھتی ہے۔ دستور الفصاحت حکیم احد علی خان یکتا کی تصنیف ہے جس کا موضوع اردو زبان کی صرف و نحو، معانی، عروض اور قواعد اردو سے ہے۔ دستور الفصاحت فارسی زبان میں ہے اور یہ کتاب انشاء اللہ خان انشا کی کتاب 'دریائے لطافت' سے پیش تر لکھی گئی تھی لیکن دریائے لطافت کے بعد شائع ہوئی۔ اس سلسلے میں مولانا امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

''اس کی تالیف کا کام انشا کی دریائے لطافت سے پہلے انجام پا چکا تھا۔ جس کا سال اختتام 1222ھ (1807) ہے۔''4

اور آگے لکھتے ہیں:

''اس لیے ہم پچھلے دلائل کی کمک پر کہہ سکتے ہیں کہ مصنف کی نظر میں دریائے لطافت کا نہ ہونا اس بنا پر تھا کہ یہ ابھی معرض وجود ہی میں نہیں آئی تھی۔''5

دستور الفصاحت کے مقدمہ میں اردو زبان کے آغاز و ارتقا، زبان کے مستند مراکز پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ دستور الفصاحت میں مقدمہ کے بعد اس میں پانچ ابواب شامل ہیں۔ پہلا باب چار فصلوں پر مشتمل ہے۔ جو فارسی زبان کے اصول و قواعد اور صرف و نحو سے متعلق ہے۔ دوسرا باب ایک تمہید اور چھ فصلوں پر مشتمل ہے جس میں اردو زبان کے قواعد و صرف سے بحث کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں ایک تمہید اور 16 فصلیں ہیں اور یہ باب بھی اردو زبان و قواعد سے متعلق ہے۔ چوتھے باب میں 2 فصلیں ہیں جو عروض اور علم قافیہ سے متعلق ہیں۔ اس باب میں اردو اور فارسی کی بحروں پر بحث کی گئی۔ پانچواں باب چار فصلوں پر مشتمل ہے۔ اس باب میں علم بیان، علم معانی اور علم بدیع پر بحث کی گئی ہے اور آخر میں 'خاتمہ' ہے جس میں ان شعرا کے حالات زندگی اور منتخب اشعار پیش کیے گئے ہیں جن کا کلام کتاب میں بطور مثال پیش کیا گیا ہے۔

دستور الفصاحت 125 صفحات کی کتاب ہے لیکن مولانا عرشی نے اس پر 117 صفحے کا فاضلانہ مقدمہ قلم بند کیا ہے جس میں فارسی اور اردو کے متعدد تذکروں کے متعلق اہم معلومات جمع کی ہیں۔ مولانا عرشی نے مقدمہ میں مصنف کے حالات زندگی پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ہی ساتھ نسخے کے سائز، اس کی ضخامت، اول و زائد اوراق، ہر صفحے میں سطروں کی تعداد، نسخے کا خط جیسے اہم نکات کی وضاحت کی ہے۔ مولانا عرشی کی کاوش اور محنت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے

کہ انھوں نے کتاب کے آخر میں ایک ذیلی عنوان 'ماخذ حواشی' قائم کر کے ان فارسی اور اردو کے 59 مطبوعہ کتب وتذکروں کی تفصیلات درج کی ہے جن سے دستور الفصاحت کی تدوین کے دوران مدد لی۔ جس میں حمیداورنگ آبادی کا تذکرہ 'گلشن گفتار'، میرتقی میر کا تذکرہ نکات الشعراء، سید فتح علی گردیزی کا تذکرہ 'تذکرہ ریختہ گویاں'، قیام الدین قائم کا تذکرہ مخزن نکات وغیرہ کا نام شامل ہے۔

'دیوان غالب نسخہ عرشی' مولانا امتیاز علی عرشی کا ماہر غالبیات کی حیثیت سے سب سے اہم کارنامہ ہے۔ یہ نسخہ غالب کے اردو کلام کا مجموعہ جسے تاریخی اعتبار سے ترتیب وتدوین کیا گیا ہے۔ دیوان غالب پہلی مرتبہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ سے 1958 میں پہلی بار شائع ہوا۔ دیوان غالب میں مولانا عرشی کا ایک عالمانہ و فاضلانہ مبسوط مقدمہ تحریر کیا جس کی ضخامت 160 صفحات ہے۔ اس میں انھوں نے غالب کے حالات زندگی، غالب کی عربی اور فارسی زبان پر دسترس، غالب کی شاعری کی خصوصیات وعیوب پر تفصیل سے بات کی ہے۔ اس سلسلے میں مشہور محقق مالک رام اپنے مضمون تبصرہ دیوان غالب (نسخہ عرشی) میں لکھتے ہیں:

''اردو دنیا کو مولانا امتیاز علی عرشی کا ممنون احسان ہونا چاہیے کہ برسوں کہ برسوں کی ریاضت کے بعد انھوں نے یہ کام مکمل کر لیا جس میں انھوں نے موضوع کے تمام گوشوں کو اجاگر کیا۔ سب سے پہلے 160 صفحات کا دیباچہ ہے اس میں انھوں نے حسب معمول پوری داد تحقیق دی ہے۔''6

مولانا عرشی نے دیوان غالب کی ترتیب وتدوین میں متعدد نسخوں سے استفادہ کیا۔ ان سبھی نسخوں کا ذکر مولانا نے مقدمہ میں کیا ہے۔ جس میں کچھ نام یوں ہیں: 1857 کا غالب کے ہاتھ سے لکھا ہوا نسخہ، نسخہ بھوپال، نسخہ شیرانی، گل رعنا، نسخہ رامپور، نسخہ حمیدیہ، نسخہ لاہور وغیرہ۔ نسخہ غالب چار حصوں پر مشتمل ہے: گنجینہ معنی، نوائے سروش، یادگار نالہ، بادآورد۔ نسخہ عرشی میں غالب کا وہ تمام تر کلام درج کیا گیا ہے جو ان کے نام سے اب تک شائع ہوتا رہا۔

دیوان غالب کا پہلے حصے 'گنجینہ معنی' میں غالب کے وہ تمام اشعار درج کیے گئے ہیں جو نسخہ بھوپال اور نسخۂ شیرانی میں تو موجود تھے، لیکن 1833 میں ترتیب کردہ دیوان سے مرزا غالب نے خارج کر دیا تھا۔ دوسرے حصے بعنوان 'نوائے سروش' میں غالب کا وہ کلام شامل ہے جسے مرزا غالب نے اپنی زندگی میں لکھوایا تھا اور اسے طبع کرا کر کے لوگوں میں تقسیم کیا تھا۔ تیسرے حصے 'یادگار نالہ' میں وہ کلام درج کیا گیا ہے، جو دیوان غالب کے کسی بھی نسخے میں نہیں تھا، لیکن بعض نسخوں کے حاشیوں یا ان کے خطوط کے اندر یا غالب کے نام سے دوسروں کے بیاضوں اور ڈائریوں میں پایا گیا تھا اور یہ اشعار اخبارات ورسائل کے ذریعے لوگوں تک پہنچ چکے تھا۔ 'بادآورد' کے حصے میں نسخہ عرشی زادہ کے ذریعے سے دریافت کلامِ غالب کو شامل کیا گیا ہے۔

مولانا امتیاز علی خان عرشی کا مغلیہ دور کے حوالے سے ایک اور اہم کارنامہ 'نادرات شاہی' کی تدوین و ترتیب ہے۔ یہ کتاب مغلیہ حکومت کے آخری دور کے فرمانرواں شاہ عالم ثانی کے ہندی، اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔

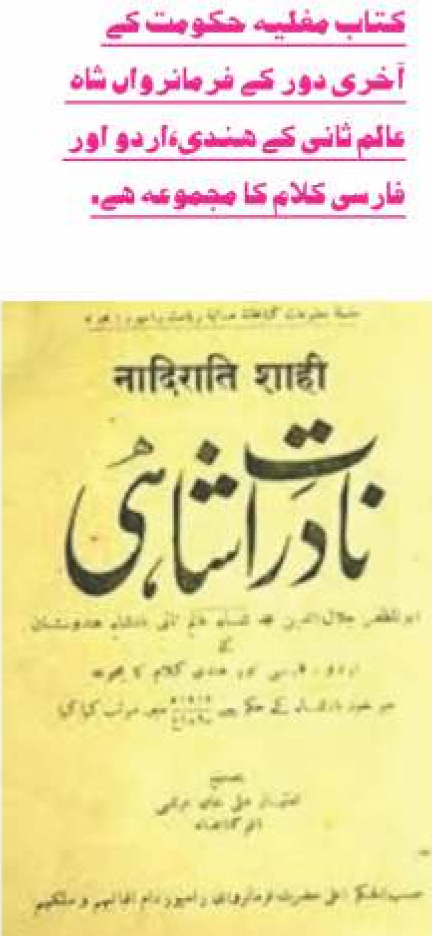

'بادآورد' کا حصہ 'دیوان غالب' نسخہ عرشی کے پہلے ایڈیشن، جو 1958 میں شائع ہوا تھا اس میں شامل نہیں تھا۔

مولانا امتیاز علی خان عرشی کا مغلیہ دور کے حوالے سے ایک اور اہم کارنامہ 'نادرات شاہی' کی تدوین و ترتیب ہے۔ یہ کتاب مغلیہ حکومت کے آخری دور کے فرمانرواں شاہ عالم ثانی کے ہندی، اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ جس کو خود بادشاہ شاہ عالم ثانی نے 1797 میں مرتب کروایا تھا۔ نادرات شاہی کو نواب کلب علی خان نے مشہور اردو شاعر داغ دہلوی کے توسط سے رامپور رضا لائبریری کے لیے خریدا تھا۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1944 میں شائع ہوا۔ حسب دستور اس میں بھی مولانا عرشی نے ایک محققانہ مقدمہ تحریر کیا جس میں شاہ عالم ثانی کی حالات زندگی، حسب ونسب، سخن گوئی وغیرہ کا ذکر بہت مفصل انداز میں پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

''عرشی صاحب کو نادر چیزیں ڈھونڈ نکالنے کا فطری ملکہ ہے جنھیں وہ زیور اطاعت سے آراستہ کر کے اہل ذوق تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ 1944 میں نادرات شاہی کی اشاعت ان کی جوہر شناسی کا نتیجہ ہے... اس کے شروع میں عرشی صاحب نے 62 صفحے کا جو مبسوط مقدمہ لکھا ہے، اسے پڑھنے کے بعد ماننا پڑھتا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ پر بھی ان کی نظر وسیع ہے۔''7

'تاریخ محمدی' میرزا محمد حارثی بدخشی دہلوی کی اہم ترین تاریخی کتاب ہے۔ اس کتاب میں حارثی بدخشی نے 10ھ سے 1161ھ تک کے مشاہیر وعلمی شخصیات کے مختصر حالات زندگی اور سنہ وفات درج کی ہیں۔ مولانا عرشی نے اس کتاب کی متن کی تصحیح کر کے اس پر حواشی لکھے۔ اس کتاب کا متن 142 صفحات پر محیط ہے لیکن حواشی 187 صفحات تک پھیلے ہیں۔ مولانا عرشی نے تاریخ محمدی کو تمام تر تحقیقی وتدوینی اصولوں کا خیال رکھتے ہوئے تدوین کیا۔ عرشی صاحب کے تدوینی کارناموں میں تاریخ محمدی کو اہم مقام حاصل ہے۔

ترجمہ مجالس رنگین مشہور ریختی گو شاعر سعادت یار خاں رنگین کی فارسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ رامپور کے اخبار 'ناظم' میں 1942 میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ مولانا عرشی نے اس کتاب کو حواشی کے ساتھ ترتیب دیا اور ساتھ ہی ان تمام تفصیلات کا بھی ذکر کیا جو اس کتاب کے وجود میں آنے کی وجہ بنیں۔ اس کتاب

میں کل 62 مجالس ہیں اور مولانا عرشی نے اس کتاب کے عنوان پر بھی تفصیلی بات کی ہے۔ جس میں انھوں نے یہ بتایا کہ اس کتاب کا نام مجالس رنگین کیسے پڑا۔

اردو کے مشہور قواعد نویس، داستان گو، شاعر و ادیب انشاء اللہ خان انشا کی مشہور غیر منقوط کتاب سلک گوہر کو تصحیح کے ساتھ پہلی مرتبہ 1948 میں رامپور سے مولانا عرشی نے شائع کیا۔ یہ 36 صفحات پر مشتمل ایک مختصر داستان ہے۔ اس داستان کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک بھی نقطہ نہیں ہے۔ لیکن یہی خوبی ہی شاید اس کی بے لطفی کی وجہ بنی۔ پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں:

’’اس کتاب کی اہمیت محض ’کوہ کندن و کاہ برآوردن‘ میں ہے۔ بے نقط کی قید کی وجہ سے اس قدر بے لطفی پیدا ہوگئی ہے کہ پوری داستان کا پڑھنا تقریباً محال ہوگیا ہے۔‘‘8

لیکن پھر بھی اپنی خاص نوعیت کی بنا یہ کتاب آج بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ سلک گہر کے علاوہ انشاء اللہ خان انشا کی ایک اور مشہور داستان ’رانی کیتکی کی کہانی‘ ہے۔ یہ ایک طبع زاد داستان ہے جس میں رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس داستان کی خاص بات یہ ہے کہ یہ خالص ہندوستانی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس میں عربی اور فارسی کے الفاظ سے پرہیز کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے اس کتاب کو مولوی عبدالحق نے تصحیح متن کے ساتھ 1926 میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کے رسالہ ’اردو‘ میں شائع کیا۔ اس کے بعد عبدالحق صاحب نے اس داستان کو کتابی صورت میں 1933 میں اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے عبدالحق کے پہلے ایڈیشن اور رضا لائبریری میں رکھے دو اور مخطوطوں کا آپس میں مقابلہ کرکے درست کیا۔ بقول گیان چند جین:

’’اسٹیٹ لائبریری رامپور میں داستان کے دو مخطوطے دریافت ہوئے ایک کتابی شکل میں ہے۔ دوسرا انشا کے ساتھ شامل ہے۔ ان کی مدد سے مولانا امتیاز علی خان عرشی نے اسے ازسرنو مکمل کیا۔‘‘9

مولانا امتیاز علی عرشی کی ایک اور اہم کارنامہ ’محاورات بیگمات‘ ہے۔ یہ کتاب مشمولہ اردو ادب، علی گڑھ، اشاعت جولائی، دسمبر 1952 میں نامی پریس، لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ مولانا عرشی نے اس کتاب کو

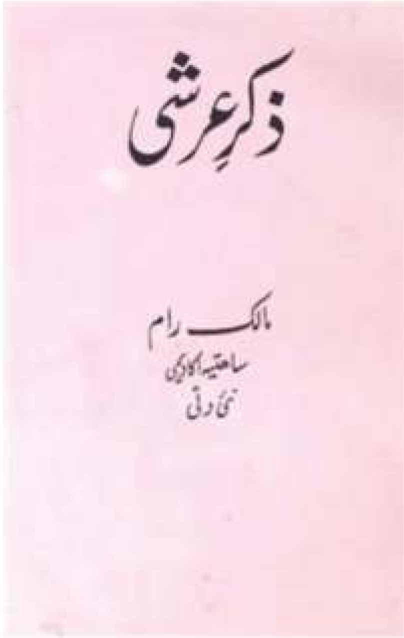

خان آرزو کی نوادر الالفاظ اور سعادت یار خان رنگین کے دیوان ریختی کی مدد سے تیار کیا۔ اس کتاب میں کل صفحات 32 ہیں۔ دیوان ریختی کے آخر میں عورتوں کے مخصوص محاوروں اور الفاظ کی فہرست ہے۔ ان محاوروں کو خان آرزو نے اپنی کتاب نوادرالالفاظ میں شامل کیا۔ مولانا عرشی نے دیوان ریختی اور نوادرالالفاظ ان دونوں کتابوں کی تشریحات کو سامنے رکھ کر مزید تحقیقی حواشی کے ساتھ مرتب کیا۔

’اردو اور افغان‘ بھی مولانا عرشی کی تحقیق دسترس اور زبان اردو پر ان کی وسعتِ نظر کا ثبوت ہے۔ مولانا عرشی نے از قبل اس کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جشن سیمیں میں 1942 میں بطور مقالہ ’اردو پر پشتو کا اثر‘ کے عنوان سے پڑھا تھا پھر اصلاح و اضافے کے بعد معارف کے تین شماروں میں 1949 میں ’اردو زبان کی بناوٹ میں افغانوں کا حصہ‘ کے عنوان سے شائع ہوا اور 1960 میں بروی پریس، پشاور سے کتابی صورت میں بعنوان ’اردو اور افغان‘ طبع ہوئی۔ یہ کتاب لسانیات کے تعلق سے بہت اہم کتاب ہے اس کتاب میں ان تمام پشتو الفاظ کے بارے میں بات کی ہے جن کا اردو کی تشکیل میں اہم حصہ ہے۔ مولانا عرشی اس بات کا بھی انکشاف کرتے ہیں کہ ماہرین لسانیات نے صرف فارسی، عربی، سنسکرت اور ترکی کو ہی اردو زبان کا پیش خیمہ بتایا لیکن پشتو زبان کو کسی نے بھی اہمیت نہیں دی۔ اس کے علاوہ عربی اور فارسی زبان میں موجود 253 پشتو الفاظ کی بھی نشاندہی کی جو آج بھی بگڑی ہوئی شکلوں میں موجود ہیں۔ یہ کتاب لسانیات کے ضمن میں اردو کی مستند اور اعلیٰ کتب میں شمار کی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ مولانا امتیاز علی خان عرشی کی دیگر غیر مطبوعہ کتابیں بھی ہیں جو ان کی وفات کے سبب منظر عام پر نہ آسکیں؛ جیسے اشاریہ اودھ کیٹلاگ، انتخاب ناظم، خطاطی کی تاریخ، دیوان مومن۔ مولانا عرشی کا انتقال اردو تحقیق و تدوین کے لیے بہت بڑا خسارہ تھا جس کی کمی شاید کبھی پوری نہیں ہوسکتی۔ امتیاز علی عرشی کی تحقیقی کاوشیں اور ان کی لگن، غیر مطبوعہ مخطوطات کی چھان بین اور ان کی تدوین و ترتیب میں انہماک نے اردو تحقیق کو مالا مال کیا ہے اور جہاں تک ان کی ذہنی انسیت کی بات کی جائے تو قطعاً ہر تحقیق جیسے حرف آخر نہیں ہوتی مگر عرشی کی ترتیب کردہ کتب یقینی طور پر آخری حوالے کا مقام رکھتی ہیں۔ کتابوں کی ترتیب میں انھوں نے ہمیشہ احتیاط سے کام لیا ہے اور ان کے یہاں اغلاط شماری بھی کم ہی ہے بلکہ بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے، یہ ان کے تحقیقی ذہن اور انتہائی احتیاط کی مثال ہے۔ امتیاز علی عرشی اپنی تحقیقات اور تدوینی خدمات کے آئینے میں ہمیشہ زندہ و جاوید رہیں گے۔

حواشی

1. تدوین متن کی روایت آزادی کے بعد: ڈاکٹر صابر علی سیوانی، محمد خالد تنویر پبلشر، حیدرآباد، 2021، ص14
2. مشمولہ: ماہنامہ ’تحریک‘ نئی دہلی، جلد 92، اپریل 1981، ص8
3. امتیاز علی عرشی (مرتب)، دیباچہ مکاتیب غالب، مطبوعہ قیمیہ، بمبئی، 1937، ص108
4. دستور الفصاحت سلسلہ مطبوعات کتاب خانہ رامپور 1943، ص27
5. ایضاً
6. مشمولہ ’نقوش‘ لاہور، شمارہ 101، نومبر 1964، ص166
7. مشمولہ: ماہنامہ ’تحریک‘ نئی دہلی، جلد 92، اپریل 1981، ص17
8. اردو کی نثری داستانیں: پروفیسر گیان چند جی، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو زبان، نئی دہلی، 2002، ص370
9. ایضاً

Faizan Ashraf
Lal Bahadur Shastri Smarak P.G. College
Anandnagar
Maharajganj - 273155 (UP)
Mob.: 9917284412
faizanashraf664@gmail.com

اقبال حسین

شمس الرحمن فاروقی

کے افسانوں کی تخلیقی زبان اور پس نو آبادیاتی مباحث

شمس الرحمن فاروقی کی شخصیت اردو ادب میں ایک نابغہ روزگار کی ہے۔ اردو ادب میں ایسا کوئی ادیب نہیں ہے جو بیک وقت تنقید اور تخلیق دونوں پر یکساں دسترس رکھتا ہو۔ فاروقی کی تنقید جس بلند پائے کی ہے اور ہم یہ بات بلا خوف و تردید کہہ سکتے ہیں کہ نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی فاروقی جیسا ذی علم، ہوش مند اور اعلیٰ درجے کا ادبی ناقد فی زمانہ کوئی نہیں ہے۔ لیکن یہ بڑے کمال کی بات ہے کہ ادبی تنقید میں اتنے بڑے کارنامے انجام دینے کے باوجود فاروقی کی تخلیقات بھی اسی اعلیٰ پیمانے کی ہیں کہ ان کا بھی کوئی ثانی اردو تو اردو دوسری زبانوں میں بھی مشکل ہی سے ملے گا۔ تنقید اور تخلیق دونوں پر یکساں دسترس اپنے آپ میں ایک عجوبہ ہے چونکہ تخلیق ہمیشہ معروضی تنقید کے مخالف ہوتی ہے۔ چاہے وہ لاشعوری طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ فاروقی کے ادبی تخلیقی سرمائے کو پس نو آبادیاتی نظریے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے نو آبادیاتی اثرات کے تناظر میں نہ صرف اردو ادب کے ثقافتی اور ادبی ورثے کو دوبارہ دریافت کیا بلکہ اسے ایک جدید اور معروضی تنقید کے ذریعے عالمی ادب کے مساوی لا کھڑا کیا۔ فاروقی کا کارنامہ اس سے کہیں زیادہ ہمہ جہت ہے۔ ان کی تخلیقی اور تنقیدی کاوشوں نے اردو ادب کو نئی سمت اور شناخت عطا کی ہے، جو انھیں نہ صرف اردو ادب بلکہ عالمی ادبی تناظر میں بھی ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔

فاروقی کے افسانے اور ان کا شاہکار ناول 'کئی چاند تھے سر آسماں' اس امر کی روشن دلیلیں ہیں جس میں ان کا تخلیقی ذہن ان کے تنقیدی شعور کے ساتھ مل کر حقیقت کو ایک اکائی کی طرح پیش کرتا ہے اور ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ کسی مخصوص زمان و مکاں میں حقیقت کا کلی ادراک کس طرح کیا جاتا ہے۔

شمس الرحمن فاروقی کا افسانوی مجموعہ 'سوار اور دوسرے افسانے' 2001 میں پہلی بار 'آج کی کتابیں' کے تحت شائع ہوا، اور 2003 میں دوبارہ 'شب خون کتاب گھر' سے منظر پر آیا۔ اس مجموعے میں پانچ افسانے شامل ہیں اور ہر افسانہ اپنے پلاٹ، تھیم اور بیانیہ کے حوالے سے بے حد اہم ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ فاروقی کے یہ افسانے اردو میں اپنی نوعیت کی بالکل منفرد تحریریں ہیں۔

برصغیر میں نو آبادیاتی دور میں اردو زبان و ادب پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ مغربی فکر، انداز، اور اقدار نے مقامی زبانوں اور ادبی رویوں کو پس پشت ڈالنے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں تخلیقی آزادی محدود ہوگئی اور مقامی ثقافتی ورثہ کمزور ہونے لگا۔ شمس الرحمن فاروقی نے اس صورت حال کا گہرا ادراک کیا اور اپنی تخلیقات کے ذریعے اردو ادب کو اس نو آبادیاتی دباؤ سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔ نو آبادیاتی پس منظر کے حوالے فاروقی اس مجموعے کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

اٹھارویں صدی کو میں ہند اسلامی تہذیبی تاریخ کا زریں باب سمجھتا ہوں۔ اردو فارسی ادب، تصوف علوم عقلیہ و نقلیہ، فنون حرب و ضرب، موسیقی، ان میدانوں میں اٹھارویں صدی والوں نے جو نئے نئے مضمار دریافت کیے اور فتح کیے، ان کی مثال پہلے نہیں ملتی، بعد میں ملنے کا تو خیر کوئی سوال ہی نہیں۔ اور اٹھارویں صدی کی دہلی کا کوئی کیا حال لکھے۔ ہم لوگ چند شہر آشوبوں، چند ہجوؤں، تعصب اور کینہ پر بنی چند انسانوں کو تاریخ قرار دے کر اٹھارویں صدی کی دہلی کو زوال، انتشار، بدامنی، طوائف الملوکی، امیروں کی مفلسی اور غریبوں کی فاقہ کشی کا شہر سمجھتے ہیں۔

(فاروقی، 2003: 24)

اٹھارویں صدی ہند اسلامی تہذیب کا ایک شاندار دور تھا، جہاں اردو، فارسی ادب، تصوف، اور علوم عقلیہ و نقلیہ کو عروج حاصل ہوا۔ دہلی اس وقت علم و فنون، موسیقی اور ادبی تخلقات کا مرکز تھی، جہاں میر، سودا، مصحفی اور غالب جیسے شعرا نے اردو زبان کو بے مثال وسعت دی۔ غزل اور داستان جیسی اصناف نے زبان کی جمالیات کو مزید سنوارا۔

انگریزی زبان اور نو آبادیاتی نظام کی وجہ سے اردو کے کئی الفاظ کے ساتھ ساتھ روایتی تحریری انداز بھی متروک و معدوم ہوگئے اور فارسی و عربی کی جگہ انگریزی اثرات نمایاں ہونے لگے۔ تہذیب کی روایتی روحانیت اور سادگی کو مادیت اور صنعتی ترقی نے دبا دیا، جبکہ داستان اور غزل جیسی اصناف کی جگہ ناول اور نظم نے لینا شروع کیا۔ دہلی، جو کبھی تہذیبی اور ثقافتی عروج کا مرکز تھی، نو آبادیاتی تبدیلیوں کے باعث بدامنی، غربت، اور عدم مساوات کا شکار ہوگئی۔ تاہم، اس دور میں شعرا اور ادبا نے اپنی تخلیقات میں ان تبدیلیوں کو محفوظ کیا، جو آج بھی تہذیبی شناخت کا حصہ ہیں۔ نو آدیاتی دلی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے تعلق

سے غالب افسانہ کے بینی مادھو رسوا کے مشاہدات کی ایک مثال کے طور پر نیچے کے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

چار مہینے میں نے ان مجلدات کو حرز جاں کی طرح سینت کر رکھا۔ نومبر 1862 کے آخری دن تھے جب میں بہل ڈاک قنوج، فرخ آباد، بیاور، کول، بلند شہر، غازی آباد، شاہدرہ، دلہائی ہوتا ہوا بیس دن کی مسافت کے ہرج مرج جھیلتا، غم والم اٹھاتا، دلی پہنچا۔ میں باڑہ ہندوراؤ کی ایک سرا میں اترا۔ معلوم ہوا کہ بلی ماروں کا علاقہ یہاں سے کچھ بہت دور نہیں۔ آہنی سڑک ابھی کانپور کے پاس سے بھی نہ گزری تھی، گو کہ اس کے آنے کے غلغلے تھے۔ میں نے بھی اب تک ریل کی سواری کی نہ تھی، اور نہ اس کا ارادہ تھا۔ لیکن دہلی کی ریل منزل میری سرائے کے پاس ہی تھی۔ وہاں کی چہل پہل، لوگوں کی دھکا پیل، دھواں دھکڑ، دُخان پھینکتے ہوئے آتشی انجنوں کا آنا جانا (اس لفظ سے میں کانپور میں آشنا ہوا)، مجھے یہ سب کچھ عجب وحشت انگیز، سا لگا۔''

(فاروقی 43:2003)

افسانہ، بحیثیت ایک تخلیقی نثر کی صورت میں، صرف واقعات اور حادثات کے بیان تک محدود نہیں ہوتا؛ اس میں زبان کی تخلیقی تشکیل بھی بہت ہی اہم ہوتی ہے (عالم 189L2005)۔ پس نوآبادیاتی منظرنامے میں، لسانی تخلیق کا کردار بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جب تک زبان میں تخلیقی جدت نہیں آتی، افسانہ ادب کی دنیا میں اپنے مقام کا دعویٰ نہیں کر سکتا، اور مصنف کو حقیقی تخلیقی نثر کے ایک فنکار کی حیثیت سے اعتبار حاصل نہیں ہو سکتا۔ ادب کے ناقدین اور تخلیقی نثر کے مصنفین کے درمیان فرق بنیادی طور پر نثر کے فن میں مہارت کا ہے۔ اس تناظر میں، شمس الرحمٰن فاروقی کے افسانے اپنے نثری انداز میں عمیق تبدیلیوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کی نثر اس دور کی تخلیق تو ہے جب اردو زبان میں فارسی و عربی کے اثرات کا انجذاب تھا۔ فاروقی کی نثر ایک ایسی روایت کا نیا عہد ہے، جو اردو زبان میں عربی و فارسی زبان کے اثرات کے ساتھ ہی اپنے مقامی اظہار کو اجاگر کرتا ہے۔ ابتدائی اردو محاورے اور ذخیرۂ لغات پر ان کا گہرا اور عمیق علم، جو اردو کی روایتی قصہ گوئی سے جڑا ہوا ہے، اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ وہ پرانی زبان کے ذخیرے کو نئے مفہوم کے ساتھ جوڑنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ فاروقی کے نزدیک، الفاظ صرف جامد نہیں ہوتے، بلکہ ان کو تازہ دم اور موجودہ و تاریخی اہمیت سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر، فاروقی کے ذریعے استعمال کیے گئے لفظ 'ادیب' (جو جدید اردو میں نوآبادیاتی اثرات کی وجہ سے 'مصنف' کے محدود معنی میں مستعمل ہے) پر گہرائی سے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان کس طرح بدلتی ہے۔ یہ لفظ، جو اصل میں 'استاذ' کے معنی میں استعمال ہوتا تھا، اب نوآبادیاتی اور ثقافتی تبدیلیوں کے اثرات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، اور اس سے پس نوآبادیاتی شناخت اور ثقافتی بازیابی کے موضوعات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اسی طرح، 'سلمہ اللہ تعالیٰ' جیسے الفاظ، جو پہلے بزرگوں کے لیے ایک احترام کا اظہار تھا۔ مزید برآں، فاروقی 'غم کھانا' جیسے محاورے کا استعمال اپنی نثر میں کرتے ہیں، جو قبل نوآبادیاتی زمانے میں 'انتظار کرنا' یا 'صبر کرنا' کے معنوں میں مستعمل تھا اب جدید استعمال میں یہ الفاظ اور محاورے بالکل مختلف معنوں کے ساتھ ہیں، پھر بھی ان میں ایسی لچک موجود ہے جو انھیں مختلف سیاق و سباق میں دوبارہ استعمال کرنے کی گنجائش فراہم کرتی ہے۔

فاروقی کی تنقید جس بلند پائے کی ہے اور ہم یہ بات بلا خوف و تردید کہہ سکتے ہیں کہ نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی فاروقی جیسا ذی علم، ہوش مند اور اعلیٰ درجے کا ادبی ناقد فی زمانہ کوئی نہیں ہے۔ لیکن یہ بڑے کمال کی بات ہے کہ ادبی تنقید میں اتنے بڑے کارنامے انجام دینے کے باوجود فاروقی کی تخلیقات بھی اسی اعلیٰ پیمانے کی ہیں کہ ان کا بھی کوئی ثانی اردو تو اردو دوسری زبانوں میں بھی مشکل ہی سے ملے گا۔

درج بالا مثالیں فاروقی کی اس صلاحیت کو ظاہر کرتی ہیں کہ وہ ماضی اور حال کے درمیان پل بناتے ہوئے پرانی نثر کو زندہ رکھتے ہیں اور زبان کو نوآبادیاتی اثرات اور ثقافتی مزاحمت کی روشنی میں نئے معنی فراہم کرتے ہیں، تاکہ موجودہ سماجی اور سیاسی حقیقتوں پر تنقید کی جا سکے۔ ایسے اظہاروں کو دوبارہ حاصل کر کے، فاروقی زبان کی سہل پسندی اور سادگی کو رد کرتے ہیں، اور اس کے بجائے ایک زیادہ پیچیدہ اور کسی قدر تہہ دار لسانی ورثے کو اپنانا پسند کرتے ہیں، جو نوآبادیاتی تاریخ اور پس نوآبادیاتی شناخت کی پیچیدگیوں کو اجاگر کرتا ہے۔ پس نوآبادیاتی نظریات کے تحت یہ سوال اٹھنا واجب ہے کہ جب سادگی اور بے ساختگی نے زبان پر حکمرانی حاصل کر لی ہے تو کلاسیکی اور زیادہ رسمی نثری اسلوب کا استعمال کیوں کیا جائے؟ لیکن شمس الرحمٰن فاروقی کے ذریعے قبل نوآبادیاتی دور کی کلاسیکی اردو نثر کو دوبارہ زندہ کرنا محض ماضی کی بازیافت کا عمل نہیں ہے، بلکہ یہ نوآبادیاتی ماضی کے ساتھ ایک شعوری تعامل اور تعلق کی استواری کا عمل ہے، جہاں زبان کو مزاحمت اور شناخت کی تعمیر کے ایک ٹول (tool) کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ فاروقی کی نثر یہ ثابت کرتی ہے کہ زبان ایک ثقافتی جدوجہد کا میدان بن سکتی ہے، جہاں نوآبادیاتی ورثہ اور مقامی مزاحمت کا آپس میں ٹکراؤ ہوتا ہے اور ماضی کے 'اعلیٰ' ادبی اشکال اور موجودہ زمانے کی بدلتی ہوئی زبان کے درمیان رابطے اور ترسیل کا عمل شروع ہوتا ہے (سعید 11:1202)۔

فاروقی کی مہارت صرف ان کی لفظیات کے استعمال تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کی نثری ساخت میں بھی عمیق تبدیلیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی کلاسیکی اور محاوراتی اردو کے درمیان توازن، فارسی اور عربی محاوروں کا استعمال، اور ان کے درمیان ایک پیچیدہ تعامل کو پس نوآبادیاتی حکمت عملی کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کا نثری اسلوب مختلف زمانوں کی ادبی زبانوں کے درمیان ایک رابطے کی صورت اختیار کرتا ہے، جو نوآبادیاتی ورثے اور مقامی ثقافتی مزاحمت کے درمیان تناؤ کو اجاگر کرتا ہے، اور ماضی کی 'معیاری' ادبی روایات اور موجودہ دور کی عوامی زبانوں کے درمیان جاری جدوجہد کو بیان کرتا ہے (ناصر عباس 2024: 111)۔

پس نوآبادیاتی نقطۂ نظر کے مطابق، یہ صرف ایک اسلوبیاتی انتخاب نہیں بلکہ یہ زبان کی ایک ایسی طاقت

کا اظہار ہے جو ثقافتی خودمختاری کے دعوے کے طور پر منتج ہے۔ فاروقی کی محتاط زبان کا استعمال، جیسے 'غم خانہ'، 'ادیب' اور 'سلمہ اللہ تعالیٰ'، ماضی اور حال کے درمیان ایک رابطے کو جنم دیتا ہے۔ یہ رابطہ زبان کی نوآبادیاتی مسلطیت سے آزادی اور اس کے موجودہ ہندوستانی سماج میں اہمیت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کے طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ اپنی نثر کے ذریعے یہ ثابت کرتے ہیں کہ زبان نہ صرف نوآبادیاتی تاریخ کا ایک ریکارڈ ہے، بلکہ یہ ایک متحرک قوت بھی ہے جو پس نوآبادیاتی جدیدیت کے عمل کو آگے بڑھاتی ہے۔

فاروقی کا پس نوآبادیاتی موقف ان کے اردو کے کلاسیکی ورثے سے گہرے تعلق اور اس کی جدید تشریحات کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ زبان میں پوشیدہ سیاسی طاقت کو سمجھتے ہیں اور اس کا استعمال ثقافتی تسلسل اور سماجی تنقید کے طور پر کرتے ہیں۔ ان کے افسانے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ زبان نوآبادیاتی تاریخ کا ایک ریکارڈ ہونے کے ساتھ ساتھ پس نوآبادیاتی تخیل کا ایک وسیلہ بھی ہوسکتی ہے۔ فاروقی کی نثر اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ زبان ایک ایسا میدان ہے جہاں نوآبادیاتی اثرات کے مابین جدوجہد اور شناخت کی تخلیق کی جاتی ہے۔

'سوار اور دوسرے افسانے' مجموعہ میں شامل افسانہ 'آفتاب زمیں' کا تجزیاتی محاکمہ کرتے ہوئے فاروقی کے استعمال شدہ لفظوں اور محاوروں کے تعلق سے خالد جاوید لکھتے ہیں:

اس مضمون میں بیانیے کی دوسری خوبیوں کا ذکر (جزوی طور سے ہوتا ہی آیا ہے) میں مختصراً کرنے پر ہی اکتفا کروں گا۔ مثال کے طور پر فاروقی کے بیانیے میں ذخیرہ الفاظ، روزمرہ اور محاورے کا استعمال اس دور کے تہذیبی، تاریخی اور یہاں تک کہ سیاسی صورت حال کی جیسی بھرپور انداز میں نمائندگی کرتے ہیں وہ صرف فاروقی کے ذریعے ہی ممکن ہوسکتا تھا۔ اس زبان نے بیانیہ کے آئینے کو کی طرح صاف وشفاف بنادیا ہے مگر میں اپنی پرانی بات پر پھر بھی قائم ہوں کہ آئینے اور آپ کے درمیان جو خلا ہے اور اس خلا میں جو دھند ہے اس دھند میں ہی وہ بصیرت پوشیدہ ہے جو اٹھارہویں صدی کی دہلی اور لکھنؤ کی پوری تہذیب کو ہمارے حواس و ادراک کے لیے قابل گرفت بناتی ہے۔ اسی دھند سے ہی مصحفی کی ایک شبیہ بننا شروع ہوتی ہے۔ 'آفتاب زمیں' اس کا ہی افسانہ ہے اور یہ اردو ادب میں پہلی بار ممکن ہوسکا ہے کہ ایسی سچی اور خالص شبیہ کہیں ابھرتی ہوئی نظر آتی ہو۔ خاص طور سے جب ہم زمان ومکاں کے ایک طویل فاصلے سے شبیہ کا نظارہ کررہے ہوں۔" (جاوید2008: 93)

ادب کے ناقدین اور تخلیقی نثر کے مصنّفین کے درمیان فرق بنیادی طور پر نثر کے فن میں مہارت کا ہے۔اس تناظر میں، شمس الرحمٰن فاروقی کے افسانے اپنے نثری انداز میں عمیق تبدیلیوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کی نثر اس دور کی تخلیق نو ہے جب اردو زبان میں فارسی و عربی کے اثرات کا انجذاب تھا۔ فاروقی کی نثر ایک ایسی روایت کا نیا عہد ہے، جو اردو زبان میں عربی و فارسی زبان کے اثرات کے ساتھ ہی اپنے مقامی اظہار کو اجاگر کرتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی افسانہ نگاری میں اردو زبان کے بیانیہ امکانات کو وسیع کیا اور اسے ایک خودمختار ادبی زبان کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کے افسانے گہری علامتوں، استعارات، اور کلاسیکی اسلوب کے ذریعے زبان کی طاقت کو ابھارتے ہیں اور ان کا اسلوب مغربی اثرات سے آزاد، لیکن جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہے، جس نے اردو ادب کو ایک نئی سمت دی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے افسانے اردو زبان کے جمالیاتی ورثے، کلاسیکی ادب، اور تاریخی شعور کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں داستانوی عناصر، زبان کی نفاست، اور ماضی کی ادبی روایات کی بازیافت شامل ہیں، جو نوآبادیاتی اثرات کو رد کرتے ہوئے اردو ادب کو اس کی اصل شناخت فراہم کرتی ہیں۔ ان کا زیر بحث افسانوی مجموعہ اس بات کی بہترین مثال ہے، جس میں انھوں نے قبل نوآبادیاتی زمانے کے تہذیبی اور ادبی ورثے کو نہایت باریکی سے پیش کیا ہے۔ ان افسانوں کا بیانیہ برصغیر کی تہذیبی عظمت کو نمایاں کرتا ہے اور نوآبادیاتی بیانیے کو چیلنج کرتا ہے جو مقامی ادبی وتہذیبی تاریخ کے ورثے کو اکثر کم تر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

حوالے اور ماخذ

- خالد جاوید: 2008، 'کہانی، موت اور آخری بدیسی زبان'، نئی دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
- احمد دین: 2023، 'سرگزشت الفاظ'، لاہور، عالمگیر پریس
- ایڈورڈ سعید، 2009، 'ثقافت اور سامراج'، مترجم یاسر جواد، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان
- ایڈورڈ سعید، 2012، 'شرق شناسی'، مترجم محمد عباس، دہلی، البلاغ پبلی کیشنز
- محمد منصور عالم، 2005، 'حریر و رنگ: شمس الرحمٰن فاروقی شاعر و افسانہ نگار'، نئی دہلی، رعنا کتاب گھر
- شمس الرحمٰن فاروقی، 2003، 'سوار اور دوسرے افسانے'، الہ آباد، شب خون کتاب گھر
- شمس الرحمٰن فاروقی، 2003، 'غالب افسانہ'، مشمولہ سوار اور دوسرے افسانے، الہ آباد، شب خون کتاب گھر
- شمس الرحمٰن فاروقی، 2003، 'سوار'، مشمولہ سوار اور دوسرے افسانے، الہ آباد، شب خون کتاب گھر
- شمس الرحمٰن فاروقی، 2003، 'ان صحبتوں میں آخر'، مشمولہ سوار اور دوسرے افسانے، الہ آباد، شب خون کتاب گھر
- شمس الرحمٰن فاروقی، 2003، 'آفتاب زمیں'، مشمولہ سوار اور دوسرے افسانے، الہ آباد، شب خون کتاب گھر
- شمس الرحمٰن فاروقی، 2003، 'لاہور کا ایک واقعہ'، مشمولہ سوار اور دوسرے افسانے، الہ آباد، شب خون کتاب گھر
- شمس الرحمٰن فاروقی، 2011، 'اردو کا ابتدائی زمانہ'، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
- شمس الرحمٰن فاروقی، 2020، 'قبض زماں'، نئی دہلی، عرشیہ پبلی کیشنز
- شمس الرحمٰن فاروقی،، 2022، 'تنقیدی افکار'، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
- گوپی چند نارنگ، 2004، 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات'، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
- ناصر عباس نیر، 2016، 'اردو ادب کی تشکیل جدید: نوآبادیاتی اور پس نوآبادیاتی عہد کے اردو مطالعات'، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس
- ناصر عباس نیر، 2024، 'مابعد نوآبادیات: اردو کے تناظر میں'، سنگ میل پبلی کیشنز

■

Iquebal Hussain
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob.: 9871648568
iquebalhussain1982@gmail.com

کھورٹھا میں لوک ادب

محمد طیب

لوک ادب کی افادیت بھی زبان وادب کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔ یہی وہ سرمایہ ہے جس سے زبان وادب کو پھلنے، پھولنے، سماج کی تہذیب وثقافت کی بقا، معاشرت، علمی وادبی میدان میں لسانی تہذیب کو فروغ دینے، تمام اصناف کو تقویت بخشنے، تقریر وتحریر میں معنویت اور وزن پیدا کرنے، اگلی نسل تک علمی ورثے کو سینہ بہ سینہ اور نسل دَر نسل پہنچانے کا موثر ذریعہ ہے۔ عوامی ادب خوشی ومسرت کا بھر پور اور تخلیقی سر چشمہ ہے۔اس میں کہاوتیں، پہیلیاں، حکایتیں، قصے، کہانیاں، فقرے، لطیفے، لوک کتھائیں، محاورے، ضرب الامثال وغیرہ شامل ہیں جن کا خالق کوئی فرد خاص نہیں بلکہ پورا معاشرہ ہوتا ہے۔ جس کے پیچھے صدیوں کا سفر، لوگوں کے تجربات، زمانے کے سرد وگرم کی کارفرمائی ہوتی ہیں اور یہ واقعیت اور اصلیت پر محیط ہوتا ہے۔ لوک ادب کو علمی میدان میں نمایاں کرنے والوں میں کچھ اہم شخصیات ہیں مثلاً اظہر علی فاروقی، قمر رئیس، دیوندر ستیارتھی، ٹیگور، قیصر جہاں اور بیگم بسم اللہ نیاز وغیرہ۔

کسی بھی علاقے کے ادب، لوک ادب کے جائزے کے تحت وہاں کی تہذیب و ثقافت، رسوم ورواج، عقائد وتوہمات کا ذکر کرنا وہاں کے 'لوک ادب' کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ جیسا کہ لکشمی نارائن وسنسار چند اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''لوک ادب میں اگر واقعیت اور اصلیت نہ ہوتی تو اس کی بیشتر قدر وقیمت گھٹ گئی ہوتی۔ دوسری تحریری سرگزشتوں کی طرح اس نے بھی تعصبانہ رجحان اپنا لیا ہوتا اور اس کی وہ اہمیت ضائع ہوجاتی جو انسان کے ارتقا کے تسلسل میں بشریات کے مدارج سے متعلق کارآمد سراغ دینے کی وجہ سے حاصل ہے۔ اس سے لسانی ماہروں کو انسانی بولی کا ابتدائی ماخذ معلوم کرنے میں مدد ملی ہے۔''

(ڈوگری لوک ادب اور پہاڑی آرٹ، لکشمی نارائن وسنسار چند، مرتبہ نیلامبر دیو شرما، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز، 1969، ص28)

ان باتوں سے 'لوک ادب' کے ذریعے علاقے اور عوامی بولی کے ماخذ تک پہنچنے میں کافی مدد ملتی ہے اور زبان کی ترقی یافتہ شکل کی سند مضبوط ہوتی ہے اور یہ سب چیزیں 'لوک ادب' کی تحقیق ومطالعے سے ممکن ہے۔ جھارکھنڈ کے وجود میں آنے کی ایک لمبی تاریخ ہے اور یہ مختلف تحریکوں سے وابستہ ہے جیسے برسامُنڈا تحریک، تانا بھگت تحریک، کول تحریک، جھارکھنڈ تحریک وغیرہ، پنچ پرگنیہ، کُرمالی، سنتھالی، مُنڈاری، کول، ہو، اس میں سے کھورٹھا زبان جو ہزاری باغ، دھنباد، سنگھ بھوم، گریڈیہہ اور سنتھال پرگنہ کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ کھورٹھا زبان آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

سنتھال قبیلہ یہ جھارکھنڈ کی سب سے بڑی آبادی والا قبیلہ ہے ان کی زبان سنتھالی ہے۔ جو آسٹرک ایشیائی خاندان سے ہے۔ اس کے رسم الخط کا نام اول چکی ہے جو 1941 میں رگھو ناتھ مُرمُو نے ایجاد کیا ہے۔ جس کے حروف تہجی 30 ہیں۔ سنتھال لڑکیاں بہت سے ایسے کاموں میں حصہ نہیں لے سکتی ہیں مثال کے طور پر شکار، پنچایت کی بیٹھک وغیرہ میں، اسی طرح ہل چلانے، چھپر چھانے پر پابندی ہے، شادی سے پہلے باپ کی دولت اور شادی کے بعد شوہر کی دولت سمجھی جاتی ہیں۔ سنتھال لڑکیاں گھونگھٹ نہیں ڈالتی ہیں۔

بیٹی کی پیدائش پر پانچویں دن، اور بیٹے کی پیدائش پر ساتویں دن چھٹی مناتے ہیں جس میں گاؤں کے مانجھی (ناؤ چلانے والا) ساتھ ہی دوسرے لوگ اپنے بال منڈواتے ہیں پھر بچے کے سر کا منڈن کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد بچے کے بال کو دونہ یعنی پتے کی کٹوری میں رکھتے ہیں پھر سارے لوگ نہاتے ہیں بچے کے بال کو گھاٹ میں بہا دیا جاتا ہے۔ نہانے کے بعد جب واپس آتے ہیں تو دائی چاول کو پانی میں گھول کر سبھوں پر باری باری چھڑکاؤ کرتی ہے جسے بدشگونی اور نحوست کو ختم ہونے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

جب دھان میں ہریالی آتی ہے تب ہڑیا تہوار مناتے ہیں تاکہ فصل اچھی ہو۔ ایک تہوار بندھا پرب ہے جو گھاٹ شیلہ میں لگتا ہے۔ یہ علاقہ شہر جمشید پور سے کچھ فاصلے پر ہے اس میلے میں آس پاس کے گاؤں سے بھی لوگ کافی تعداد میں آتے ہیں جس میں کانسہ، پیتل کے برتنوں کی دکانیں لگتی ہیں اور کافی خریداری ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کی تفریح کے لیے، کھیل کود کے لیے

مختلف چیزیں ہوتی ہیں اور آج کل تو اس میں ایک دلچسپ اور تفریح کا سامان یہ ہے کہ چھوٹی سی جگہ میں پانی جمع کر کے تالاب بناتے ہیں اور واٹر وین (Watervan) چلاتے ہیں جو بچوں کے لیے خوشی کا سامان ہے۔ اسی تہوار کی طرف عبدالباری اپنی کتاب میں رقمطراز ہیں:

'' ایک معاشی تہوار بندھا پرب مشہور ہے جو دھالبھوم کے معروف مقام گھاٹ سِلہ میں میلہ کی حیثیت سے لگتا ہے۔ جس میں ہر قسم کے کانسہ، پیتل کے برتنوں کی دکانیں لگاتے ہیں اور تمام لوگ اپنی ضرورت کے مطابق ان کی خریداری کرتے ہیں۔''

(آدیباسی تہذیب وثقافت، عبدالباری، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔25، نومبر 2017، ص45)

اراؤں قبیلہ کے لوگ پورے جھارکھنڈ میں دوسرے نمبر پر ہیں ساؤتھ چھوٹا ناگپور میں سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ جھارکھنڈ کی تمام ذاتوں میں یہ سب سے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں لہٰذا ترقی یافتہ ہونا تو لازم ہے۔ اراؤں لوگ خود کو کُرُک کہتے ہیں۔ اور کُرُک کے معنی انسان کے ہیں۔ ان کے رسم الخط کا نام تولون سِکی ہے جس کے موجد ڈاکٹر نارائن ہیں جو جھارکھنڈ کے ضلع گُملا سے ہیں۔ کُرُک کو جھارکھنڈ میں ریاستی زبان کا درجہ 2003 میں دیا گیا اور پچھم بنگال میں ریاستی زبان کا درجہ 2018 میں دیا گیا۔ شری نرمدیشور کے مطابق اُراؤں کا قدیم وطن کونکن تھا وہیں سے یہ لوگ منتقل ہو کر شاہ آباد ضلع میں آئے۔

یہ لوگ خاندان میں شادی نہیں کرتے ہیں کیونکہ ان کا ماننا ہے کہ اس سے مصیبتیں آتی ہیں، ان کے یہاں نزدیکی رشتے داروں میں شادی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دھرم کا دیوتا انھیں مختلف بیماریوں میں مبتلا کر دے گا اس سے اندھا یا کوڑھ یا کسی مہلک مرض کی بیماری لگ سکتی ہے۔

آدی واسی یہ دو لفظ سے مل کر بنا ہے آدی جس کے معنی اصل اور واسی جس کے معنی باشندہ، آدیواسی اس میں مزید چھوٹے بڑے گروہ ہیں (مینن) یہ سب سے بڑے اور اہم لوگ مانے جاتے ہیں اور یہ جھارکھنڈ کے علاوہ دیگر علاقوں میں بھی رہتے ہیں جیسے جے پور، سوائی مادھو پور۔ 2000 کی مردم شماری کے اندازے کے مطابق جھارکھنڈ میں 7087068 آبادی ہیں۔ ان لوگوں میں مچھلی، شراب، گوشت اور شراب نوشی کا کافی استعمال ہے۔ مختلف اناج کو برتن میں لے کر مہوا کے درخت کے نیچے رکھتے ہیں جہاں پر ٹھاکر دیوتا کی مورتی ہوتی ہے۔ ٹھاکر دیوتا کو گاؤں کا محافظ سمجھا جاتا ہے اور لوگ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس برتن سے کچھ دانے لے کر کھیتوں کے درمیان بوتے ہیں اور ٹھاکر دیوتا سے اچھی فصل کے پکنے سے پہلے ایک امید لے کر مناتے ہیں۔

> ”
>
> جھارکھنڈ کے وجود میں آنے کی ایک لمبی تاریخ ہے اور یہ مختلف تحریکوں سے وابستہ ہے جیسے برسا مُنڈا تحریک، تانا بھگت تحریک، کول تحریک، جھارکھنڈ تحریک وغیرہ، پنج پرگنیہ، کُرمالی، سنتھالی، مُنڈاری، کول، ہو، اس میں سے کھورٹھا زبان جو ہزاری باغ، دھنباد، سنگھ بھوم، گریڈیہہ اور سنتھال پرگنہ کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ کھورٹھا زبان آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔
>
> “

بھیل آدیواسی: لفظ بھیل کا ماخذ دراوڑ زبان کے بیل لفظ سے ہوا ہے جس کا معنی 'کمان' ہے اور یہ لوگ تیر کمان کے ذریعے شکار کرتے تھے اور یہی شکار ان کے گزر بسر کرنے کا اسباب معاش تھا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ کسب معاش کے لیے کھیتی باڑی کو اپنایا اور اب کاشتکاری بھی ان کی معیشت بن گئی ہے۔ یہ ایک گروہ ہے جو بچے کی پیدائش کے تیسرے دن صبح اٹھ کر نہا دھو کر پھر وہ گھر کے صدر دروازے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اس کے بعد اس کی نظر جس چیز پر پڑتی ہے۔ اسی کے مطابق بچے کا نام رکھتے ہے غرض کہ آدیواسی بھیل ذات میں ماں اپنے بچے کا نام رکھتی ہے اور وہ اپنے ہاتھ میں یا جسم کے کسی حصے میں مختلف نشان بنواتے ہیں جو ان کا بہترین کلچر ہے۔ آدیواسی کے اس کلچر کا ذکر ڈاکٹر یاسمین صدیقی اپنے ہندی مضمون میں لکھتی ہیں:

'' یہ لوگ پہلے شکار کر کے جیون یاپن کرتے تھے، اب کھیتی کے دُوارا دھن کماتے ہیں
بھیل آدیواسیوں میں گودنے، گودوانے کی پرتھا ہے تتھا طرح طرح کے گودنے گودوائے جاتے ہیں۔'' (ڈاکٹر یاسمین صدیقی، کوٹا یونیورسٹی، 2016، ص9)

یہ جھارکھنڈ کی تیسری بڑی آبادی ہے یہ اپنے قبیلے کو ہوڑوکو اور خود کو ہوڑو کہتے ہیں۔ ان کی زبان منڈاری ہے ان کی زبان کو ہوڑو جگر بولتے ہیں مطلب آدمی کی بولی۔ یہ سارے ایک ہی قبائل کولرین سے ہیں۔ یہ بہت دلیر ہوتے ہیں۔ ان کے رسم الخط کو بانی ایز یریا بانی ایشیر کہتے ہیں اور اس کا موجد رُوئی دھاس ناگ تھا۔ منڈا لوگ جو جھارکھنڈ کے چھوٹا ناگپور کے علاقے میں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہار، اُڑیسہ، چھتیس گڑھ اور مغربی بنگال میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تری پورہ میں انھیں مورا اور مدھیہ پردیس میں موواس کہا جاتا ہے۔ جب لڑکا پیدا ہوتا ہے تو ان کا ماننا ہے کہ کمانے والا پیدا ہوا ہے اور لڑکی کے بارے سوچتے ہیں کہ گھر سنبھالنے والی پیدا ہوئی ہے۔ شوہر کے بڑے بھائی اور ساس کی بڑی بہن کو دیوتا مانتے ہیں ان کو چھونا منع ہے ان کا نام لینا منع ہے بلکہ ان کے سائے سے دور رہنا پڑتا ہے۔ اگر اس کے خلاف ہو جائے تو کفارے کے طور پر کھانا کھلانا پڑتا ہے، اس کو گڈکوتروم بولا جاتا ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی نال کو تیر سے اور بچی ہو تو بلیڈ سے کاٹ کر دروازے کے سامنے چھت کے نیچے دفن کرتے ہیں۔

'کہاوت' فرہنگ آصفیہ جلد سوم میں یہ تعریف دی گئی ہے، قول، بچن، ضرب المثل، ٹوکا، وہ بات جو نظیراً بار بار زبان پر آئے۔ کہاوتیں لوک ادب کی ایک اہم ترین کڑی اور زبان کے لیے ایک زرخیز حصہ ہے۔ زبان وبیان میں حسن اور شائستگی پیدا کرتی ہیں۔ سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا کام کرتی ہیں، سمجھنے اور سمجھانے کے لیے معاون ثابت ہوتی ہیں، اس سے بات میں وزن پیدا ہوتا ہے اور معنویت پیدا ہوتی ہے۔ یہ معاشرے کی پیداوار ہوتی ہیں مختلف حالات، مشاہدات اور تجربات کے بعد کہاوتیں بنتی ہیں پھر زبان زدِ عام وخاص ہو کر زبان دَر زبان، نسل دَر نسل اور سینہ

بہ سینہ منتقل ہوتے ہوئے صدیوں کا سفر طے کرتی ہیں۔ محققین، ماہر لسانیات، آثار قدیمہ، پتھروں، تختوں پر کندہ تحریروں، فقیروں، سادھو سنتوں، اکابرین کے اقوال اور مذہبی کتب سے کہاوت کے ابتدائی دور کی تاریخ سامنے آتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر یونس اگاسکر رقمطراز ہیں:

''مغربی عالموں نے بھی کہاوتوں کے قدیم ترین نمونوں کو ان کے ابتدائی نقوش سمجھ کر ان سے جدید دور کی کہاوتوں کا سلسلہ جوڑا ہے اور کہاوتوں سے متعلق مختلف قسم کے نتائج اخذ کیے ہیں۔ چنانچہ دنیا کی ابتدائی کہاوتوں کے طور پر قدیم تہذیبوں مثلاً بابل اور نینوا میں دستیاب شدہ تختیوں اور مصر کے پیپرس پر موجود احکامات واقوال کو تحقیق کا موضوع بنایا گیا اور ان کے بعد قدیم ترین مقدس کتب، ملفوظات، حکایات واحوال میں محفوظ اقوال وامثال کی قدامت پر صاد کیا گیا۔''

(اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی ولسانی پہلو، ڈاکٹر یونس اگاسکر، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 1988، ص 88)

کھورٹھا کے بارے میں ماہرین کا اختلاف ہے کہ یہ بولی کس زبان سے نکلی ہے۔ اس کا اصل وجود کیا ہے لیکن مختلف آرا کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ کھورٹھا ایک مشترکہ زبان ہے کیوں کہ جھارکھنڈ میں صدیوں سے آدیواسی اور سدانی یعنی غیر آدیواسی رہتے چلے آرہے ہیں۔ ان کے آپسی میل جول اور سماجی ضرورت کے تحت یہ بولی وجود میں آئی جس میں ہندی، بنگلہ، مگہی کی ملاوٹ ہے اور یہ ایک آپسی تعلقات اور رابطہ کی بولی ہے جیسا کہ ہر زبان اور بولی کا ایک مزاج ہوتا ہے جہاں مختلف زبان کے لوگ رہتے ہیں تو وہاں سماجی ضرورت سے از خود کوئی اور زبان وجود میں آتی ہے۔ یہ آریائی خاندان سے ہے اور رام گڑھ، کوڈرما، دیوگھر، صاحب گنج، دُمکا، لاتے ہار، پلامو، ہزاری باغ، دھنباد، سنگھ بھوم، گریڈیہہ، چترا اور سنتھال پرگنہ علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ یہ ایک عام بولی ہی نہیں بلکہ ریاستی سطح پر ہونے والے امتحانات (جے ایس ایس سی) جھارکھنڈ اسٹاف سلکشن (جے ٹیٹ) جھاکھنڈ ایلی جیبل ٹیسٹ میں شامل کیا گیا لیکن زبان کے طور پر ابھی اعلان نہیں کیا گیا۔ جھارکھنڈ میں مختلف زبانوں کی تصدیق کی گئی ہے۔ 2011 ایکٹ کے تحت جن دفتری زبانوں کو شامل کیا گیا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں۔ ہندی، اردو، بنگالی، سنتھالی، کھریا، کرمالی، کھورٹھا اور ناگپوری۔ جغرافیائی

ڈاکٹر اجیت کمار جھا کے نزدیک کھورٹھا کا وجود آدیواسی بھاشا سے ہے کیونکہ اس میں آدیواسی کے الفاظ کافی ملتے ہیں اور یہاں صدیوں سے سدان اور آدیواسی رہتے ہیں۔ جس سے ان کے آپسی تعلقات سے ان کاوجود ہواہے۔جارج ابراہم گریسن کے مطابق کھورٹھا مگھی بھاشا کا بگڑاہوا روپ ہے۔

اعتبار سے کھورٹھا دامودر ندی سے پارسناتھ کے آس پاس تک کا علاقہ جو 34/ ہزار کلو میٹر سے زائد پھیلے ہوئے خطے میں یہ بولی استعمال کی جاتی ہے۔

جھارکھنڈ کی قبائلی بولیوں، تہذیبوں کی بقا اور فروغ کے لیے 1980 میں رانچی یونیورسٹی میں ایک شعبہ قائم کیا گیا جس میں ہُو، کھریا، کھورٹھا، کرمالی، کُرخ، مُنڈاری، ناگپوری، پنچ پرگنیہ، سنتھالی کو شامل کیا گیا اور رانچی یونیورسٹی میں مذکورہ تمام زبانوں کے ماہرین موجود ہیں۔ زبان اور تہذیب وثقافت کے لیے سرگرم ہیں۔

کھورٹھا زبان کے جاننے والوں میں کچھ اہم شخصیات اور ان کے مشہور ومعروف کارنامے ہمارے سامنے موجود ہیں۔ شری نواس پانوری، چابھی کاٹھی۔ ڈھا، شکومار۔ چندو لال چوکیدار، مہندر پربھوت۔ بیچارہ ماسٹر، امتیاز غدر۔ یہ کچھ مشہور ناٹک ہیں۔ نجی کا کی، پی داس۔ کا ہے چھوڑل گاؤں، من پورن گوسوامی۔ سُرمنی، امتیاز غدر۔ یہ کچھ مشہور کہانیاں اور ان کے مصنفین ہیں اور بھی بڑے بڑے مصنفین ہیں جیسے سراج الدین انصاری، ڈاکٹر گجادھر پربھا کر مہتو، پیارے حسین اور ڈاکٹر بی این مہدار۔

ڈاکٹر اجیت کمار جھا کے نزدیک کھورٹھا کا وجود آدیواسی بھاشا سے ہے کیونکہ اس میں آدیواسی کے الفاظ کافی ملتے ہیں اور یہاں صدیوں سے سدان اور آدیواسی رہتے ہیں۔ جس سے ان کے آپسی تعلقات سے ان کا وجود ہوا ہے۔ جارج ابراہم گریسن کے مطابق کھورٹھا مگہی بھاشا کا بگڑا ہوا روپ ہے۔ ڈاکٹر اجیت کمار جھا کا کہنا ہے کہ بھارت کا پرانا رسم الخط کھروشٹی تھا اور کھورٹھا اُسی کھروشٹی سے بنا ہے مثال دی ہے کہ پہلے کھروشٹی بنا پھر کھورٹی بنا پھر کھوراٹھا بنا پھر کھورٹھا بنا۔ مطلب وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا گیا اور کھورٹھا کا وجود ہوا۔

ایک تاریخ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ ایران میں گدھا کی کھال پر جو رسم الخط لکھا گیا اسے کھار پوسٹ کہا گیا۔ سنسکرت میں اس کو کھار پرشٹی بولا گیا۔ کالنتر میں کھاروشٹی بنا پھر کھورٹھا بنا۔ آریائی زبان سے کھورٹھا کا وجود ہوا ہے۔ ڈاکٹر گجادر پربھا کر مہتو کا کہنا ہے کہ آریہ پریوار سے کھورٹھا کا وجود عمل میں آیا۔ کھروشٹی دائیں سے بائیں لکھی جاتی جب کہ کھورٹھا بائیں سے دائیں یعنی اس کا رسم الخط دیوناگری ہے اور اصل کھروشٹی کا چلن ختم ہوگیا اور اب بس کھورٹھا باقی رہ گئی۔ برج موہن پانڈے نلن ہندی سے کھورٹھا کا وجود مانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ہندی کا بگڑا ہوا ایک نقش ہے۔

ایک ناٹک ہے جس کا مرکزی کردار شنبھو اور کالورام ہے۔ یہ ناٹک سماج میں رشوت خوری کا دھندا اور اس سے سماج کو کس طرح سے ایک تعلیم یافتہ نوجوان بچاتا ہے اس پر مبنی ہے۔ اور جھارکھنڈ کے دھنباد علاقے کے ایک گاؤں کا شنبھو خوددار، غریب اور تعلیم یافتہ نوجوان ہے جو گاؤں کے بچوں کی تعلیمی، سیاسی، سماجی بیداری کو لے کر فکرمند رہتا تھا۔ اسکول میں کچھ وقت تک ملازمت کرنے کے بعد اپنے گاؤں واپس چلا آتا ہے۔ دراصل گاؤں میں ایک کالورام رہتا تھا جو کہ ایک زمانے میں باہر سے آیا تھا۔ گاؤں والوں نے کالو کی مدد کی اور وہ یہیں رہنے لگا۔ گاؤں والوں کے بیل، بکریوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ چراتا تھا تو گاؤں والے معاوضے کے طور پر دھان دیتے تھے۔ وہ اس کی ذخیرہ اندوزی کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اس سے سُود کا دھندا کرنے لگا۔ راشن کی دکان کھول لی۔ اب وہ چرواہا نہیں رہا مہاجن بن گیا اور کسانوں کی زمین بھی دبانے لگا، پیسے کے نشے میں غنڈے بھی پالنے لگا اور الیکشن میں اپنی طاقت کا استعمال کرکے جیت بھی گیا۔ گاؤں والے اس سے بہت پریشان تھے تو شنبھو اس کے چنگل سے سماج کو بچانے کے لیے لوگوں کی ذہن سازی کرتا ہے اور ساتھ ہی ذریعہ معاش کے لیے انتظام کرتا ہے اور لوگوں کے دُکھ مصیبت میں ساتھ دیتا ہے تو لوگ متحد ہوکر کالورام کے خلاف کھڑے ہوتے ہیں اور کالورام کا بیٹا بھی عاجز ہوکر اپنے باپ کے خلاف کھڑا ہوکر گاؤں والوں کا ساتھ دیتا ہے اس کے بعد کالو

رام سمجھ جاتا ہے کہ گاؤں والے متحد ہو چکے ہیں اور وہ اس کے خلاف سخت قدم اٹھا چکے ہیں اس کے بعد کالورام کاشی چلا جاتا ہے کیونکہ اب یہاں اس کی کوئی دھاندلی نہیں چلے گی۔ شنبھو اور گاؤں والوں کی ہمت وکوشش سے گاؤں کی حالت بہتر ہوگئی اور گاؤں والے ظلم و استحصال سے چھٹکارا پائے۔ یہ ناٹک اتنا مقبول ہوا کہ طبع ہونے سے پہلے ہی دھنباد کے کئی علاقوں میں اسٹیج پر کھیلا گیا اور لوگوں کے دلوں میں ایک جگہ بنا کر سماج کی برائیوں کا پردہ فاش کیا اور ظلم کے خلاف متحد ہوکر سچ اور صحیح کا ساتھ دینے کا پیغام دیا۔

کھورٹھا بولی کی خدمات پر جن ادیبوں کو اکھر اسمان سے نوازا گیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

بنارسی گوسوامی 2007، سکو مار 2009، شیام سندر مہتو 2010 ، آکاش چھوٹی 2012، ناگیشور مہتو 2013، پنچم مہتو 2013، مہندر ناتھ گوسوامی سدھاکر 2017، سراج الدین انصاری سراج 2017

کھورٹھا پر منعقد ثقافتی اور تاریخ اجلاس کو ہم یہاں دیکھ سکتے ہیں:

چتر کانفرنس 13/ اپریل 1985، منتظمین کھورٹھا ڈھا کی چھتر کمیٹی، کھورٹھا۔

بھٹوا کانفرنس 1989 اور 2000 منتظمین کھورٹھا ساہتیہ سنسکرتی پریشد، بوکارو۔

سنگاپور کانفرنس: 1989 منتظمین کھورٹھا ساہتیہ سنسکرتی پریشد، بوکارو۔

دامودر پارسناتھ ڈہر جاترا: 14/15 جنوری 1989،

دامودر سواتی جاترا: 4/5، مارچ 1994

کھورٹھا مانگی کرن کاریاشالہ 22 تا 24، اکتوبر، 2010 کھورٹھا ساہتیہ سنسکرتی اکاڈمی، رام گڑھ۔

کہاوت کو کھورٹھا میں وائن کہتے ہیں۔ یہاں کھورٹھا کی کچھ کہاوتوں کو پیش کیا جارہا ہے:

اپن گاویں کوکر راجا

لفظی معنی: اپن مطلب اپنا۔ گاویں گاؤں یا بستی کو کہتے ہیں۔ کوکر کتا کو بولتے ہیں اور بنگلہ میں بھی کتا کو کوکر بولتے ہیں۔

مفہوم: اپنے گاؤں میں یا کسی بھی جگہ جب کمزور انسان کو کچھ طاقتور لوگوں کی پشت پناہی ملتی ہے تو وہ خود کو طاقتور سمجھنے لگتا ہے۔ اس وقت یہ استعمال ہوتی ہے۔ اپن گاویں کوکر راجا۔

ہندی: اسی کو ہندی میں اس طرح ادا کرتے ہیں

چھیتر اوشیش پر ادھیکار ہونا۔

اردو: اس کہاوت کو اردو میں اس طرح بولتے ہیں ''اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے۔''

آگو ناتھ نہ پیچھو پگھا

لفظی معنی: آگو مطلب آگے، سامنے کے حصے کو بولتے ہیں۔ ناتھ، وہ رسی جو جانور کی ناک میں نکیل کے طور پر ڈالی جاتی ہے۔ پگھا رسی کو بولتے ہیں۔

مفہوم: ایسا بندہ جس پر کوئی ذمے داری نہ ہو سماجی اعتبار سے، معاشی اعتبار سے یا کسی بھی اعتبار سے ہو کسی طرح کی اس پر ذمے داری نہ ہو تو ایسے شخص کے لیے یہ کہاوت استعمال ہوتی ہے۔ آگو ناتھ نہ پیچھو پگھا۔

ناگپوری: اسی کو ناگپوری بولی میں ایسے بولتے ہیں ''نا آگے ناتھ نا پاچھے پگھا۔''

اٹا سٹا کہا بھار

مفہوم: بیکار کی بات نہ بولنا یہ کہاوت اس وقت استعمال ہوتی ہے جب کہیں کچھ بات چیت ہو رہی ہو اور اس جگہ کوئی شخص اس موقع محل سے ہٹ کر کچھ دوسری بات کرتا ہے تب یہ کہاوت بولی جاتی ہے۔

بنگالی: اسی کو بنگلہ میں اس طرح پیش کرتے ہیں

اِتا سیتا بولس نا

لفظی معنی: اتا مطلب یہ۔ اُتا مطلب وہ۔ بولس مطلب بولنا۔

پہیلیاں دماغی ورزش اور قوت حافظہ کو بڑھانے میں بہت ہی حصہ داری نبھاتی ہیں لوک ادب کی اہم شاخ ہیں اور ذہنی تفریح کا سامان بھی۔

پہیلی کو کھورٹھا میں بجھویل، بجھوَل کہا جاتا ہے اس کے اور بھی مختلف نام ہیں۔ جیسے ہی آنلی، فانکی البتہ آسان پہیلی کو 'ہی آنلی' اور مشکل پہیلی کو 'فانکی' سے موسوم کرتے ہیں۔

ایگو باندھ دُورنگ پانی

لفظی معنی: ایک تالاب میں دورنگ کا پانی مطلب انڈا۔

تشریح: انڈا جس کو تالاب سے تشبیہ دی گئی ہے۔ تالاب کی طرح چاروں طرف سے گھرا ہوا ہونے کی وجہ سے اور اس میں

دورنگ کا پانی ہوتا ہے ایک زردی سے لگا ہوتا ہے، جس سے پانی کا رنگ پیلا نظر آتا ہے اور دوسرا جو تھوڑا صاف پانی ہوتا ہے۔

ایگو بوڑھی بہانہی گھسر لے بہرائی

لفظی معنی: ایگو (ایک) بوڑھی (بڑھیا) بہانہی (صبح سویرے) گھسر لے (گھسلتے ہوئے) بہرائی (نکلی)

ترجمہ: ایک بڑھیا صبح سویرے گھسٹتے ہوئے نکلتی ہے مطلب گھر صاف کرنے والا کپڑا۔

تشریح: جس کپڑا سے گھر صاف کرتے ہیں اس کو بڑھیا سے تشبیہ دی گئی ہے اور صاف کرتے وقت کپڑے کو ادھر اُدھر کرتے ہیں۔ اس کو گھسٹنے سے تشبیہ دی گئی ہے اور اسی کو کہا گیا ہے کہ ایک بوڑھی عورت صبح سویرے گھسٹتے ہوئے نکلتی ہے۔

ایگو بوڑھی گوٹے گانت پھُسڑی

لفظی معنی: گوٹے (پورا) گانت (جسم) پھُسڑی (پھُنسی، دانہ)

ترجمہ: ایک بڑھیا جس کے پورے بدن پر پھُنسی بھری ہوئی ہے۔ مطلب کٹھل ہے۔

تشریح: کٹھل کو بوڑھی اور اس کے اوپر جو کانٹے ہوتے ہیں اس کو پھنسی، دانہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔

کھائتے رسگر اُگلتے کپاس

لفظی معنی: کھائتے (کھاتے ہوئے) رَسگر (رَس بھرا ہوا) اُگالتے (اُگلے، باہر نکالے) کپاس (ایک پودہ جس کے پھل سے روئی نکلتی ہے، بغیر صاف کی ہوئی روئی)

ترجمہ: رَس کھا کر کپاس اگلتے ہیں مطلب گنّا۔

تشریح: گنّا رسیلا ہوتا ہے ہم اس کو چوستے ہیں اور جب باہر نکالتے ہیں تو کپاس کی طرح ہو جاتا ہے۔ روئی کی شکل معلوم ہوتی ہے۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کھورٹھا زبان جھارکھنڈ کی مشترکہ اور عوامی بولی ہے۔ علاقائی زبانوں میں مستعمل کہاوتیں اور پہیلیاں جن سے ہم (بالخصوص اردو دان طبقہ) لاعلم ہیں ان کو منظر عام پر لانے کی کوشش ہونی چاہیے اور یہ ہماری تہذیب وثقافت کا اہم جز بھی ہے۔

■

Mohd Taiyib
Research Scholar
Center for Urdu Cultural Studies
Room No: 7, Boys Hostel 04
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli
Hyderabad- 500032 (Telangana)
Mobile:9567246590
Email:taiyib333@gmail.com

بھگوت گیتا

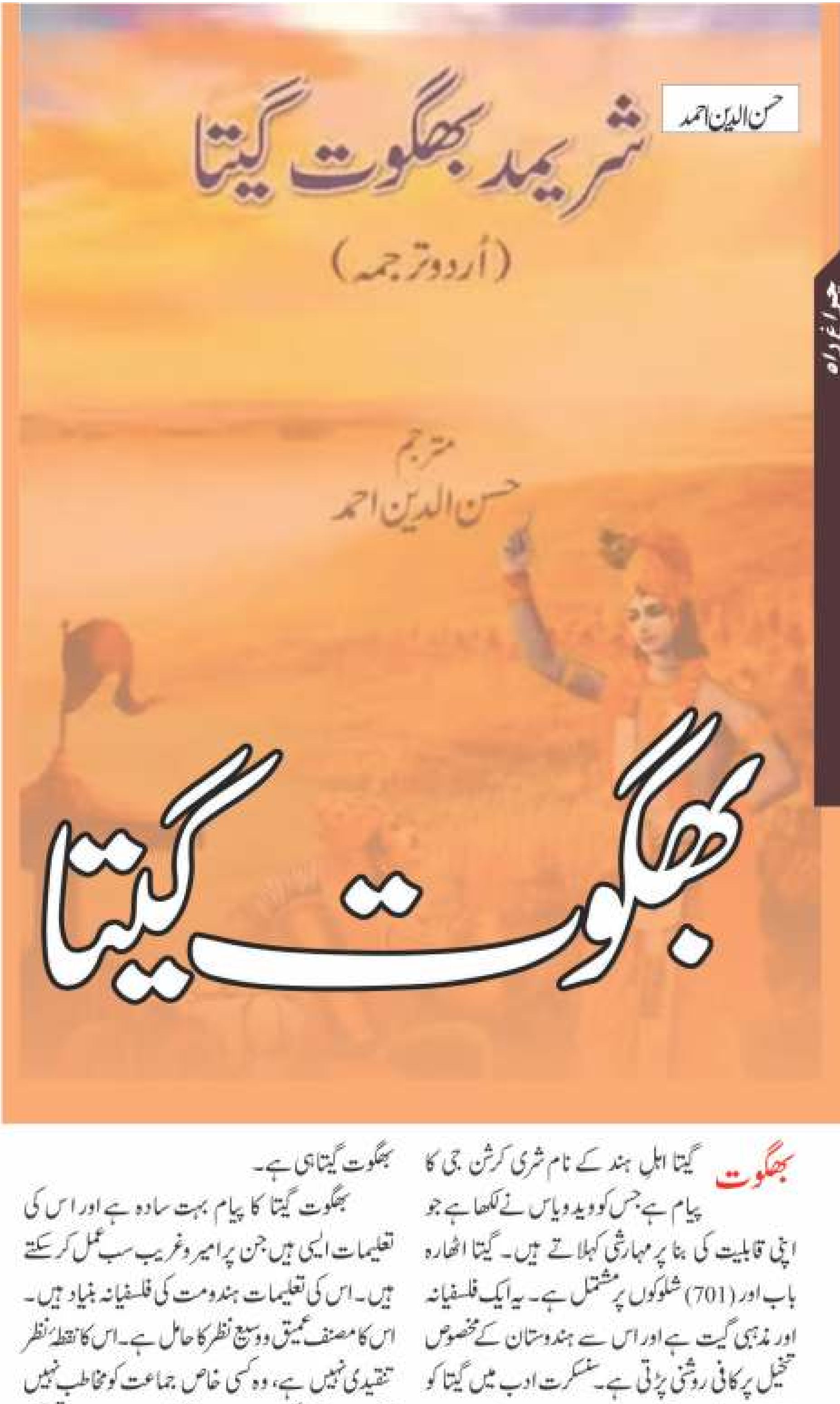

بھگوت گیتا کا پیام بہت سادہ ہے اور اس کی تعلیمات ایسی ہیں جن پر امیر و غریب سب عمل کرسکتے ہیں۔ اس کی تعلیمات ہندو مت کی فلسفیانہ بنیاد ہیں۔ اس کا مصنف عمیق و وسیع نظر کا حامل ہے۔ اس کا نقطۂ نظر تنقیدی نہیں ہے، وہ کسی خاص جماعت کو مخاطب نہیں کرتا اور نہ کوئی نیا دبستان قائم کرتا ہے۔ وہ ہر قسم کی عبادت کو تسلیم کرتا ہے اور کسی بھی طریقے کی مخالفت نہیں کرتا۔

بھگوت گیتا اہلِ ہند کے نام شری کرشن جی کا پیام ہے۔ جس کو وید ویاس نے لکھا ہے جو اپنی قابلیت کی بنا پر مہارشی کہلاتے ہیں۔ گیتا اٹھارہ باب اور (701) شلوکوں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک فلسفیانہ اور مذہبی گیت ہے اور اس سے ہندوستان کے مخصوص تخیل پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ سنسکرت ادب میں گیتا کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ہندوستان میں یہ سب سے زیادہ مشہور مذہبی نظم ہے۔ ہندوؤں کے تقریباً تمام فرقوں میں اس کو مقدس مانا جاتا ہے۔ لوگوں کے بے پناہ جذبۂ عقیدت میں ہزاروں سال کے بعد بھی کوئی کمی اس کتاب کے متعلق نہیں ہوئی۔ اس کے اعلیٰ فلسفیانہ خیالات کے پیشِ نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دنیا کی دوسری زبانوں میں اس کے مماثل بہت کم نظمیں موجود ہیں۔ اس کی حیثیت الہامی نہیں ہے بلکہ روایتی ہے۔ لیکن اگر ہندوستانی تخیل پر کسی چیز کا گہرا اثر پڑا ہے تو وہ بھگوت گیتا ہی ہے۔

بھگوت گیتا کا پیام بہت سادہ ہے اور اس کی تعلیمات ایسی ہیں جن پر امیر وغریب سب عمل کر سکتے ہیں۔ اس کی تعلیمات ہندو مت کی فلسفیانہ بنیاد ہیں۔ اس کا مصنف عمیق و وسیع نظر کا حامل ہے۔ اس کا نقطۂ نظر تنقیدی نہیں ہے، وہ کسی خاص جماعت کو مخاطب نہیں کرتا اور نہ کوئی نیا دبستان قائم کرتا ہے۔ وہ ہر قسم کی عبادت کو تسلیم کرتا ہے اور کسی بھی طریقے کی مخالفت نہیں کرتا۔

اس امر کا تعین بہت مشکل ہے کہ بھگوت گیتا کب لکھی گئی اس کے متعلق مختلف محققین کے مختلف نظریے ہیں۔ گو یہ مہا بھارت کا ایک جز ہے، لیکن بعض محققین کی رائے ہے کہ یہ بہت بعد کی تصنیف ہے اور اس میں مہا بھارت کے قصے کو پس منظر کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

بھگوت گیتا کی طرزِ تحریر، قافیہ پیمائی اور دیگر خصوصیات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لگ بھگ تیسری صدی قبل مسیح میں لکھی گئی تھی۔

اگر بھگوت گیتا سے ہندوؤں کی دوسری مذہبی کتابوں کا مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کا مصنف اس زمانے کے کم و بیش تمام مذہبی اور فلسفیانہ نظریوں سے متاثر ہوا ہے۔ بھگوت گیتا ویدوں کے احکام کی مخالفت نہیں کرتی بلکہ اس کی تعلیمات کے بموجب کوئی شخص ویدوں کے احکام کی پیروی کیے بغیر کمال حاصل ہی نہیں کرسکتا۔ البتہ وید کے خداؤں کی عظمت و بزرگی کو بھگوت گیتا تسلیم نہیں کرتی۔

بھگوت گیتا کا فلسفیانہ ماخذ اُپنشد ہے۔ بعض اشعار تو بھگوت گیتا اور اپنشد دونوں میں مشترک ہیں۔

بھگوت گیتا میں بدھ مت کا کوئی ذکر نہیں۔ لیکن بعض خیالات وہی ہیں جو بُدھ مت نے پیش کیے ہیں۔ دونوں ویدوں کی قطعیت سے انکار کرتے ہیں اور ذات پات کی سخت بندشوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ دونوں ان ہی مذہبی جذبات کے ترجمان ہیں جنھوں نے رسوماتی مذہب کا تختہ الٹ دیا۔ اس یکسانیت کے باوجود یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بدھ مت کے مقابلے میں بھگوت گیتا کا نقطۂ نظر قدامت پسندانہ ہے۔

بھگوت گیتا کی ایک اور خصوصیت کی طرف کم لوگ توجہ کرتے ہیں۔ اس نظم کی تمہید کچھ ایسی نزاکت سے باندھی گئی ہے کہ گو یہ شروع سے آخر تک کرشن جی اور ارجن کی گفتگو معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دراصل تمام نظم

ایک علمِ کشف کے جاننے والے (بنجے) کی زبانی ہے۔ جودھرت راشٹر کو میدان جنگ کے واقعات اپنی ہتھیلی میں دیکھ کر بتا رہا ہے۔ نظم لکھنے والا بیان کی صداقت اور عدم صداقت کا ذمے دار نہیں اور نہ کسی ایک لفظ کے لیے بھی قابلِ گرفت ہے۔

تعلیمات: عمل سے متعلق بھگوت گیتا کی تعلیمات خاص ہیں۔ اس کی یہ تعلیم نہیں کہ دنیا اور دنیوی کاروبار کو ترک کر دیا جائے اور نہ ہی دنیوی کاروبار اور خواہشات کو مستحسن قرار دیتی ہے۔ بظاہر یہ دو چیزیں متضاد نظر آتی ہیں۔ لیکن خود بھگوت گیتا نے اس مسئلے کو نہایت ہوشیاری سے حل کیا ہے۔ جب ہم کسی فعل کو انجام دیتے ہیں تو پہلے دماغ میں اس فعل کے کرنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے اور ساتھ ہی اس فعل کا نتیجہ بھی سامنے آجاتا ہے۔ دراصل اس نتیجے کو ہی سامنے رکھ کر انسان فعل کو، خواہ وہ محنت طلب اور بظاہر مشکل ہی کیوں نہ نظر آئے، انجام دیتا ہے۔ بھگوت گیتا کی یہ تعلیم ہے کہ انسان کو چاہیے کہ جسمانی طور پر تو کام کو انجام دے لیکن ذہن میں اس کے نتیجے یا اجر کو نہ لائے۔ بلکہ بالکل بے تعلق ہو کر کام کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ ایک معمولی انسان کا کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا غرضیکہ ذرا ذرا سی حرکت بھی کسی نہ کسی مفاد کے پیشِ نظر ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور واقعہ تو یہ ہے کہ رنج اور تکلیف کی جڑ یہی ہے۔ اس لیے بھگوت گیتا بے غرض کام کرنے اور خواہشات اور جذبات سے آزاد ہونے کی مختلف طریقوں سے تعلیم دیتی ہے اور بار بار اسی پر زور دیتی ہے۔

بھگوت گیتا کی ایک نمایاں تعلیم وجودِ باری کا تصور ہے۔ بھگوت گیتا کا تصور یہ ہے کہ خدا ہر چیز کے اندر موجود اور وہی ہر ایک کا مبدا و ملجا ہے۔ سب کچھ فنا ہونے کے لیے اس میں ضم ہوجاتا ہے اس لیے ہر انسان کی کوشش ہونی چاہیے کہ جلد خدا سے واصل ہونے کے ذرائع اختیار کرے۔ جو شخص خاص اصول اور معیار پر زندگی بسر کرتا ہے، خواہشات کو ترک کرتا اور نتیجے سے بے فکر رہتا ہے۔ وہ مرتے ہی خدا سے واصل ہوجاتا ہے اور موت وحیات کی کشمکش (تناسخ) میں گرفتار نہیں رہتا۔ اس کے برعکس جو شخص خواہشات کا غلام رہتا ہے وہ بار بار اس دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔ عمل کی معراج یہ ہے کہ انسان اپنی اعلیٰ ترین حقیقت کو پہچان کر واصل بہ حق ہوجائے۔ یعنی خودی کی تکمیل ہی عمل کی معراج ہے۔

بھگوت گیتا انسان کو خواہشات اور جذبات سے بالاتر، ہر حال میں یکساں اور غیر متاثر رہنے کی تعلیم دیتی ہے۔

تاریخی پس منظر: بھگوت گیتا، مہا بھارت کے لکھے جانے کے بہت زمانہ بعد وجود میں آئی لیکن جس وقت بھگوت گیتا لکھی گئی تو مہا بھارت ہی وہ واحد کتاب تھی جو پورے ہندوستان میں حد سے زیادہ مقبول تھی۔ اس طرح مہا بھارت کی اس شہرت سے

بھگوت گیتا کی ایک نمایاں تعلیم وجودِ باری کا تصور ہے۔ بھگوت گیتا کا تصور یہ ہے کہ خدا ہر چیز کے اندر موجود اور وہی ہر ایک کا مبدا و ملجا ہے۔ سب کچھ فنا ہونے کے لیے اس میں ضم ہوجاتا ہے اس لیے ہر انسان کی کوشش ہونی چاہیے کہ جلد خدا سے واصل ہونے کے ذرائع اختیار کرے۔

فائدہ اٹھانے اور بھگوت گیتا کو عوام تک پہنچانے کی غرض سے اس کا تاریخی پس منظر مہا بھارت سے لیا گیا ہے۔ ذیل میں مختصراً اس کی وضاحت کی گئی ہے تاکہ بھگوت گیتا کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

خاندانِ کورو کے بادشاہ شانتنو کو پہلی بیوی سے ایک بیٹا بھیشم اور دوسری بیوی سے دو بیٹے چترانگد اور وچتر ویریہ تھے۔ بھیشم نے عمر بھر مجرد رہنے کا عہد کیا تھا اور چترانگد کا شادی سے قبل ہی انتقال ہوگیا تھا۔ وچتر ویریہ کے دو بیٹے دھرت راشٹر اور پانڈو تھے جن میں سے اول الذکر پیدائشی نابینا تھا۔ وچتر ویریہ کے انتقال کے بعد دھرت راشٹر کو حکومت ملی۔ لیکن پانڈو نے تمام انتظامات سنبھالے۔ پانڈو کا انتقال دھرت راشٹر کی زندگی ہی میں ہوگیا اور اس نے پانچ بیٹے یودھشٹر، بھیم، ارجن، نکل اور سہد یو چھوڑے جن میں سے اول الذکر تین پانڈو کی پہلی بیوی کنتی سے تھے اور موخر الذکر دو بیٹے دوسری بیوی مادری سے تھے اور یہ دونوں توأم تھے۔ دھرت راشٹر کے سو بیٹے تھے جن میں سب سے بڑا دریودھن تھا۔ پانڈو کے انتقال کے بعد بھیشم نے شہزادوں کے سنِ بلوغ کو پہنچنے تک حکومت کے انتظامات کو سنبھالنے کا ذمہ لیا اور اس وقت تک درونا چاریہ کے ذریعے ان کی تعلیم کا معقول انتظام کیا گیا۔ جب شہزادے سنِ بلوغ کو پہنچے تو یہ سوال پیش ہوا کہ دریودھن اور یودھشٹر میں سے کس کو حکومت ملے۔ خاندان کے بزرگوں نے سلطنت کی تقسیم کا مشورہ دیا اور دھرت راشٹر نے بھی اس تجویز سے اتفاق کیا۔ لیکن دریودھن نے جو لالچی اور بدطینت تھا خفیہ منصوبہ بنایا اور قمار بازی کے ذریعے یودھشٹر سے سلطنت چھین لی اور یہ شرط پیش کی کہ پانڈو کے سب بیٹے بارہ سال تک جنگل میں جلاوطن رہیں اور اس کے بعد ایک سال تک گمنامی کی زندگی بسر کریں۔ ان شرائط کی تکمیل کے بعد پانڈو کے بیٹوں نے اپنے حصۂ حکومت کا مطالبہ کیا اور قتل و غارت گری اور خانہ جنگی سے بچنے کے لیے یودھشٹر نے اپنے گزارے کے لیے پانچ قصبات لینے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ لیکن دریودھن نے سوئی کی نوک کے برابر زمین دینے سے بھی انکار کیا اور جنگ ناگزیر ہوگئی۔ جب دونوں جانب کی فوجیں جنگ کے لیے ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں تو ارجن نے کرشن سے جو ان کے ماموں زاد بھائی اور بڑے دوست تھے اور اس جنگ میں ان کی رتھ بانی کا کام کر رہے تھے یہ خواہش کی کہ وہ دونوں فوجوں کے درمیان ان کے رتھ کو لے جائیں تاکہ وہ دونوں فوجوں کا معائنہ کرسکیں۔ دونوں جانب اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو دیکھ کر ارجن بہت متاثر ہوئے حتیٰ کہ جنگ سے باز رہنے کے خیالات بھی ان کے ذہن میں پیدا ہوئے تاکہ سلطنت کے حصول کی خواہش میں عزیزوں اور دوستوں کا خون بہانا نہ پڑے۔ اس موقع پر کرشن ان اقوال کے ذریعے ان کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ اپنے فرض کو پہچانیں اور اک تصفیہ کرنے کے بعد مختلف جذبات کے تحت اس کو نہ بدلیں۔

■

ماخذ: شریمد بھگوت گیتا، **مصنف:** وید ویاس، **مترجم:** حسن الدین احمد، **پانچویں طباعت:** 2021، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

نالاڈیار

غازی حمیداللہ خاں

تعارف

تامل ہندوستان کی ایک قدیم زبان ہے، ماہرینِ لسانیات اسے دنیا کی دوسری قدیم زبانوں مثلاً سنسکرت، یونانی، لاطینی، فارسی اور عربی کا ہم پلہ و ہم رتبہ قرار دیتے ہیں۔ تاریخی کتبات اور دوسرے شواہد بھی اس کی قدامت کو ثابت کرتے ہیں۔ آج بھی یہ زبان جنوبی ہندوستان کے وسیع علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ریاست تامل ناڈو میں اسے سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔

تامل زبان میں کئی کتابیں ایسی ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہزاروں سال پرانی ہیں، نالاڈیار کے متعلق بھی ایسا ہی دعویٰ ہے۔ پشپارتھ چیٹی کی شائع کردہ شرح میں اس بات کی خاص طور پر وضاحت کی گئی ہے۔

وہ قدیم تامل کتابیں جن کی ادبی حیثیت مسلم ہے، 36 ہیں اور انھیں دو حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ 'پت پاٹ' اور 'ایٹ تو گھئی' قدیم ترین 18 کتابوں پر مشتمل ہیں۔ ان کو 'میل کنک' کہتے ہیں، اسی طرح باقی 18 کتابوں کو مجموعی طور پر کیژ کنک کہتے ہیں اور یہ میل کنک سے کچھ بعد کی ہیں۔ نالاڈیار کو کیژ کنک میں شمار کیا جاتا ہے، تامل کی مشہور ترین کتاب کرل بھی 'کیژ کنک' کتابوں میں سے ایک ہے۔ ان تمام قدیم ادبی شاہکاروں کی فہرست جو مندرجہ ذیل ہیں، ایک تامل شلوک میں دی گئی ہیں:

نالاڈیار نان منی، نال ناپدو، این ونی، مپال (کرل)، کڈوکم، کووئی پڑموڑی، مامولم، کل وڑی، انا اتی یوئی، تنی مالئی، مدوموڑی کانچی اوز ایلادی۔

نالاڈیار کا نام اس میں ہے، اسی سے اس کی اہمیت ظاہر ہے۔ ایک تامل شلوک میں کرل اور نالاڈیار دونوں کو ہم پلہ قرار دیتے ہوئے ان کی عظمت کا اس طرح اعتراف کیا گیا ہے جس طرح بڑ اور نیم کے درختوں کی داتون سے دانتوں کو طاقت ملتی ہے۔ اسی طرح نالاڈیار اور کرل کے شلوکوں کا حوالہ دینے سے بات زیادہ قابل قبول ہو جاتی ہے۔"

یہ شلوک اس بات کا ثبوت ہیں کہ زمانۂ قدیم ہی سے نالاڈیار کے شلوکوں کو حوالے اور سند کے لائق سمجھا گیا ہے۔

نالاڈیار کے متعلق ایک نہایت ہی دلچسپ قصہ مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں مدورا کے شمال میں قحط پڑا تھا، لہٰذا وہاں کے باکمال آدمی مدورا آ کر بس گئے تھے۔ مقامی راجا کو ان کی عالمانہ صحبت اس قدر پسند آئی کہ جب کچھ عرصے بعد انھوں نے وطن جانے کا خیال ظاہر کیا تو اسے بہت رنج ہوا اور اس نے انھیں مدورا چھوڑنے کی اجازت نہ دی، لہٰذا وہ لوگ راجا کے ڈر سے رات کے اندھیرے میں مدورا سے بھاگ نکلے۔ جاتے وقت ان میں سے ہر ایک تاڑ کے پتوں پر ایک ایک شلوک لکھ کر چھوڑ گیا۔ اگلی صبح جب راجا کو ان کے چلے جانے علم ہوا تو اس نے وہ تمام تاڑ پتر منگوائے اور انھیں مقامی دریا ویگئی میں ڈال دینے کا حکم دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے 400 تاڑ پتر دریا کے دھارے کے بہاؤ کے خلاف بجائے نیچے کی طرف بہنے کے اوپر کی طرف بہنے لگے اور ایک جگہ کنارے سے لگ گئے۔ انھیں پھر راجا کے سامنے پیش کیا گیا۔ اسی مجموعے کو نالاڈیار کہتے ہیں۔ اس کہانی میں سچائی کس حد تک ہے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ ایک بات البتہ ظاہر ہے کہ یہ 1400 شلوک تامل ادب عالیہ میں اتنا بلند مقام رکھتے ہیں کہ زمانے کے تھپیڑوں نے بھی انھیں برباد نہ کیا اور اہلِ علم و دانش نے انھیں ہمیشہ یاد رکھا اور ان کا درس دیا۔ نالاڈیار کو 'ویلالرویدم' بھی کہتے ہیں یعنی 'مقامی آدمیوں کا وید'۔

پوپ (G.U. Pope) کا خیال ہے کہ نالاڈیار اور دیگر تامل ادبی شہ پارے آٹھویں صدی عیسوی اور بارہویں صدی عیسوی کے درمیان لکھے گئے ہوں گے، لیکن مشہور تامل محقق ڈاکٹر وردراجنار کا خیال ہے کہ نالاڈیار تیسری یا چوتھی صدی عیسوی میں ضبط تحریر میں آئی۔ کپوسوامی مدلیار کا خیال ہے کہ کرل اور نالاڈیار دونوں پہلی صدی عیسوی میں لکھی گئی ہوں گی کیونکہ یہ مدورا کے تیسرے سنگم کے ادبی دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ مدورا کا تیسرا سنگم پہلی صدی عیسوی کے اواخر اور دوسری صدی عیسوی کے شروع میں قائم تھا۔ بہرحال یہ بات ظاہر ہے کہ نالاڈیار ایک قدیم ادبی کارنامہ ہے اور صدیوں سے لوگ اسے سینے سے لگائے چلے آتے ہیں۔

نالاڈیار کو ایک مشہور تامل پدومنار نے ترتیب دیا اور اس کے شلوکوں کو کرل کی طرح مختلف سرخیوں کے

تامل زبان میں کئی کتابیں ایسی ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہزاروں سال پرانی ہیں، نالاڈیار کے متعلق بھی ایسا ہی دعویٰ ہے۔ پشپارتھ چیٹی کی شائع کردہ شرح میں اس بات کی خاص طور پر وضاحت کی گئی ہے۔

تحت یکجا کر کے سارے مجموعے کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ 'پدومنار' نے نالاڈیار کے مجموعے کے شروع میں خود اپنا ایک شلوک بھی شامل کیا ہے، جس میں مالک حقیقی کی حمد وثنا کی گئی ہے۔

نالاڈیا چار سو شلوکوں کا مجموعہ ہے۔ اسی لیے اسے تامل میں اکثر نالاڈی۔ نانور یا چار سو شلوک کہتے ہیں۔ تامل زبان میں 'نالاڈیار' لفظ کا مطلب یہی چار مصرعوں والا شلوک ہے۔ ظاہر ہے کہ قدیم زمانے میں شلوکوں کا اس سے بہتر مجموعہ تامل زبان میں نہیں تھا۔ یہ شلوک ایک گلدستہ ہے اور اس میں بہت سے شاعروں کا کلام شامل ہے جن کے نام تک کسی کو معلوم نہیں، لیکن عام خیال یہ ہے کہ یہ شلوک جین شعرا کے تصنیف کردہ ہیں۔ کپوسوامی مدلیار، ڈاکٹر درراجنار دونوں کا یہی خیال ہے۔ پوپ کی بھی یہی رائے ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ سب شلوک شاید جین شعرا کے نہ ہوں۔

ان شلوکوں میں جو مضامین نظم کیے گئے ہیں وہ سب اخلاقیات سے متعلق ہیں۔ اگرچہ کہیں کہیں ہجرو فراق کا ذکر بھی آ گیا ہے۔ ان میں انسانی جسم کی ناپائیداری، ترکِ علائق، گذشتہ اعمال کا پھل، صبر کی تلقین، انکساری، سخاوت، قرابت داروں کے ساتھ سلوک، استقلال اور دانشمندی اور دوسرے اخلاقی موضوعات کا بیان ملتا ہے۔ استعارے اور تشبیہات مقامی رنگ لیے ہوئے ہیں۔

یہ ترجمہ میں نے براہِ راست تامل سے کیا ہے۔ اس کتاب کی شرحیں بھی دیکھی ہیں اور جہاں کہیں شارحین میں اختلاف رائے نظر آیا تو ان پر خود غور کیا ہے۔ اس ترجمے کے سلسلے میں ای۔ را۔ سبرامنیم پلے مرحوم وی۔ ایس سپیا، ڈاکٹر وجے لکشمی اور ڈاکٹر چوپڑا نے میری بہت ہمت افزائی کی۔ محترمی حبیب الرحمٰن صدیقی مرحوم نے پہلے 26 شلوکوں کا ترجمہ دیکھا اور اس سلسلے میں مجھے مفید مشورے دیے۔ برادرم محمد مجاہد اللہ خاں نے بھی اس کام میں میری مدد کی ہے سب سے زیادہ مدد مجھے والد محترم سے ملی تھی۔ والد محترم محمد سعد اللہ خاں صاحب مرحوم نے ان شلوکوں کے ترجمے کو دیکھا اور ان پر نظر ثانی کی اور بہت سے مفید مشورے دیے۔ الفاظ، محاورات، تشبیہات اور استعارے، جملوں کی تراکیب، غرض ہر طرح والد مرحوم نے ان شلوکوں کے سلسلے میں میری رہبری کی۔ مجھے سب سے

نالاڈیا چار سو شلوکوں کا مجموعہ ہے۔ اسی لیے اسے تامل میں اکثر نالاڈی۔ نانور یا چار سو شلوک کہتے ہیں۔ تامل زبان میں 'نالاڈیار' لفظ کا مطلب یہی چار مصرعوں والا شلوک ہے۔ ظاہر ہے کہ قدیم زمانے میں شلوکوں کا اس سے بہتر مجموعہ تامل زبان میں نہیں تھا۔ یہ شلوک ایک گلدستہ ہے اور اس میں بہت سے شاعروں کا کلام شامل ہے جن کے نام تک کسی کو معلوم نہیں، لیکن عام خیال یہ ہے کہ یہ شلوک جین شعرا کے تصنیف کردہ ہیں۔

زیادہ افسوس اسی بات کا ہے کہ وہ اس کتاب کے شائع ہونے کی حسرت اپنے ساتھ لے گئے کیونکہ اگر انھوں نے ہر قدم پر میری ہمت افزائی نہ کی ہوتی تو یہ کام کبھی تکمیل کو نہ پہنچتا۔

ترجمہ ایک مشکل کام ہے اور یہ کام مشکل ترین اس وقت ہو جاتا ہے، جب کسی قدیم معیاری کتاب کا ترجمہ کیا جائے۔ تامل زبان سے اردو میں بہت کم کتابیں منتقل ہوئی ہیں۔ 'اردو سے تامل' یا 'تامل سے اردو' کوئی لغت تک نہیں ہے، اس لیے ہر قدم پر مشکلات اور پیچیدگیوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

بہر حال میری یہ محنت کہاں تک پذیرائی کے قابل ہے، اس کا فیصلہ تو قارئین ہی کر سکتے ہیں۔

نیکی کی طاقت

❖ 'جو اندر ہیں وہ رحمت کے سایے میں ہیں' یہ کہہ کے وہ سر اٹھا کر اوپر دیکھتے ہیں، مگر داخل نہیں ہو پاتے، ان کی جگہ دروازے کے باہر ہے جہاں وہ بڑے عذاب میں ہوں گے کیونکہ وہ پچھلے جنم میں ریاضت وعبادت نہیں کرتے تھے اور اس جنم میں بھی تپسیا نہیں کرتے۔

❖ اے دل نادان! یہ نہ کہہ کہ ہم دولت کی فراوانی کی ہوس کرکے خوش حال رہیں گے اور نیکیوں کو نظر انداز کرکے مر جائیں گے۔ ان تھک محنت اور مشقت کرنے کے بعد تو ضرور خوش حال ہو گا لیکن یہ تو بتا کہ خوش حالی کے دن گزر جانے پر تو کیا کرے گا؟

❖ جب اعمال کا پھل ملنے کا وقت آتا ہے تو کم عقل سرد آہیں بھرنے لگتا ہے اور اس کا دل ڈوبنے لگتا ہے، لیکن جو دانشمند اس مسئلے پر غور کرتے ہیں، وہ کشاکش حیات کی بندشوں سے نکل جائیں گے۔

❖ بڑی مشکل سے حاصل ہونے والے اس جسم کو نیکی کی توفیق جب بھی میسر ہو تو اسے خوب مضبوطی سے پکڑے رہو۔ گنے سے نکلے ہوئے رس کی طرح یہ نیکیاں بھی بعد میں بہت کام آئیں گی کیونکہ گنے کے چھلکے کی طرح یہ جسم بھی ایک دن پھینک دیا جائے گا۔

❖ رس نکالے ہوئے گنے کے چھلکوں کے ڈھیر میں آگ لگانے کا کسی کو افسوس نہ ہوگا، ایسے ہی جن لوگوں نے اپنی جدوجہد سے اس جسم کا پھل حاصل کر لیا ہے، موت کے آنے پر وہ بھی افسوس کرنے والوں میں سے نہ ہوں گے۔

❖ آج، کل، کس دن موت آئے گی؟ یہی سوچتے نہ رہو بلکہ یہی سوچتے رہو کہ موت تمہارے پیچھے ہی کھڑی ہے۔ برائیوں سے بچو اور ہر ممکن طریقے سے اسلاف کی بتائی ہوئی نیکیوں کو اختیار کرو۔

❖ اگر غور کرو تو انسان کے روپ میں پیدا ہونے کے بہت سے فائدے ہیں لیکن اس جسم کی آسائش کے کام ہی نہ کرتے رہو بلکہ ایسے کام بھی کرو جس سے عقبیٰ میں بھی نعمتیں حاصل ہوں۔

❖ بڑ کے درخت کا ایک چھوٹا سا بیج بڑھ کر ایک زبردست سایہ دار درخت بن جاتا ہے، اسی طرح نیکی خواہ کتنی ہی چھوٹی ہو اس کا پھل اگر معقول آدمیوں کے ہاتھ پڑ جائے تو سارے آسمان پر حاوی ہو سکتا ہے۔

❖ وہ روزانہ، دن گزرتے دیکھتے ہیں مگر غور نہیں کرتے بلکہ فرطِ خوشی سے کہتے ہیں کہ (یہ) دن، تو دن ڈوبے تک ہمارے ساتھ رہے گا۔ روزانہ اپنی زندگی کے دنوں میں ایک دن کی کمی ہوتی جا رہی ہے اس کا خیال نہیں کرتے۔

❖ عزت جیسے نادر جوہر کو قربان کرکے میں ایک فقیر کی سی ذلیل زندگی بسر کروں گا، اگر اس ذلت سے مجھے

اتنا کھانا ملے جو جسم کو اتنی طاقت فراہم کرے کہ وہ ایک زمانے تک برقرار رہے۔

انکساری

❖ جو ہماری عزت کرتے ہیں انھیں جانے دو، جو ہماری عزت نہیں کرتے انھیں بھی جانے دو۔ اگر ایک گندی مکھی سر پر آبیٹھے تو یہ بات معلوم ہونے پر بھی غصے سے احتراز کرنا ہی بہتر ہے۔

❖ جب ذلت ایسی گھر کر آئے کہ اس کے خلاف ایک قدم بھی نہ اٹھا سکیں تو جن لوگوں نے کسی کام کو انجام دینے کا تہیہ کرلیا ہے اور جو لازوال خوبیوں کے مالک ہیں کیا اپنی پیاری جان کو قربان کردیں گے کہ انھیں ہر جگہ برائی نظر آتی ہے۔

❖ اگر بلا سوچے سمجھے کوئی آدمی اپنا منھ کھول کر کچھ کہہ بیٹھے تو اس کے یہ الفاظ ہمیشہ اس کے دل میں کھٹکتے رہیں گے۔ جو لوگ گفتگو میں ہمیشہ احتیاط سے کام لیتے ہیں اور قدیم علوم میں بھی دسترس رکھتے ہیں، غصے سے مشتعل ہو کر بھی ایسے سخت الفاظ اپنے منھ سے کبھی نہیں نکالیں گے۔

❖ ذلیل آدمی، سامنے کھڑے ہو کر کوئی نازیبا بات بھی کہہ دے تو عالی ظرف اشتعال میں نہیں آتے لیکن کبھی کسی رذیل آدمی کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آجائے تو وہ ہمیشہ اسی کے متعلق سوچتا رہے گا اور اسی کا ذکر کرتا رہے گا۔

❖ نوجوانوں کا تحمل ہی اصل تحمل ہے۔ جن کے پاس دولت کے ذخیرے نہ ہوں ان کا دیا ہوا ہی اصل تحفہ ہے جس میں ہر شخص کو سزا دینے کی طاقت ہو، اس کا صبر کرلینا ہی دراصل صبر ہے۔

❖ رذیل آدمیوں کے منھ سے نکلے ہوئے سخت الفاظ ایسے ہوتے ہیں جیسے کسی نے پتھر پھینکے ہوں، لیکن شرفا انھیں سب کے سامنے برداشت کرلیتے ہیں اور ان کا خیال نہ کرتے ہوئے اپنی خاندانی شرافت کے سبب، ضبط عمل سے کام لیتے ہیں جیسے ناگ مقدس راکھ ڈالنے پر اپنا پھن زمین پر ڈال دیتا ہے۔

❖ اگر دشمن اپنی دشمنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے صف آرا ہوں اور چھیڑ چھاڑ شروع کریں تو بھی جنگ و جدل سے بچنا عاقلوں کے نزدیک کمزوری کی علامت نہیں ہے۔ اگر وہ مقابل آکر نقصان بھی پہنچائیں تو انھیں نقصان پہنچانے کے بجائے برداشت سے کام لینا ہی بہتر ہے۔

❖ رذیل آدمیوں کا غصہ، مدت تک برقرار رہتا ہے، وہ کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، لیکن نیک طینت اور اعلیٰ ظرف آدمیوں کا غصہ برتن میں کھولتے ہوئے پانی کی طرح جلد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

❖ اعلیٰ خاندان کے سپوت جن کے خاندان کی شہرت عالم بالا تک پہنچی ہو، احسان فراموش آدمیوں کے ساتھ بھی نیکی سے ہی پیش آتے ہیں۔ لوگوں کی احسان فراموشی کے باوجود ان سے سختی سے پیش نہیں آتے۔

❖ ایسے آدمی تو اس دنیا میں کہیں بھی نہ ملیں گے جو یہ دیکھ کر کہ ایک پاگل کتے نے انھیں کاٹ لیا ہے خود اپنے منھ سے اس پاگل کتے کو کاٹنے لگیں۔ اسی طرح جب ذلیل آدمی اپنے منھ سے نازیبا الفاظ نکالتے ہیں تو کیا عالی رتبہ آدمی، انتقاماً خود اپنے منھ سے ایسے ہی (نازیبا) الفاظ ادا کریں گے؟

صبر

❖ ایسے سرسبز و شاداب ملک کے والی جہاں بلند پہاڑوں کے دامن میں پھولوں کے ہاروں کے مانند آبشار ہیں— کم عقل سے کسی قسم کی بات نہ کرو کیونکہ کم عقل تم سے گفتگو کرنے کے بعد تمھاری باتوں کو توڑ مروڑ کر ان کا غلط مطلب نکالے گا۔ بہتر ہوگا کہ اس سے حتی المقدور دور رہو۔

❖ جو لوگ ہمارے ہم رتبہ نہ ہوں اگر وہ اپنی زبان سے نازیبا الفاظ نکالیں تو انھیں برداشت کرلینا ہی عین دانشمندی ہے۔ یہ دنیا، جس کے گرد سمندر کا پانی لہریں مار رہا ہے، اس کے علاوہ کسی اور طریقۂ کار کو قابل تعریف نہیں قرار دیتی بلکہ شرمناک تصور کرتی ہے۔

❖ ہمدرد دوستوں کے منہ سے نکلے ہوئے سخت الفاظ انجام و نتائج کے پیش نظر غیروں کے تصنع آمیز میٹھے بولوں سے بہتر ہوتے ہیں۔ اے مواج و ملیب سمندر کے سرد ساحل کے والی! جہاں بھونرے کوڑے کے خوشنما اور نوشگفتہ پھولوں کے گرد منڈلاتے ہوں۔

❖ جو کچھ کہ جاننا چاہیے وہ جاننے والے، اور اپنے علم سے متانت و سنجیدگی حاصل کرنے والے، جن چیزوں سے احتراز کرنا چاہیے، ان سے احتراز کرنے والے، جو لوگ حتی المقدور دنیا میں خوشی اور مسرت پھیلاتے ہیں، اور جن کی فطرت میں (تمام) بھلائیوں پر خوشی کا اظہار کرنا شامل ہے، تم انھیں شاذ و نادر ہی مصائب میں مبتلا پاؤ گے۔

❖ جب دو آدمی دوستی کے رشتے میں منسلک ہو جائیں کہ باہمی اختلافات نہ رہیں اور بعد میں کبھی ان دونوں میں سے کسی ایک شخص سے کوئی نازیبا حرکت سرزد ہو جائے تو دوسرے کو چاہیے کہ حتی الامکان اسے نظر انداز کرے اور جب برداشت نہ کرسکے تو بھی اس کی تشہیر نہ کرے بلکہ خود ایسی باتوں سے دور ہی رہے۔

❖ اگر وہ برائی بھی کریں تو اسے اچھائی ہی سمجھو خود کو ہی الزام دو اور غصہ سے بچو۔ جن کے ساتھ تم دوستی کے رشتے میں منسلک ہو ان کی دوستی کو ترک نہ کرو۔ اے کوہستانی ملک کے والی! جدائی جانوروں پر بھی شاق گزرتی ہے۔

❖ دنیا کے سب لوگ بڑے آدمیوں کے ساتھ گہری دوستی کے خواہش منداس لیے ہوتے ہیں کہ وہ دوسروں کی خامیوں کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ اے دلکش کوہستانی علاقے کے والی! جہاں اونچے پہاڑوں سے دھواں دھار آبشار گرتے ہیں۔ کیا نیک کام کرنے والوں کو بھی دوستوں کی کمی ہوئی ہے؟

❖ اگر تمھارا جسم بھوک کے مارے بہت کمزور ہو جائے تو بھی اپنی بھوک کا ذکر ان سے نہ کرو جو انسانی ہمدردی کی خوبیوں سے عاری ہوں لیکن جن لوگوں میں برداشت کی طاقت نہ ہو تو وہ اپنے افلاس کا ذکر ان لوگوں سے کرسکتے ہیں جو ان کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔

❖ جہاں گناہوں سے لذت حاصل ہو وہاں مصیبت بھی سر پر آسکتی ہے۔ اے لذت کی خواہش کرنے والے اگر لذت دیرپا بھی نظر آئے تو— اے اونچے آبشاروں والے ملک کے والی!— وہ ذہنی طرز عمل بہتر ہے جو گناہوں سے پاک ہو۔

❖ چاہے تمھیں خود نقصان اٹھانا پڑے مگر پھر بھی قابل آدمیوں کو نقصان پہنچانے کے لیے نہ سوچو۔ اگر تمھارا جسم کمزور ہو جائے تو بھی کسی نالائق کے ہاتھوں کا دیا ہوا نہ کھاؤ۔ اگر چاہے تمھیں وہ ساری زمین مل جائے جس پر آسمان چھایا ہوا ہے تو بھی سچ میں جھوٹ ملا کر کوئی بات نہ کہو۔

■

ماخذ: نالاڈیار (کلاسیکی تامل شلوکوں کا مجموعہ)، **مترجم:** غازی حمید اللہ خاں، **دوسرا ایڈیشن:** 2003، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

افتخار احمد

رامائن کا ایک مترجم
شنکر دیال فرحت لکھنوی

رامائن ایک مقدس کتاب ہے۔ قدیم ہندوستانی تہذیب و تمدن، ثقافت و مذہب کی شناخت اور اس سے جڑے ہوئے اہم سوالات کی ترسیل کا خوبصورت وسیلہ ہے۔ اس کتاب کی شہرت صرف ہندومت سے انسلاک کی وجہ سے نہیں بلکہ اسے کہانی یا کتھا کی صورت میں مختلف موقعوں پر سنایا جاتا ہے اور اس سے جڑی باتوں کو پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اس کتاب کی شہرت کی وجہ اس میں موجود مذہبی مواد کے علاوہ ادب اور فن بھی ہے۔ کسی نے اس کتاب کو بطور کہانی پیش کیا تو کسی نے رزمیہ نظموں کے خدو خال میں اسے جانچا اور پرکھا ہے۔ گیتا، اوپنیشد اور مہابھارت کی طرح سناتن دھرم میں رامائن کا پڑھنا، سننا اور سنانا نیز اس کا پاٹھ کرنا وغیرہ، روحانی ترقی کا ضامن اور شری رام جی سے بے پناہ دلی محبت کا پرتیک مانا جاتا ہے۔ بیشتر اہلِ ہنود کے گھروں میں رامائن موجود ہوتا ہے۔ یہ کتاب سنسکرت میں ہے لیکن اس کے تراجم ہندوستان کی بیشتر زبانوں میں دستیاب ہیں اور لوگ اپنی سہولت اور زبان دانی کے لحاظ سے اس کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ جس طرح تراجم میں فرق ہے ٹھیک اسی طرح اس کی بہت سی کہانیوں میں بھی واضح فرق دیکھا جاسکتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ مختلف ادوار میں کہانیوں کے بازگو حضرت یا نقل کرنے والوں نے کہانیوں کی صحت کا خیال نہیں رکھا۔ رامائن کے نسخوں کی ترتیب و تدوین کے وقت تحقیقی اصولوں کا خیال رکھا جانا چاہیے تھا۔ بالمیکی جی نے 30 ما قبل مسیح رامائن سنسکرت زبان میں لکھ دی تھی اس کے باوجود تلسی داس نے رام چندر جی کی حیات کو اپنے انداز میں قلمبند کیا ہے۔ تلسی اور بالمیکی کے علاوہ دیگر دانشوروں نے بھی اپنی اپنی زبانوں میں رامائن نظم کیا ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف اشخاص کے ذریعے منظوم یا منثور رامائن لکھے جانے کی وجہ سے کئی بنیادی اختلافات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

رامائن ہندوؤں کی اہم مقدس کتابوں میں ایک ہے۔ مسلمانوں نے ہمیشہ اپنی علم دوستی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ رامائن کا ترجمہ اس سلسلے کی بہترین کڑی ہے جن کی بدولت رامائن ترجمے کی شکل میں دنیا کے دیگر حصوں میں پہنچا۔ رامائن کے کئی تراجم فارسی زبان میں موجود ہیں۔ عبدالقادر بدایونی کو فارسی زبان کا پہلا رامائنی مترجم سمجھا جاتا ہے۔ منشی پرمیسوری سہائے سرور لالہ نے 1891 میں بعنوان وظیفۂ الفیضی منظوم ترجمہ کیا۔ مکمل ترین رامائن کا نثری ترجمہ امر سنگھ نے اورنگ زیب کے آخری عہد میں انجام دیا۔ اس کے علاوہ گوپال فرزند سری گوبند، چندر من کایتھ مدھو پوری، لالہ امانت رائے لاہوری، منشی رام داس، مکھن لال ظفر، منشی جگن کشور فیروز آبادی، منشی بانکے لال زار، ہر بلبھ سیتا، عشرت کرن، لالہ چندا مل چاند، منشی ہر لال رسو، رائے مہادیو دریا بادی، آنند کھن خوش، ترکی نور مجلی اور گوہر داس وغیرہ نے فارسی زبان میں رامائنی داستانوں کا منظوم ترجمہ کیا۔ ان میں سے بیشتر مصنفین کو مسلم بادشاہوں، نوابوں، اور زمینداروں کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس کے بعد کئی تراجم عالم وجود میں آئے ان میں کچھ ضائع ہوئے تو کچھ ناقص حالت میں ہی رہ گئے۔ فارسی تراجم میں مسیح پانی پتی کا ترجمہ بہتر مانا جاتا ہے جو زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ ہندوستان میں جب اردو زبان کو ترقی حاصل ہوئی تو اس زبان کے ادبا و شعرا نے بھی رامائن کے منثور و منظوم تراجم پیش کیے۔ ان مترجمین میں منشی دوارکا پرشاد کا 'رامائن یک قافیہ'، حکیم وانسرائے وہمی کا 'رامائن منظوم تلسی کرت'، پریم پال اشک کا 'رامائن منظوم'، نفیس خلیلی کا 'منظوم رامائن'، منشی گوری شنکر کا 'رامائن منظوم'، رائے سدھ ناتھ فراق کا 'بالمیکی رامائن منظوم'، جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی کا منظوم رامائن 'امر کہانی'، لالہ نانک چند صاحب کھتری کا 'رامائن بعنوان مطلع نور یعنی فروغ اودھ' اور شنکر دیال فرحت لکھنوی کا 'رامائن نظم اردو حرف حرف مطابق تلسی کرت' وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

منشی شنکر دیال فرحت لکھنوی کا تعلق کائستھ خاندان سے تھا جو 1844 میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی پورن کائستھ سکسینہ چند برسوں لکھنؤ کے نوابوں کے دربار سے وابستہ رہے اور فن شاعری کو مستفیض کرتے رہے اور انھیں جواہر سنگھ کی شاگردی حاصل تھی۔ ان کے آبا و اجداد قانون گو رہے تھے۔ بڑا پڑھا لکھا خاندان تھا۔ ان کے والد صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ نوابوں کے دربار میں کئی عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے تھے۔ منشی شنکر دیال فرحت کو اردو، فارسی، ہندی پر دسترس حاصل تھی اور انگریزی زبان کی خوب واقفیت تھی۔ وہ بڑے ہی ذہین و فطین واقع ہوئے تھے، شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ علم و ادب کے دلدادہ تھے یہی وجہ ہے کہ امریکن مشن لکھنؤ میں منصرمی کے عہدے پر فائز مطبع سنگی کے کام کاج دیکھا کرتے تھے۔ فرحت کے شاگردوں کی تعداد بہت ہے جن میں منشی رام سہائے تمنا اور منشی دوارکا پرشاد افق وغیرہ کو شہرت دوام حاصل ہے۔

فرحت نے تلسی کی لکھی ہوئی رامائن کا منظوم ترجمہ 1866 میں کیا جس کے حوالے سے آگے باتیں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے شیو پُران، پریم ساگر، جانکی بجے، گنیش پُران، گوری منگل، پدم پُران، اُو بھت رامائن، مکت چالیسا، وشنو سہسر وغیرہ جیسی مذہبی تصنیفات کا اردو ترجمہ بھکتی کی چاشنی میں ڈوب کر کیا جو ان کی شہرت اور بلند عظمت کے وسیلے ثابت ہوئے۔ ہندو مذہب کی ترویج و ترقی میں ان کی حصے داری تا قیامت قائم رہے گی۔ ان کتابوں کے تراجم کی مذہبی اہمیت اپنی جگہ لیکن اردو زبان و ادب کے شعری سرمایے میں ایک اضافہ ہے۔ انھوں نے ساری زندگی اردو ادب کی بے لوث خدمت کی اور اپنی فکری صلاحیت کو اشعار میں ڈھالا کیونکہ وہ ایک پرگو شاعر تھے۔ وہ خود ایک ہندو تھے لہٰذا، ان کے یہاں اس بات کی کوشش

کارفرما رہی کہ ترجمے کے قالب میں مذہب کی اصل روح کو منتقل کرسکیں۔ زبان کی لطافت اور شیرینی کمال کے درجے پر ہے۔ روانی و برجستگی شفاف پانی کے دھاروں کا روپ لیے کھڑی ہے۔ زبان میں فصاحت و بلاغت کا موج تلاطم ہے۔ ترجمے میں مشکل الفاظ کے استعمال سے اجتناب برتا ہے۔ پُر پیچ تراکیب سے نظریں چراتے ہیں۔ ادق اور بھاری بھرکم لفظیات سے دامن بچاتے ہیں۔ چونکہ انھوں نے زبان کو ادق اور بھاری بھرکم الفاظ وتراکیب سے آزاد رکھا ہے جس کی وجہ ہے کہ قاری ترجمے کی قرأت کے دوران اصل کی چاشنی میں گم، بلا اٹکے، کھٹکے پڑھتا چلا جاتا ہے۔ رامائن کے ترجمے کا آغاز بہت ہی خوبصورت ہے۔ شری گنیش اوم نمہ کا عنوان لگا کر رام چندر جی کی تعریف وتوصیف بیان کی ہے اور انھیں یوں منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

زباں پہ ہر نفس ہے رام کا نام
نمو رام و نمو رام و نمو رام

دوئی سے دور یکتا ہے وہی ذات
وجودِ جود و احسان و کرامات

وہی گم ہے وہی ہے آشکارا
وہی مردم کی عین آنکھوں کا تارا

کرے گر شُل صندل جبہ سائی
تو ہو اوس گُل میں بوئے آشنائی

کہاں انساں کہاں وہ ذات اقدس
وہ دریائے رواں یہ صورت خس

(ص2)

اس کے بعد اس نے اپنے اشعار میں رامائن کے تمام مصنفین کو یاد کیا ہے۔ پھر صحرا کا واقعہ نظم کیا ہے اور رام کا امتحانات سے گزرنے کا واقعہ ہے جو نہایت خوش اسلوبی سے نظم کیا گیا ہے۔ بالمیکی رامائن اور تلسی داس کی کتھاؤں میں فرق ہے لیکن مرکزی خیال ایک ہی ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ایودھیا کے راجہ دشرتھ کی پہلی بیوی رانی کوشلیا کے بطن سے رام کی پیدائش ہوئی تھی۔ یہ چار بھائی تھے جن میں رام و لچھمن اور بھرت وشتروگھن کو جوڑے کی شکل میں ساتھ رہتے ہوئے دیکھا جاسکتا تھا۔ ایک دن ایک رشی وشوامتر راجہ دشرتھ کے دربار میں یہ شکایت لے کر آیا کہ آشرم میں راکھشس اسے تکلیف پہنچاتے ہیں۔ راکھشس کے وجود کے تعلق سے باتیں ہوئیں جن کا راجہ راون تھا جو کہ لنکا پر راج کرتا تھا اور اس کے پاس راکھشسوں کی فوج تھی جو عام انسانوں پر ظلم کیا کرتے تھے۔ وشوامتر دراصل وہ ان راکھشسوں کو سزا دلوانا چاہتے تھے اور اسی غرض سے وہ رام کو لے کر سفر پر نکلے۔ اس واقعہ کو نظم کرنے میں فرحت کا قلم منظر نگاری کا جادو جگاتا ہے۔ اشعار دیکھیں۔

جناب رام ادھر بھی سایۂ فیض
ہم ہو سر بسر سرمایۂ فیض

بہار لالۂ خود رو عجب تھی
نگاہِ نرگسِ شہلا غضب تھی

بچھا صحرا میں فرشِ سبزۂ تر
رواں ہر سو نسیم روح پرور

ہوئی رونق فضا آکر جو بن میں
بہار جاوداں آئی چمن میں

کہیں پر ایک دشت خوشنما تھا
وسیع و دلپسند و دلکشا تھا

(ص10)

کئی دنوں تک سفر کرنے کے بعد اثنائے راہ 'تاڑکا' نامی راکھشس کو رام نے تیر مار کر ہلاک کیا اور اس طرح رشی وشوامتر اور دونوں راج کمار متھلا سلطنت کے شہر جنک پور پہنچے جہاں کا راجہ صوفی منش 'جنک' تھا اور ان کی ایک راجکماری تھی۔ اُن کا نام سیتا تھا۔ وہ بہت ہی خوبصورت تھی اور قرب وجوار کے شہزادے ان سے بیاہ رچانے کے خواہاں تھے۔ آخر میں سیتا سے بیاہ رچانے کی شرط یہ ٹھہری کہ طالب کو دھنش اُٹھا کر خود کو بلوان ثابت کرنا ہوگا۔ آس پاس کے شہزادے دھنک اُٹھانے سے عاجز تھے لیکن رام نے زور و بل لگائے بغیر دھنش کو ایسے اٹھا لیا جیسے سوکھی لکڑی ہو۔ راجہ جنک اور جانکی کے تعلق سے بھی واقعات نظم ہوئے ہیں۔ شہر جنک پور کا نقشہ عمدگی سے کھینچا گیا ہے۔ رام اور سیتا کے حوالے سے جو واقعات نظم ہوئے ہیں بہت ہی شائستہ ہیں۔ دربار کا آراستہ ہونا اور رام و لکشمن کا وہاں براجمان ہونا۔ رام کا دھنش توڑنا، اشخاص کا انگشت بدنداں ہونا۔ ایک مہیب آواز کا گونجنا۔ پرندوں کا خوف زدہ ہوکر محوِ پرواز ہونا۔ چرندوں کا اس ہنگامی صورتِ حال کے تحت دبک کر بیٹھ جانا۔ طلسم کے ٹوٹتے ہی چہار طرف سے آفرین کی صداؤں کا بلند ہونا وغیرہ شاعری کی توقیر میں چار چاند لگاتے ہیں۔ یہاں دیکھیے کہ منظر نگاری میں فرحت کا قلم کس قدر مشاق ہے۔

دھنک کو توڑ کر پھینکا زمیں پر
اندھیرا چھا گیا عرشِ بریں پر

مہِ خورشید پر زردی سی چھائی
قمر کے منہ پہ اڑتی تھی ہوائی

درندے دب رہے سب جی چھپا کر
پرندے اڑ گئے اوج ہوا پر

بدن میں دیوتا پھولے جزو کل
تو کی اوجِ فلک سے بارشِ گل

بہ ہمراہ جلیسا حسب آئیں
جناب جانکی محفل میں آئیں

جناب رام کے قریب آکے فی الحال
پہنادی بھول کر پھولوں کی جے مال

دھنک کا ہوگیا مضموں سب انجام
بگوشِ دل سنو ذکر سری رام

(ص31)

دھنش ٹوٹنے کے بعد راجہ جنک نے راجہ دشرتھ کو خط لکھا جس میں دھنش کے تعلق سے وقوعہ احوال بیان کیے گئے تھے۔ بادشاہ نے اپنے مراسلے میں سیتا جی سے رام کے لگن کے متمنی ہوئے اور ساتھ ہی جنک پور کی سرزمین ایودھیا باسیوں کے ساتھ دیگر تمام مہمانوں کی آمد پر استقبال کے لیے چشمِ براہ ہونے کا عزم کیا۔ راجہ دشرتھ نے بھی مراسلے کا جواب بھیج دیا اور اپنا وعدہ ایفا کرنے کی تیاری شروع کی۔

مجھے اک عہد منظور نظر تھا
جو لوح دل پہ نقش کالحجر تھا

خلائق بیرہ کے پروانے ہوئے جمع
پتنگے اڑ کے آ پہنچے پئے شمع

ہر اک نے مقدر آزمائی
سر مو نوں نے جنبش نہ پائی

پئے دیدار لطف محفل عام
ہوئے یاں جلوہ افگن لچھمن و رام

جواب نامہ دے کر حسب دستور
کیا رخصت اودھ سے شاد و مسرور

(ص33-34)

راجہ دشرتھ متھلا دیش کی راجدھانی جنک پور آئے۔ رام کی شادی سیتا سے ہوئی۔ رانی کیکئی کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا اجودھیا کے تخت پر بیٹھے لہذا نوکرانی کی باتوں میں آکر اس نے رام کو بن باس ہونے پر مجبور کیا۔ رام نے جنگل کی راہ لی۔ لکشمن اور سیتا جی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ چتر کورٹ کی پہاڑیوں پر قیام رہا۔ بھرت رام کی تلاش میں جنگل میں آئے، ملاقات کے بعد رام نے بھرت سے جلد لوٹ آنے کا وعدہ کیا اور بھرت کو واپس ایودھیا بھیج دیا تاکہ وہ رام کی واپسی تک سلطنت کے کاموں کو انجام دیتے رہیں۔ ایک دن شری رام اور سیتا اپنی جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھے ہوئے پھولوں، درختوں اور پرندوں کو دیکھ رہے تھے کہ جنگل میں ایک راکھشش سنہرا ہرن کا روپ دھارے ان کے سامنے سے گزرا، سیتا کی

خواہش پر رام پکڑنے دوڑے، لکشمن نے منع کیا لیکن رام نکل پڑے۔ رام نے ہرن کو تیر مارا مگر وہ ماریچ نامی راکھشس تھا جو راون کے بچھائے ہوئے جال کے مطابق کام کر رہا تھا۔ تیر ماریچ کے دل کے پار ہو چلا تھا مرنے سے پہلے اس نے شری رام کی آواز میں ''آہ سیتا اور آہ لکشمن کی آواز لگائی۔ آواز کے سنتے ہی سیتا نے اضطراب کی حالت میں لکشمن کو سخت وست کہا اور رام کی مدد کو بھیجا۔ لکشمن، رام کی تلاش میں معینہ جگہ سے دور نکل آئے۔ دوسری طرف راون نے ایک فقیر کا بھیس بدلا اور سیتا جی کی جھونپڑی کے پاس آپہنچا اور سیتا جی کو لکشمن ریکھا سے باہر نکل کر بھکشا دینے پر مجبور کیا۔ سیتا جی اکیلی تھیں جونہی انھوں نے لکشمن ریکھا عبور کیا، راون نے سیتا جی کو زبردستی پشپک رتھ میں ڈالا اور لنکا لے گیا۔

سیتا جی کو پشپک لیے اڑتا رہا اور وہ مدد کو پکارتی رہیں۔ جٹایو نامی پرندے نے مدد کی کوشش کی لیکن وہ راون کے تیر کا شکار ہوا۔ سیتا راہ میں اپنے زیور پھینکتی رہیں تاکہ رہائی کے لیے نشان راہ بنے۔ رام کی ملاقات لکشمن سے ہوئی اور دونوں نے خدشات کا اظہار کیا اور سیتا کی طرف دوڑ پڑے۔ یہاں جھونپڑی خالی دیکھ کر ماتھا ٹھنکا اور سیتا کی جستجو میں جنگلوں میں گھومتے اور آوازیں لگاتے رہے۔ اثنائے راہ جٹایو نامی زخمی پرندے سے ملاقات ہوئی اور اس نے صحیح صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ رشیوں کے مشورے پر رشیہ مُوک پہاڑی پر پہنچے۔ رام کو سیتا جی کے زیورات ملے۔ سمپاتی نامی ایک سمندری پرندے نے بانروں کو بتایا کہ راون پشپک رتھ میں بزور بازو ایک عورت کو بٹھا کر لنکا کے جزیرے کی طرف لے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہنومان لنکا پہنچا اور سیتا سے ملاقات کی اور انھیں اطمینان دلایا اور مزید خاطر جمع رکھنے کی تاکید کے ساتھ رام کی انگوٹھی نشانی کے طور پر دیکھائی۔ ہنومان نے رہائی کی پیشکش کی لیکن سیتا چاہتی تھی کہ رام خود آکر اس بے عزتی کا بدلہ راون سے لے اور اسے آزاد کروائے۔ ہنومان لنکا سے واپس ہوا اور رام کے ساتھ مل کر بندروں کی فوج بنائی اور سیتا کی رہائی کے لیے لنکا پر حملہ آور ہوا اور میدان کارزار میں راون کو شکست فاش دی۔ یہاں فرحت کا قلم جنگ کا نقشہ کھینچنے پر خوب قادر ہے۔ جنگی لوازمات میں چھوٹی چھوٹی چیزوں پر بھی اس کی نظر ہے۔ مافوق الفطرت داستانوں کی جنگ بھی غیر معمولی ہوا کرتی ہے۔ بہت سی باتیں انسانی عقل کی رسائی سے پرے ہوتی ہیں، اس کے باوجود جس طرح سے اس جنگ کو نظم کیا گیا ہے قابل ستائش ہے۔ راون کی پہلی شکست کا منظر دیکھیں۔

ثوابت ہا شکست فاش پائی
پھری خورشید اعظم کی دُہائی

پریشاں مضطر و ناکام و دلگیر
ہراسانی کا نقشہ غم کی تصویر

قدم ہو رزم گہ میں لاکھ من کا
عوض لیتا ہے چل کر کمبہ کرن کا

سُنا جب شہِ راون کا ارشاد
ہوئے لیس افسران فتنہ ایجاد

ہزاروں گرز بردارانِ پر جوش
ہزاروں شہسوارانِ زرہ پوش

کیے تاجِ جواہر زینتِ سر
لیے گرزِ گراں و تیر خنجر

کہیں گرجا کہیں تڑپا تعب سے
کہیں ضیغم صفت گونجا غضب سے

کہیں چمکائی شمشیرِ شرر ریز
کسی پر آب خنجر کو کیا تیز

شکست فاش جب راون نے پائی
پریشانی سے سر پر خاک اڑائی

(ص 121-126)

رام نے سلطنت لنکیشور کو تباہ و برباد کیا اور تزک واحتشام کے ساتھ سیتا جی کو لے کر ایودھیا لوٹے۔ فرحت نے ایک ایک واقعہ باریک بینی سے بیان کیا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے بیان کرنے پر قادر ہیں۔ جہاں جوش و ولولہ ہے وہاں مناسب لفظیات لائی گئی ہیں۔ سیتا کی غمزدہ دنیا کی منظر کشی اس قدر متاثر کن ہے کہ معمولی انسان بھی اس سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ تشبیہات واستعارات کا عمدہ التزام اشعار میں کیف کا تلاطم پیش کرتا ہے۔ محاکاتِ شعری کو بروئے کار لا کر تراجم میں بچی جان ڈال دی ہے۔ محاورات کا برمحل استعمال ملتا ہے۔ فرحت نے رامائن کا خاتمہ نہایت ہی شاندار طریقے سے کیا ہے رام کی ایودھیا میں واپسی، وہاں کے طرب وخوشی کے مناظر یوں نظم کیے ہیں کہ عمدہ مصوری کا خاکہ ذہن میں ابھرتا ہے اور قارئین اپنے آپ کو ماضی میں کھڑا ہوا پاتے ہیں۔

جنابِ رام چھمن کا کرم ہو
سیا جی کی عنایت دم بدم ہو

اجودھیا میں یکا یک مچ گئی دھوم
بدن میں پھول اُٹھے سب پیر و معصوم

خبر یہ آمد آمد کی جو پائی
چلے سب گھر سے بہر پیشوائی

ہوئے سب فیض مقدم سے شجر سبز
معطر تازہ و سیراب و سر سبز

برای حاصلِ نظارۂ رام
ہوا کوسوں تلک ایک مجمع عام

اُٹھے خوابِ لطافت سے سری رام
ہوئے زینت فزائے محفلِ عام

رکھا دی سیم سلطانی کو سر پر
ہوئے زینت فزا اورنگ زر پر

جنابِ رام نے با خاطر شاد
نئے سرے سے کیا خلقت کو آباد

بڑھائی رونقِ دربار شاہی
ہوئے مصروف کاروبار شاہی

(ص 131-33)

مختصر یہ کہ جتنے رامائی منظومات اردو اور فارسی ادب میں موجود ہیں ان میں فرحت کا ترجمہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ ان نسخوں کو دوبارہ تدوین کرنے کی ضرورت ہے۔ بیشتر ترجموں کی زبان سادہ اور سلیس ہے لیکن قدیم املا اور ہجے کی وجہ سے قاری کہیں کہیں دشواریوں کا شکار ہوتا ہے۔ منظوم اور منثور ترجموں میں خاصا فرق ہوتا ہے۔ منظوم ترجموں میں شاعری میں زور بیان پیدا کرنے کی کوشش کے سبب، نگاہ اصل کہانی سے ہٹ جاتی ہے اور یہی وہ خاص نقطہ ہے جو بیشتر منظوم رامائی ترجموں میں پایا جاتا ہے۔ گرچہ فرحت نے ترجمے کے آغاز میں ہی لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے کا دعویٰ کیا ہے لیکن ان کا دعویٰ ثبوت بہم نہیں پہنچا تا اس کے باوجود اس ترجمے کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔

منابع

1. رامائن منظومہ، منشی شنکر دیال فرحت، مطبع نول کشور کانپور، 1881
2. اردو شاعری کے ارتقا میں ہندو شعرا کا حصہ، (ص 471) گنپت سہائے سریواستو، برج باسی لال گوڑ، بادشاہی منڈی، الہ آباد، 1969

■

Dr. Iftekhar Ahmed
Associate Professor, Department of Persian
& Central Asian Studies, School of Languages
Linguistics & Indology, MANUU
Hyderabad- 500032 (Telangana)
Mob.: 9433114692
kazimdu@gmail.com

طوطیِ ہند امیر خسرو کی شخصیت اور شاعری

حامد اشرف

گزشتہ 700 برسوں کی تاریخ میں فارسی، ہندی، عربی، سنسکرت اور بھاشا کا جید عالم، بے مثل شاعر، نامور ادیب اور ماہر موسیقار امیر خسرو ہیں۔ غزل، مثنوی، قصیدہ، قطعہ، رباعی، قوالی، ترانہ، دوہا، ڈھکوسلہ اور کہہ مکرنی جیسی شعری اصناف کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ انھوں نے امتزاج سے موسیقی کی دنیا کو رنگین اور دلکش بنایا۔ نئی دھنیں اور نئے راگ ایجاد کر کے عشق ومحبت اور سوز وگداز کے حامل انسانوں کی دل کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ امیر خسرو کو قوالی کا 'باوا آدم' کہا جاتا ہے۔ عشق مجازی اور عشق حقیقی، دونوں میں امیر خسرو اپنی مثال آپ ہیں۔

ابوالحسن لقب، نام یمین الدین اور امیر خسرو عرفیت ہے۔ 651 ھ موافق 1253 میں قصبہ پٹیالی ضلع ایٹہ (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ 72 سال کی عمر میں 725 ھ موافق 1325 بمقام دہلی وفات پائی۔ (1) حضرت خواجہ نظام الدین اولیا (دہلوی) کے چہیتے مرید تھے۔

آٹھ برس کی عمر میں ہی امیر خسرو یتیم ہو گئے۔ ان کی کفالت، تعلیم وتربیت کی ذمے داری ان کے نانا نے بحسن وخوبی انجام دی۔ غیاث الدین بلبن کے دورِ حکومت میں امیر خسرو کے نانا کا شمار سلطنت کے چار اہم ستونوں میں ہوتا تھا۔ درباری آداب ولوازمات، نشست وبرخاست، گفت وشنید اور امارت وثروت کا ماحول جو بادشاہوں اور بڑے بڑے امرا کا تھا، اسی ماحول میں امیر خسرو کی پرورش ہوئی۔ بچپن سے ہی انھیں علم وادب اور موسیقی سے بھری محفلوں کا ماحول ملا۔ نانا نے کبھی انھیں باپ کی کمی کا احساس ہونے نہیں دیا۔ آگے چل کر امیر خسرو نے مذہب، تصوف، فقہ، علم نجوم، ہیئت، صرف ونحو، خطاطی اور خوش نویسی میں مہارت حاصل کر لی اور اردو / ہندی کے پہلے شاعر بنے۔ موسیقی کی کئی دھنوں، پہیلیوں، دوہوں اور گیتوں کے خالق ہیں اور ان کی تحریریں لوک ادب کا حصہ بن گئی ہیں۔ موسیقی کے لطیف فن پر جب انھوں نے توجہ کی تو اس کو آسمان پر پہنچایا۔ ستار اور طبلے کی ایجاد کا سہرہ انھی کے سر ہے۔ انھوں نے ستار میں ایک تار کا اضافہ کیا اور بے شمار راگ ایجاد کیے۔ شبلی نعمانی کے مطابق وہ موسیقی کے 'نایک' ہیں اور دربار اکبری کے تان سین سے زیادہ بڑے موسیقار ہیں۔

امیر خسرو کی ملازمت کا آغاز سلطان غیاث الدین بلبن کے امیر کشلو خان عرف چھجو خان کی ملازمت سے ہوا۔ بعد میں بغرا خان (شہزادہ غیاث الدین بلبن) کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ ایک ترک غلام کی بنگال میں ہوئی بغاوت کو ختم کرنے کے لیے بغرا خان اپنے ساتھ امیر خسرو کو بھی لے گئے اور بغاوت فرو کی۔ بلبن نے بغرا خان کو بنگال کا حاکم مقرر کیا۔ بغرا خان چاہتا تھا کہ امیر خسرو وہیں بنگال میں رہیں، مگر امیر خسرو کا وہاں دل نہیں لگا۔ وہ اپنی ماں اور دہلی سے بہت محبت کرتے تھے۔ چناں چہ وہ واپس آ گئے۔ کچھ عرصے بعد بلبن کے بڑے بیٹے سلطان محمود (حاکم ملتان) کے ساتھ ملتان گئے۔ پانچ سال وہاں رہے۔ 1284 میں سلطان محمود تاتاریوں سے جنگ کرتے ہوئے مارا گیا۔ امیر خسرو کو بھی گرفتار کیا گیا۔ قریب دو سال وہ تاتاریوں کی قید میں رہے۔ اس دوران انھوں نے نہایت پر درد مرثیے لکھے اور دہلی بھیجے۔ ان مرثیوں کے اشعار مہینوں تک لوگ گھر گھر پڑھتے اور اپنے مقتول عزیزوں کا ماتم کرتے۔ سلطان محمود پر لکھا ہوا مرثیہ سن کر دہلی والوں کے ہوش اڑ گئے۔ غیاث الدین بلبن اس قدر رویا کہ اس کی طبیعت بگڑ گئی اور وہ اسی صدمے میں انتقال کر گیا۔ دہلی آنے کے بعد امیر خسرو سلطان کیقباد کے دربار سے بحیثیت ملک الشعرا وابستہ ہوئے۔

پھر جلال الدین فیروز خلجی اور اس کے بعد 21 برس علاء الدین خلجی کے دربار سے منسلک رہے۔ بعدازاں علاء الدین خلجی کے جانشیں قطب الدین مبارک خلجی کا زمانہ دیکھا۔ جب خلجی خاندان کا خاتمہ ہوا تو غیاث الدین تغلق بادشاہ بنا۔ دوسرے بادشاہوں کی طرح اس نے بھی امیر خسرو کی قدردانی کی۔ امیر خسرو نے دو قصیدے محمد تغلق کی مدح میں لکھے۔

امیر خسرو نے اپنے دیوان 'غرۃ الکمال' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "میرے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے تھے کہ میں نے شعر گوئی کی ابتدا کی۔" 2 ایک اور دیوان 'تحفۃ الصغر' کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں کہ وہ جب سن تمیز کو پہنچے تو مکتب میں داخل کیے گئے۔ جہاں ان کے استاد قاضی سعد الدین ان کو خطاطی سکھانے میں ان کی پیٹھ پر درّے لگاتے، لیکن ان کے سر پر زلف پیچاں (شعر گوئی) کی دھن سوار تھی۔ چنانچہ 20 برس کی عمر میں امیر خسرو نے اپنا پہلا دیوان 'تحفۃ الصغر' مرتب کیا۔ ایجاد واختراع کی جانب ان کا ذہن بچپن سے مائل تھا۔ ان کی حاضر جوابی اور مترنم آواز سے ان کے دور کے سلاطین؛ امرا وعمائدین بہت متاثر ہوئے۔ امیر خسرو نے پہلے 'سلطانی' تخلص اختیار کیا۔ بعد میں 'خسرو' اختیار کیا۔ انھوں نے 72 برس کی طویل عمر پائی اور گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ درباری شاعر بنے۔ شہزادوں کے استاد رہے۔ زمانے کی تلخیاں بھی برداشت کیں اور ناز ونعمتیں بھی ان کا مقدر بنیں۔ بغرا خان نے امیر خسرو کی شاعری سن کر کشتی بھر کر روپیہ پیسہ دیا۔ سلطان جلال الدین عارض نے معقول مشاہرہ مقرر کیا۔ اپنا لباس عنایت کیا۔ ندیم خاص بنایا۔ مصحف داری کا عہدہ دیا اور 'امیر' کا خطاب عطا کیا۔ سلطان علاؤ الدین خلجی نے امیر خسرو کو سالانہ ایک ہزار تنکہ مقرر کیا تھا اور ایک قصیدہ لکھنے پر ایک گاؤں بطور انعام دیا۔ قطب الدین مبارک بن

علاؤالدین خلجی نے مثنوی 'نہ سپہر' لکھنے پر ہاتھی برابر تول کر روپے پیسے دیے۔ تذکرہ نویسوں کے مطابق امیر خسرو کے فارسی اشعار کی تعداد چار لاکھ سے زیادہ ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے انھیں 'سلطان الشعرا' برہان الفضلا اور شاعری میں 'یگانۂ عالم' کے القاب سے یاد کیا ہے۔ حضرت سعدی شیرازی، ملا عبدالقادر بدایونی اور ضیاء الدین برنی جیسے اہل علم نے امیر خسرو کے کمالات شاعری پر تحسین پیش کی ہے۔ مولانا جامی نے بتایا کہ 'خمسہ نظامی' کا اگر کہیں جواب ملتا ہے تو وہ خسرو کی مثنویوں میں ہے۔ دولت شاہ سمرقندی نے اپنے 'تذکرہ' میں امیر خسرو کو 'خاتم الکلام فی آخر الزماں' اور 'دُرِّ دریائے معنیٰ' کہا ہے۔

محمد قدرت اللہ گوپاموی نے 'تذکرہ نتائج الافکار' میں امیر خسرو کی شیریں بیانی کا ایک واقعہ تحریر کیا ہے کہ ایک روز امیر خسرو نے اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیا کی خدمت میں ایک قصیدہ پڑھا۔ مرشد قبلہ کو قصیدہ بہت پسند آیا۔ پوچھا کہ کیا انعام چاہتے ہو؟ امیر خسرو نے کہا مجھے شیرینی کلام عطا ہو جائے۔ حضرت شیخ نے فرمایا۔ میرے پلنگ کے نیچے شکر سے بھرا ہوا ایک برتن ہے۔ اسے اپنے سر پر انڈیل لو اور اس میں سے تھوڑی شکر حلق میں ڈال لو۔ خسرو نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ محمد قدرت اللہ گوپاموی لکھتے ہیں کہ اس واقعے کے بعد امیر خسرو کے کلام میں شیرینی، فنکاری، خوش اسلوبی اور حسن آرائی کا اضافہ ہوا۔

مولانا آزاد بلگرامی نے امیر خسرو کو شاعری میں معاملہ بندی کا موجد قرار دیا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے امیر خسرو کو غزل کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں سعدی شیرازی سے بہتر قرار دیا ہے اور غزل گوئی میں انھیں سعدی کا پیرو بتایا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے 'حیات خسرو' کی تقریظ میں تحریر کیا ہے کہ:

''اس سرزمین سے حضرت امیر خسرو جیسا صاحبِ ذوق ذی کمال و جامع صفات شخص اب تک پیدا نہیں ہوا۔ وہ فارسی کے نہایت بلند پایہ شاعر ہیں۔ استادِ غزل سعدی مانے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر کسی کو ان کی ہمسری کا دعویٰ ہو سکتا ہے تو وہ حضرت امیر خسرو ہیں۔ ان کے کلام کی فصاحت' روانی اور خاص کر سوز و گداز جس میں تصوف کی چاشنی بھی شامل ہے' اپنا جواب نہیں رکھتی۔ یوں تو سب اہل زبان کو اپنی ہی زبان کا غرہ ہوتا ہے' لیکن اہلِ ایران اس معاملے میں بطورِ خاص ممتاز ہیں۔ وہ کسی غیر ایرانی کے کلام کو خاطر میں نہیں لاتے لیکن حضرت امیر خسرو کے سامنے انھیں بھی جھکنا پڑا۔''3

امیر خسرو کی فنکارانہ صلاحیتوں کا معترف تو سارا زمانہ ہے۔ انھوں نے شعری ذوق کی آبیاری میں اپنا خون جگر صرف کیا اور خداداد ذہانت و فطانت سے پوری ایشیائی شاعری کا دامن وسیع کر دیا۔ امیر خسرو کی زبان میں حلاوت تھی، محاورہ اور روزمرہ پر عبور اور کلام کی روانی اور دلکشی دیکھ کر کر لوگ انھیں 'سعدی ہند' اور 'طوطی شیریں مقال' کہتے تھے۔ ان کا نعتیہ کلام نہایت متاثر کن، روح افزا اور ایمان پرور ہے۔ جس کا مطالعہ خسرو کو ادب شناس محبت اور رمزگاہِ حقیقت ثابت کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں فلسفہ اور حکمت کا اظہار اور حسن و عشق کا برملا اظہار پایا جاتا ہے۔ عشق کی راگنی اور حسن کے نغموں سے وہ اپنی شاعری میں رومان بھر دیتے ہیں۔ ان کی فارسی شاعری کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی رقمطراز ہیں:

''ایران میں جس قدر شعرا گزرے ہیں، خاص خاص اصنافِ شاعری میں کمال رکھتے تھے۔ مثلاً فردوسی، نظامی مثنوی میں، انوری اور کمال قصائد میں، سعدی اور حافظ غزل میں۔ یہی لوگ جب دوسری صنف میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ بخلاف اس کے امیر خسرو قصائد، مثنوی، غزل تینوں میں ایک درجہ رکھتے ہیں۔ مثنوی میں نظامی کے بعد آج تک ان کا جواب نہیں ہوا۔ غزل میں سعدی کے دوش بدوش ہیں۔ قصائد میں ان کی چنداں شہرت نہیں ہوئی، لیکن کلام موجود ہے۔ مقابلہ کر کے دیکھ لو۔ کمال اور ظہیر سے ایک قدم پیچھے نہیں۔''4

پانچ فارسی دیوان تحفۃ الصغر، وسط الحیات، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ، نہایۃ الکمال ایک ہندوی دیوان 'جواہر خسروی'، جملہ 10 مثنویاں، قران السعدین، مطلع الانوار، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں، ہشت بہشت، یہ پورا خمسہ فارسی شاعر نظامی گنجوی کے جواب میں لکھا گیا ہے جو سلطان علاء الدین خلجی کے نام معنون ہے۔ جس میں کل اٹھارہ ہزار اشعار ہیں۔ یہ خمسہ دو سال کی مدت میں تحریر ہوا ہے۔ مزید پانچ مثنویاں تاج الفتوح، نہ سپہر، دول رانی و خضر خان، ساقیانہ، عاشقہ (ہندی مثنوی) ہیں۔ 'افضل الفوائد' (ملفوظات' حضرت نظام الدین اولیا) 'اعجاز خسروی' (تین جلدوں میں ہے۔ نثر نویسی اور قواعد کے اصول اور سیکڑوں صنعتیں اختراع کی گئی ہیں) 'تغلق نامہ' (غیاث الدین تغلق کے حالات وفتوحات) 'خزائن الفتوح' (سلطان علاء الدین کی فتوحات) 'قصہ چہار درویش' (پیر و مرشد کی بیماری کے دوران تفریح طبع کے لیے تحریر کیا گیا) 'مناقب ہند، تاریخ ہند) اور 'خالق باری (فارسی اور ہندی دیوان کی لغت)' قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ فن حساب اور فن موسیقی پر بھی امیر خسرو کی تصانیف ملتی ہیں۔

ایرانی شاعر رکن الدین اوحدی کے مطابق امیر خسرو کا جتنا کلام فارسی میں موجود ہے، اسی قدر اردو ہندوی میں بھی لکھا گیا ہے۔ لیکن یہ کلام ہمیں دستیاب نہیں ہے۔ دیوان 'جواہر خسروی' میں جو اردو ہندوی کلام ملتا ہے وہ بھی فارسی کلام جیسا کیف و مستی کا مظہر ہے۔ عشق حقیقی کا آئینہ دار، تصوف کی چاشنی میں ڈوبا، آدمیت کو انسانیت سے قریب کرنے والا کلام ہے۔ درج ذیل غزل کو زبان ریختہ کی پہلی غزل کہا جاتا ہے۔ جس میں امیر خسرو نے ایک مصرع فارسی میں تو دوسرا ہندوی میں لکھا ہے۔ یہ ایک مشہور عشقیہ غزل ہے' جس کی نغمگی اور الفاظ کا دروبست سننے والے کو مدہوش کرتا ہے۔ جسے قوالی کے طور پر بھی گایا جاتا ہے۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل دُرائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چوں عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

ہمارا ملک ہندوستان! جنت نشان ہے، جس کی مٹی ہمیشہ سونا اُگلتی ہے۔ یہاں کے دریاؤں میں موتی اور پہاڑوں میں کوہ نور پائے جاتے ہیں۔ اس ملک کے کونے کونے میں زعفران وصندل کی مہک پائی جاتی ہے۔ بالخصوص کشمیر میں چمن کی بہار، گلوں کا نکھار، سبزے کی مہک، جھرنوں کی موسیقی، بل کھاتی وادیاں، برف پوش پہاڑیاں، جھومتے لہراتے درخت، شبنم میں بھیگی، اوس کھائی فضاؤں اور آگ لگاتے چناروں کو دیکھ کر حضرت امیر خسرو پکار اٹھے کہ

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

اسی طرح ان کا ایک اور شعر بھی زبان زد خاص و عام ہے۔ یا یوں کہیے کہ اس شعر کا پہلا مصرع بیشتر عاشق اپنے معشوق کے لیے آج بھی استعمال کرتے ہیں۔

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم
چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہان من

''میرے محبوب کی زبان ترکی ہے اور میں ترکی نہیں جانتا' کیا ہی اچھا ہوتا اگر اس کی زبان میرے منہ میں ہوتی۔''

امیر خسرو ایک ایسے شاعر، مدبر، فلسفی، حکیم اور موسیقار ہیں جن کی شہرت ان کے دورِ جوانی ہی سے پورے ہندوستان بلکہ ایشیائی ممالک تک پھیل گئی تھی۔ ان کے فارسی کلام کے تراجم دنیا کی بیشتر زبانوں میں کیے گئے۔ ان کی شخصیت اور شاعری پر سیکڑوں کتابیں لکھی گئیں۔ بے شمار سیمینار، ان کی ذات سے متعلق کیے گئے۔ ان کی تحریروں کو گایا، سنا اور پڑھا گیا۔ ٹی۔ وی سیریل بنائے گئے۔1975 میں ان کی سات سو سالہ تقریبات منائی گئیں۔ انٹرنیٹ پر امیر خسرو کی شخصیت اور خدماتِ ادب کا ایک خزانہ پایا جاتا ہے۔ جہاں سے چند فارسی اشعار کے ترجمے ملاحظہ ہوں۔

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری

''میں تو بن گیا ہوں اور تو میں بن گیا ہے۔ میں جسم ہوں اور تو جاں ہے۔ پس اس کے بعد کوئی نہ کہے کہ میں اور ہوں تو اور ہے۔''

نمی دانم کہ منزل بود' شب جائے کہ من بودم
بہ ہر سو رقص بسمل بود' شب جائے کہ من بودم

''مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون سی جگہ تھی' جہاں کل رات میں تھا۔ ہر طرف رقص بسمل ہو رہا تھا جہاں کل رات میں تھا۔''

پری پیکر نگارے، سرو قدے، لالہ رخسارے
سراپا آفتِ دل بود، شب جائے کہ من بودم

''پری کے جسم جیسا ایک محبوب تھا' اس کا قد سرو کی طرح اور رخسار لالہ کی طرح تھے۔ وہ سراپا آفتِ دل تھا' جہاں کل رات میں تھا۔''

امیر خسرو کے ہندوی کلام کی مقبولیت اس لیے ہے کہ انھوں نے دیہاتی اور عام فہم زبان استعمال کی اور زندگی کے ہر دور اور ہر موسم کو اپنے اشعار اور گیتوں کا موضوع بنایا۔ برسات کے موسم میں باغوں میں جھولے ڈالنا، موسم بہار کی رنگ رلیاں منانا' بیٹی کا باپ کے گھر سے رخصت ہونا، عاشق و معشوق کا بچھڑنا، جدائی اور برہا کے گیت گانا، دوہے، پہیلیاں بولنا اور ڈھکوسلے کہنا یہ سب قدیم دور کے لوگوں کی زندگی تھی۔ جس کو پوری سچائی اور سوز و گداز کے ساتھ امیر خسرو نے سات آٹھ سو سال پہلے تحریر کیا تھا مگر آج بھی پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

کاہے کو بیاہی بدیس رے لکھی بابل مورے
بھائیوں کو دیے محلے دو محلے ہم کو دیا پردیس
کاہے کو بیاہی بدیس رے
ہم تو ہیں بابل تیرے کھونٹے کی گائیاں
جدھر ہانکو ہنک جائیں
ہم تو ہیں بابل تیرے بیلے کی کلیاں
گھر گھر مانگی جائیں
ہم تو ہیں بابل تیرے پنجرے کی چڑیاں
بھور بھئے اڑ جائیں
کاہے کو بیاہی بدیس رے لکھی بابل مورے

امیر خسرو نے ایک طرف کھڑی بولی میں عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ کے استعمال سے 'ریختہ' میں شاعری کی تو دوسری طرف فارسی الفاظ میں برج بھاشا اور اودھی زبان کے الفاظ کا بہت خوبصورت استعمال کیا۔ جس کی مثال درج ذیل گیتوں میں ملتی ہے۔

چھاپ تلک سب چھین لی ری موسے نیناں ملائی کے
اپنی ہی کر لی نی موسے نیناں ملائی کے
پریم بھٹی کا مدھوا پلا کر
متوالی کر لی نی موسے نینا ملائی کے
خسروں طام کے بل بل جاؤں
اپنے ہی رنگ میں رنگ لی نی رے موسے نیناں ملائی کے
سکل بن پھول رہی سرسوں
بن بن پھول رہی سرسوں
امبوا پھوٹے ٹیسو پھولے
کوئل بولے ڈار ڈار
اور گوری کرت سنگھار
ملنیاں گڈھوا لے آئیں کرسوں
سکل بن پھول رہی برسوں

امیر خسرو کے دوہے بھی بہت اہم ہیں، درج ذیل میں کچھ دوہے ملاحظہ ہوں۔

کھیر پکائی جتن سے چرکھا دیا جلا
کتا آیا کھیر کھایا تو بیٹھی ڈھول بجا
خسرو دریا پریم کا، الٹی واں کی دھار
جو اترا سو ڈوب گیا، جو ڈوبا سو پار
گوری سووے سیج پر، مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے، رین بھئی چھوں دیس

امیر خسرو نے فارسی زبان میں جو پہیلیاں اور لطیفے تحریر کیے ہیں ان تک ہماری رسائی نہیں ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوی زبان میں قطعات اور ظریفانہ نظمیں بھی ان سے یادگار ہیں' جن پر ابھی تک کوئی خاطر خواہ تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ نیز شاعری کی جو صنعتیں انھوں نے ایجاد کی ہیں اور جو صنائع بدائع پیش کیے ہیں ان پر بھی تحقیقی کام کیا جا سکتا ہے۔ ممتاز حسین نے امیر خسرو کے متعلق لکھا ہے:

''خسرو کی ہندوی شاعری کا بیشتر حصہ نغز گوئی، چیستان گوئی، لطیفہ گوئی اور لفظوں کے کھیل تماشے پر مبنی ہے... خسرو ایک درباری، صوفی اور سپاہی ہی نہیں بلکہ ایک خوش بیان بذلہ سنج، لطیفہ گو، بدیہہ گو اور ظریف آدمی بھی تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ عاشق مزاج اور عشق باز تھے۔ وہ گائک اور نائیک بھی تھے اور ان کی صحبت ڈھاڑی، ڈفالی، سازندوں کے ساتھ بھی رہتی اور وہ صوفیوں، قلندروں، علما و فضلا کے ساتھ بھی رہتے اور شاعروں کے ساتھ بھی۔ اُن کو سفر کرنے سے عشق تھا' گوشہ نشینی سے سخت نفرت تھی۔ ایسا شخص کہاں کہاں نہیں پہنچا ہوگا۔ میخانہ ہو کہ سرا، طرب گاہ ہو کہ خانقاہ، ان کا گزر ہر جگہ ہوتا۔ ایسی کوئی اور ہشت پہل شخصیت مشکل ہی سے ملے گی۔''5

حواشی

1. دیوان امیر خسرو: ڈاکٹر نور الحسن، نولکشور بک ڈپو، لکھنؤ 1967، ص9
2. امیر خسرو: فرد اور تاریخ۔ معین الدین عقیل، ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان 1997، ص8
3. حیات امیر خسرو: نقی محمد خان، مطبوعہ ٹائمز پریس کراچی، مولف نقی محمد خان، ص3
4. بیانِ خسرو۔ از مولوی شبلی نعمانی، الناظر بک ایجنسی، لکھنؤ 1914، ص75
5. امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری: پروفیسر ممتاز حسین، ناشر، پاکستان ہیرالڈ لمیٹڈ کراچی۔ اکتوبر 1975، ص 34

■

Dr. Hamid Ashraf
Professor & Head Dept of Urdu
Maharashtra udayagiri College (UGPG)
Udgir, Distt: Latur -413517 (Maharashtra)
Mob.: 9423351351
hamidashraf689@gmail.com

شخصیات

فانی بدایونی کی فارسی غزل گوئی

نیلوفر حفیظ

فانی بدایونی ایسے شاعروں کی فہرست میں سرفہرست ہیں جن کا ہمہ کلام خواہ اردو ہو یا فارسی، عالم گیر شہرت اور آفاقیت کا حامل قرار دیا جاتا رہا ہے اور ہر عہد و مکتب فکر کے لوگوں کے لیے مسحور کن، اثر انگیز، لائق تفکر اور دلپذیر رہا ہے اگر اردو شعر و ادب میں فانی کے مقام و مرتبے کی بات کی جائے تو وہ ہمیں اس زبان کے ایک بہترین شہ سوار اور فلک ادب کے آفتاب لازوال کی حیثیت سے نظر آئیں گے لیکن یہ بھی ایک تلخ اور افسوس ناک حقیقت ہے کہ اردو ادب میں بھی ان کے صحیح مقام و مرتبے کا تعین ابھی تک نہیں کیا جا سکا ہے، زمانے کی ستم ظریفی کا نتیجہ کہو یا فانی کی خرابی قسمت کہ آج بھی ان کا بیشتر کلام تشریح طلب اور وضاحت کا متقاضی نظر آتا ہے اردو زبان و ادب میں ان کی بے پناہ شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف تو بے شک کیا گیا ہے لیکن ان کی شاعری کی اصل روح تک رسائی پانے کی جانب کما حقہ توجہ ابھی تک بھی نہیں دی گئی ہے بلکہ ستم بالائے ستم تو یہ کہ انھیں شاعر مردم بیزار کہہ کر ان کی ہمہ شاعری کو مرثیہ گوئی پر محمول کرتے ہوئے ادبی و فنی اعتبار سے اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے وہ مساعی جمیلہ اختیار ہی نہیں کی گئیں جو کہ کی جانی چاہیے تھی۔ اس حقیقت کا اعتراف کلرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ فانی بدایونی کے کلام کا بیشتر حصہ رنج و غم، افسردگی و سوگواری، حزن و ملال کی کیفیت لیے ہوئے ہے لیکن ان کے درد و کرب کی حدت، جذبات و احساسات کی سوزش، رنج و الم کی شدت، ہجر و فراق کی تکالیف، پرسوز و پردرد دل کی شرر باری، اشک ہائے گرم اور آتش ہائے دروں کی اضطرابی، زمانے کا شکوہ و شکایت اور خرابی قسمت کی کی آہ و زاری وغیرہ ہی ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں اور یہی وہ انفرادی خصوصیات ہیں جو ان کو روایتی شاعروں کی بھیڑ میں ایک ممتاز اور انفرادی مقام و مرتبہ عطا کرتی ہیں۔ ہمارا یہ شاعر بزرگ معاصرین شاعروں کی طرح کسی خیالی یا تصوراتی دنیا میں رہ کر غیر حقیقی اور بعید از امکان، شعر و سخن سے سامعین و قارئین کو ایک جھوٹی اور خیالی دنیا میں سیر کرانے کے بجائے زندگی کے تلخ اور حقیقی صداقتوں سے روبرو کراتا ہے تا کہ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سربلندی اور شان کے ساتھ زندگی گزارنے کا حوصلہ پیدا ہو سکے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے فانی کی شاعرانہ خصوصیات کے بارے میں بالکل درست فرمایا ہے:

''...وہ دنیا کے قہقہوں کا کفارہ اپنے آنسوؤں سے ادا کرتا ہے اس کے یہاں کلبہ احزاں، لذت غم، تیرگی شام اور منزل، فنا کا نشان شکستہ نمایش نہیں بلکہ زندگی کے ٹھوس حقائق ہیں جن کو شعریت نے اور زیادہ اجاگر کر دیا ہے۔''[1]

فانی بدایونی کی شاعری میں ان کے اندرونی جذبات واحساسات کی جو حقیقی تصویر کشی پائی جاتی ہے وہ قاری پر ایک متاثر کن بلکہ سحر کن کیفیت طاری کر دیتی ہے ان کا بیان کردہ ہر خیال یا احساس بہ شکل شعر ان کے جذبات و مشاہدات کی صداقت کا آئینہ دار ہے وہ دنیا سے بیزار نہیں بلکہ بے نیاز نظر آتے ہیں، شعر و سخن سے ان کا مقصد اپنا اخفائے حال ہرگز بھی نہیں ہے، اور نہ ہی انھیں اس دنیائے بے وفا کے لوگوں سے کچھ لینا دینا ہے بلکہ ان کا مقصد تو صرف اور صرف اپنی دلی کیفیات اور احساسات کو خود ہی سے بیان کرنا اور غم کے بحر بیکراں سے ابھرنے کی ایک کوشش خام اور جہد ناتمام کرنا ہے، شدت غم میں جو کچھ بھی ان کے دل ناتواں پر جو کچھ بھی گزرتی ہے اس کو ایماندارانہ انداز میں کہہ دینا ہی ان کی شاعری کے شاندار و جاندار ہونے کا سب سے بڑا سبب ہے:

''...وہ جو کچھ کہتے تھے وہ بہ فوائے قلندر ''ہر چہ گوید دیدہ گوید' اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر کہتے تھے اور خود محسوس کر کے کہتے تھے... یہ نیا انداز فکر اور یہ انوکھا اسلوب بیان ایک روایتی شاعر کے اختیار سے باہر ہے۔''[2]

'کلیات فانی مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی' میں فانی بدایونی کی فقط گیارہ فارسی غزلیں اور دو رباعیات ہی درج ہیں لہٰذا ان کے اسی مختصر سرمایے کی روشنی میں ان کی فارسی شعر گوئی سے متعلق گفتگو کرنے کی کوشش کر رہی ہوں، قسمت نے فانی پر جہاں بے انتہا ظلم کیے وہیں ایک ستم روح فرسا یہ بھی کیا تھا کہ ان کا بہت سا اردو فارسی کلام حادثات زمانہ کی نذر ہو کر ضائع ہو گیا اور ان کی برسوں کی محنت خاک میں مل گئی لیکن انہوں نے ہار نہیں مانی بلکہ تقدیر کے ہر ستم کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے اور یہ انھیں کی ہمت و کوشش تھی کہ قسمت کی تمام تر سفاکیت و بربریت اور ظلم و ستم کے باوجود بھی اس جریدۂ کائنات پر ہمیشہ کے لیے اپنا نقش دوام ثبت کر گئے پروفیسر عبدالشکور نے ان کے کلام کے متعلق لکھا ہے:

''افسوس ہے کہ فانی کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا، ابتدا میں جو کچھ کہا اور جمع کیا تھا والد بزرگوار نے نذر آتش کر دیا پھر 1906 میں دوبارہ کلام جمع کیا وہ چوری ہو گیا آگرہ چھوڑتے وقت سامان کے ساتھ فارسی دیوان بھی ایک کرائے کے مکان میں مقفل کر گئے تھے چنانچہ

سامان کے ساتھ دیوان بھی ضائع ہوا مگر باایں ہمہ جو کچھ چھوڑا اور ان کو حیات دوام بخشنے کے لیے کافی ہے۔"[3]

بہرحال ان کی چند فارسی غزلیات اور رباعیات کی روشنی میں یہ اندازہ لگانے میں چنداں دشواری محسوس نہیں ہوتی ہے کہ فانی کی اردو شاعری ہی کی طرح ان کی فارسی شاعری بھی ہمارے شاعر کے دل کی صدائے دردناک اور حیات کی تفسیر سوزناک ہے ان کے فارسی مجموعہ غزلیات کو ایک ایسے کاسہ قندونبات سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جو اپنی شیرنی و عذوبت کے سبب ذوق کے کام و دہن کو ایک پر کیف، سرور بخش لذت سے ہمکنار کرتا ہے اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے ہمہ فارسی اشعار میں کم و بیش وہی مضامین بیان کیے گئے ہیں جو ان کی اردو غزلیات کا طرۂ امتیاز مانے جاتے ہیں یعنی ان کے فارسی اشعار بھی اردو اشعار ہی کی طرح ان کی زندگی کا آئینہ ہیں جن میں ایک طرف حرماں نصیبی، مایوسی، ناکامی، بے بسی بیچارگی و نامرادی نظر آتی ہے تو وہیں طرف و دیگر سلاست و روانی، حسن بیان، سوز و گداز، جدت و ندرت بھی اپنے پورے طمطراق سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ حالات نامساعدی اور تلاش معاش کے سبب انہیں اپنے عزیز از جان وطن سے ہجرت کر کے حیدرآباد آنا پڑا فانی کو تاعمر اس بات کا بڑا قلق رہا کہ اگر ان کے اپنوں اور اہل وطن نے ان کی غمخواری اور مدگاری کی ہوتی تو ان کو اس طرح بے وطن نہ ہونا پڑتا ان کی فارسی غزل کا ایک مقطع ملاحظہ کیجیے۔

این گناہیست کہ عقوم نہ کنندش فانی
کہ من از خاک بدایوں وطنی ساختہ ام

فانی کو ساری عمر اپنے وطن سے جدائی کا صدمہ ستاتا رہا ان کا ایک اور فارسی شعر دیکھیے جس میں اپنے وطن عزیز سے بے پناہ محبت ہونے کا احساس تو مضمر ہے ہی ساتھ ہی اہل وطن کی بے اعتنائی اور نارسائی کا چھپا ہوا شکوہ بھی موجود ہے، وہ اپنے انفرادی لب و لہجے کو بروئے کار لاتے ہوئے بتاتا ہے کہ یہ مسافرت اتنی تکلیف دہ اور لامتناہی ہے جس کی کوئی حد اور کنارہ نظر نہیں آتا لہٰذا میں نے اپنے دل کی سوکھی زمین کی تشنگی کو سیراب کرنے کی غرض سے ہر قریے کو اپنا ہی وطن تصور کر لیتا ہوں مندرجہ ذیل شعر میں پائی جانے والے طنز اور تلخی کے ساتھ ساتھ نشتریت کی چبھن کو بھی بآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

بہ غربتم کہ بہ ہر قریہ ام طن پیداست
بہ ہر زمین کہ شدم زیر آسمان من است

فانی بدایونی نے بے وطنی کا شکوہ صرف اپنے فارسی اشعار ہی میں نہیں کیا ہے کا بلکہ اردو اشعار میں بھی انھوں نے بار بار اس موضوع کو بیان کیا ہے یہاں ان کا فقط دو اردو شعر نقل کر رہی ہوں جس میں موجود جذبات کی صداقت اور حدت دل میں بے ساختہ کسک اور ہل چل پیدا کردیتی ہے۔

زمین حشر فانی کیا قیامت ہے معاذ اللہ
مجھے اپنے وطن کی سی زمین معلوم ہوتی ہے

فانی کی سوانح حیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام حیدرآباد ہی میں گزارے اور آخر عمر تک ہم وطنوں سے شکوہ کناں رہے لہٰذا ایک شعر میں کچھ اس طرح سخن سرا ہوتے ہیں۔

لو آج مرگ فانی بیکس سے مٹ گئی
وہ ایک خلش جو خاطر اہل وطن میں تھی

فانی ان شعرا میں سے ہیں جنھیں ہجوم غم اور کثرت رنج میں ہی زندگی کی اصل لذت اور حقیقی خوشی کا احساس ہوتا ہے وہ مصائب و مشاکل اور دکھوں و تکلیفوں سے راہ گریز اختیار نہیں کرتے بلکہ مسکراتے ہوئے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں کیونکہ یہ رنج والم ہی ان کی زندگی کا کل سرمایہ ہے انھیں غموں کی گود میں سر رکھ کر ہی سکون و طمانیت کا سرور بخش احساس ہوتا ہے۔ ان کے یہاں غم کا عرفان اپنی پوری سحر آفرینی کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہوا نظر آتا ہے جو غم کو نہ صرف خوشی و شادمانی میں بدل دیتا ہے بلکہ زندگی جینے کا سلیقہ و قرینہ بھی سکھاتا ہے یہ ہی سبب ہے کہ اپنے ایک اردو شعر میں کچھ اس طرح گویا ہوتے ہیں۔

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانی
گرداب کی ہر تہہ میں ساحل نظر آتا ہے

فانی بدایونی 'ہر کہ از دوست می رسید نکو است' کے مقولے پر سختی کے ساتھ کاربند نظر آتے ہیں اور ہمیشہ اس پر ناز کرتے ہیں کہ بارگاہ ایزدی میں انہیں اس قدر معتبر سمجھا گیا کہ ان کے ناتواں شانوں پر غم کے کوہ گراں کا بار ڈالا جاسکے وہ اپنے بے وفا محبوب کی جانب سے ملنے والی ہمہ تکالیف کا شکوہ شکایت کرنے کے بجائے اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں کیونکہ دوست کی طرف سے ملنے والی ہر چیز ان کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اور یہ ہی وجہ ہے کہ بڑے یقین اور صداقت کے ساتھ کہتے ہیں۔

نازم بہ تکیہ کردن فانی بہ لطف دوست
اے واغیور ومغرور زیستن

وہ ہم دنیا دار عام انسانوں کی طرح رنج والم ملنے پر گریہ وزاری یا شکوہ و شکایت نہیں کرتے ہیں بلکہ مسلسل ملنے والے اس ذاتی و حقیقی غم کو اپنی فلسفیانہ فکر کا موضوع بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اس طرح عام اور کمزور انسان کو قوت و طاقت فراہم کرتے ہیں تاکہ وہ زندگی کے حقائق سے راہ گریز اختیار کرنے کے بجائے ان کا مقابلہ کرے اس سلسلے میں خانم تاج بیگم صاحبہ کی آرا نقل کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جس میں وہ فانی کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہیں:

"غم نے ان کو ایسا گھیرا کہ یہ غم ہی کے ہو رہے فانی غم تلاش کرتے ہیں، غم کی پرورش کرتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ خطرناک اور لاعلاج بات یہ ہے کہ غم ہی میں سکون پاتے ہیں۔"

فانی دنیاوی عیش و نشاط اور راحت و آرام کو بے معنی اور حقیر تصور کرتے ہیں حالانکہ انھیں اس دنیا میں حاصل ہونے والے عیش و آرام کے نعمت ہونے سے انحراف تو ہرگز بھی نہیں ہے لیکن وہ زندگی میں ملنے والے غموں کی لذت کو دنیاوی عیش پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک دنیاوی نعمتوں کا لطف اپنی جگہ ہے، لیکن رنجہائے مسلسل کی جو لذت ہے وہ دنیاوی راحت و سکون میں کبھی بھی حاصل نہیں کی جاسکتی ہے ان کا شعر ملاحظہ کیجیے۔

نعمتی ست عیش، اما نعمتی و پایانی
نعمتی ست بی پایاں لذت غم از من پرس

ہمارے اس شاعر بیدار کا ماننا ہے کہ زندگی کو عیش و عشرت کی طمع میں زندگی گزارنے والا شخص در حقیقت ہمہ عمر خود کو فریب دیتا رہتا ہے کیونکہ تمام مادی چیزیں جن کو انسان اپنی خوش حالی اور راحت کا ضامن سمجھتا ہے وہ حقیقتاً فریب اور دھوکہ دینے والی ہیں جبکہ سچائی تو یہ ہے کہ صرف اور صرف غم ہی حاصل نشاط ہے۔

جب لوگ ان کو غموں میں راحت و خوشی حاصل کرتا ہوا پاتے ہیں تو ان سے سوال کرتے ہیں کہ کیونکر کوئی انسان حادثات مسلسل کے باوجود اس قدر قانع اور پرسکون رہ سکتا ہے تو فانی ایسے لوگوں کو جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ حقیقتاً موت ہی زندگی کا راز ہے جب تک لوگ زندگی سے محبت اور موت سے راہ گریز اختیار کرتے

رہیں گے تب تک وہ حقیقی مسرت سے ہمکنار نہیں ہو سکتے لہٰذا بڑے ہی موثر اور دلنشین انداز میں کہتے ہیں۔

فانی زحیات من آشفتہ چہ پرسند
مرگی است کہ از ہستی جاوید پیام است

جب ذہنی خلفشار، دلی کرب اور نفسیاتی الجھن حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو اپنے سوز دروں کی تپش کو فرو کرنے کے لیے شاعری کا سہارا لیتے ہیں اور اپنی بدقسمتی کا ذمے دار اس چرخ کج رفتار کو بتاتے ہوئے اپنے درد کو کچھ اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔

طالعم گردش افلاک بسوخت
اختر مارہ صد اختر زد

فانی کی ذاتی زندگی کے تلخ حقائق، محرومیوں اور مایوسیوں نے انھیں اس قدر شکستہ و ناامید کر دیا تھا کہ ان کی تمام تر پامردی اور دلیری بھی بعض موقع پر متزلزل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے اور بے اختیار و غیرارادی طور پر ان کے قلم سے مندرجہ ذیل رباعی تراوش کر جاتی ہے جس میں وہ فریاد کرتے نظر آتے ہیں کہ میں نے اس طرح زندگی گزاری جیسے کہ میرا خدا ہی نہیں یا پھر میری آواز اس کی بارگاہ تک رسائی حاصل نہیں کر سکی سمندر میں جس طرح مسلسل موجیں اٹھتی رہتی ہیں ٹھیک اسی طرح غموں کی موجوں نے میری زندگی کے سمندر کو ہمیشہ بے قرار رکھا جیسے کوئی میری فریاد سننے والا ہی نہ ہو۔

آواز جہاں گذشت کہ آخر خدا نبود
او آنچنان بزیست کہ گوئی خدانداشت
طغیانی نازبین کہ کوح مزاراو
ثبت است سال رحلت فانی خدانداشت

مذکورہ بالا رباعی کو بنیاد بنا کر فانی کی ذات پر مختلف النوع اعتراضات بھی وارد کیے گئے انھیں کمزور عقیدہ، کم ہمت اور بے صبر وغیرہ جیسے القابات سے بھی نوازہ گیا اور ان کی ذات کو زبردست تنقید و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا اور ان کو خالق کائنات سے منحرف ایک گناہ گار انسان تصور کیا گیا جیسا کہ محترمہ تاج بیگم مذکورہ بالا رباعی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''خدانداشت'' یہ ہی الفاظ فانی کی سب بڑی کمزوری پر دلالت کرتے ہیں ایک اچھے شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ غم ہستی کو شدید طور پر محسوس کرے لیکن بے صبرانہ ہو اور بے صبری کی حالت میں خالق ہستی کے وجود سے انکار نہ کر بیٹھے اور اس کی شان میں ناملائم و نازیبا کلمات زبان پر نہ لائے اس قسم کی بے صبری شخصی کمزوری اور تنگ ظرفی کو ظاہر کرتی ہے۔''5

لیکن فانی کی عملی زندگی محترمہ تاج بیگم صاحبہ کے مذکورہ بالا خیال کی تردید کرتی ہے ان کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ باور کرنے کو دل نہیں چاہتا ہے کہ وہ شخص جس نے تاعمر مصائب و مسائل کو فخریہ انداز میں برداشت کیا ہو، کبھی کسی کے در پر جبیں سائی کرنے کا گناہ گوارا نہ کیا خدا نے جس گردن کو بلند پیدا کیا وہ اس کو سیدھا خدا کے پاس ہی لے گئے شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی خلوتیں تسبیح و مصلی سے ہمیشہ آراستہ و پیراستہ رہیں جن کا ماننا یہ ہو کہ۔

درہا کشودہ از فقیر و از غنا
ماتم و شاد مردن در رنجور زیستن
بہ عنوان نفس رنجے زغیمم می رسدا ما
بہر فرمان غیمم می رسد از دوست پیغامی

وہ بھلا اس خالق کائنات کی شان میں ناشکری یا گستاخی بھلا کیسے کر سکتا ہے ان کا ہمہ کلام گواہ ہے کہ ان کے دل کی کلی کبھی متبسم نہ ہوئی اور نہ ہی کاتب قسمت کی جانب سے عطا کیے گئے رنج و تکالیف کے بحر بیکراں سے نجات حاصل کرنے کا کوئی راستہ پا سکے باوجود این ہمہ کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا۔

یا رب تری رحمت سے مایوس نہیں فانی
لیکن تیری رحمت کی تاخیر کو کیا کہیے

جس کو عرفان حق کی سعادت حاصل ہوگئی، بے نیازی و خود سپردگی جس کا شیوہ رہا ہو وہ کیونکر اس قدر برگشتہ خاطر ہو سکتا تھا کہ وجود پروردگار سے خائف بلکہ منحرف ہو جائے، بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے غم مسلسل اور چرخ بیدار گر کے یک بعد دیگر ظلم و ستم بعض اوقات انسان کو سودائی اور دیوانہ بنا دیتے ہیں صرف فانی ہی نہیں متعدد اساتذہ کے یہاں اس قسم کی متعدد مثالیں مل جائیں گی جن میں خالق کائنات سے شکوہ و شکایت کی گئی ہے مثلاً مرزا غالب نے شدت غم کی تاب نہ لا کر مندرجہ ذیل شعر کہا تھا۔

زندگی اپنی گر اس رنگ سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

لہٰذا صرف ان کی ایک رباعی کی بنیاد پر یہ کہنا کہ فانی کافر اور زندیق ہو گئے تھے اور وجود خالق کائنات سے انکار کر بیٹھے تھے، قطعاً بھی درست قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ انھوں نے تو ہمہ عمر اس راحت جہاں کو سراب اور بے حیثیت تصور کیا اور غموں کی تپش میں خود کو جلا کر ہیرا بنایا اور کہا۔

از راحت زمانہ جراحت عبارتست
آبی نوشتہ اندو سرابی نوشتہ ایم

ان جیسی ہستی سے یہ توقع کیونکر کی جا سکتی ہے کہ وہ خدائی کا منحرف ہو جائے اور کثرت غم کی تاب نہ لا کر اپنا توازن گنوا بیٹھے جنھوں نے لوگوں کو ہمشہ یہ سیکھایا اور بتایا ہو کہ راہ راست پر چلنا کسی ملک عظیم کا بادشاہ ہونے سے بھی زیادہ دشوار اور مشکل ہے۔

کج کن کلاہ خسروی دل بہ رغم ہوش
سہل است ہچو قیصر و فغفور زیستن

وہ کیونکر اتنے بڑے گناہ کا مرتکب ہو گیا بہر حال اس بحث سے صرف نظر کرتے ہوئے میں اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتی ہوں فانی کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خدا ترس انسان تھے اور قدم قدم پر انھیں خوف خدا دامن گیر رہتا تھا وہ صرف اپنے کردہ ہی نہیں بلکہ ناکردہ گناہوں کی معافی کے لیے بھی بارگاہ ایزدی میں سر بہ سجدہ نظر آتے ہیں اور بڑی ہی عاجزی و انکساری سے کہتے ہیں۔

بہ رنج خستگیم بخش و از گناہ مپرس
بگو کہ فانی عاصی زخستگان من است

فانی بدایونی کی فارسی غزلیات کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں عشق کا ہمہ گیر جذبہ بھی بڑی شدت کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے عشق میں عاشق صادق پر گزرنے والی ہر کیفیت اور رنگ ان کے یہاں موجود ہے، جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ عشق خواہ حقیقی ہو یا پھر مجازی اپنا ایک انفرادی رنگ رکھتا ہے فانی کے یہاں بھی عشق کا جذبہ الگ الگ حیثیتوں سے نظر آتا ہے لیکن ان کا عشق حقیقی ہو یا پھر مجازی پاکیزہ، پر لطف، باوقار اور سنجیدگی کا رنگ لیے ہوئے ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے لکھا ہے:

''انھوں نے جہاں عشق یا معشوق کا ذکر کیا ہے وہاں ٹھہرے اور سلجھے ہوئے بلکہ پاکیزہ اور بلند جذبات کی ترجمانی کی ہے...''6

ان کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے جن کو پڑھ کر بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دل کی گہرائیوں سے عشق کی نیرنگیوں کو محسوس کرتے ہیں بلکہ جذباتی بے ساختگی کے ساتھ سلیس انداز بیان کے پیرائے میں قاری

کو ہمہ تن متوجہ کر لینے کا سلیقہ بھی خوب جانتے ہیں ان کی فارسی غزل کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے۔

فتنہ عشق بہ دلہا بسر زد
حسن حالم بہ تماشا ارزد
شرر عشق کہ شعرشناسند
زدلم جست و بہ جانہا ارزد

فانی کا بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ابنائے دہر کی ناقدری وسردمہری کے ساتھ ساتھ عشق ومحبت کی ناکامیوں سے بھی غمگین ہونے کے بجائے لذت ومسرت حاصل کرنا سیکھا ہے عشق نے ہی ان کی نامکمل ذات کی تکمیل کی ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ غم عشق میں فراوانی دیکھ کر مایوسی وتلخی کا شکار ہونے کے بجائے خوشی وشادمانی محسوس کرتے ہیں اور یہی ان کے فارسی اور اردو کلام کی سب سے اہم اور نمایاں انفرادیت ہے جو ان کو یگانگت و انفرادیت بخشتی ہے:

''فانی کی زندگی عشق ہے اور راہ عاشقی میں اس کا ایک ہی تجربہ ہے وہ تجربہ ہے غم فانی کی شاعری میں اس تلخ تجربہ کا ایک انکشاف ہے ان معنوں میں فانی کے جذبات مستعار بہت کم ہیں....''[7]

فانی بدایونی کا مندجہ ذیل شعر سنیے جس میں وہ خود نعمت عشق کے لذت بخش احساس سے سرشار ہوکر کہہ اٹھتے ہیں کہ میرے لیے معشوق کا وصال تمام نعمتوں میں افضل ہے حتیٰ کہ مجھے جنت کی بھی خواہش باقی نہیں رہ جائے گی اگر قرب معشوق کی دولت سے میں سرافراز کردیا جاؤں۔

زلف دوست مرا نیمہ نگاہ بس است
متاع خلد نہ جویم کہ رائگاں من است

انھیں اپنے عشق پر بڑا ناز اور فخر ہے کیونکہ غم جاناں ہی کی بدولت وہ غم روزگار کو شکست دینے میں کامیاب ہو سکے یعنی ان کا ماننا ہے کہ وہ عشق کے بحر بیکراں میں غوطہ زن ہوکر ستم ہائے روزگار سے مکمل طور پر فراغت وفرصت پالیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بے اختیار ان کی زبان سے نکلتا ہے کہ شکر ہے کہ تیرے ناز وانداز اور بے نیازی وسردمہری میرے لیے مصیبت یا بلا نہیں ہیں بلکہ نعمت ہے کیونکہ اس کی بدولت مجھ کو ایسا درد جاودانی حاصل ہوگیا ہے جس کی کوئی دوا نہیں ہے اس لیے میں اپنے عشق اور معشوق کی بیوفائی کا بڑا احسان مند ہوں۔

نازم بہ جمال تو برق وبلا نیست
سازم بہ غم عشق کہ درد است ودوا نیست

بیشتر مواقع پر فانی کے عشق کا مفہوم عشق الٰہی سے تعبیر ہے۔ انھوں نے عشق الٰہی کو محض رسمی طور پر یا کسی کی تقلید میں نہیں اپنایا ہے بلکہ حوادث غم اور واقعات روح فرسا نے ان کے دل میں حقیقتاً خدا کی محبت کا شعلہ بھڑکا دیا تھا اور جب ان کے دلی جذبات شعر کی شکل اختیار کرتے ہیں تو ان میں ذرا سی بھی ظاہرداری، تصنع یا دکھاوا نہیں ہوتا ہے بلکہ حرف بہ حرف صداقت کی مہک آتی ہے بعض سہل پسند اور جانبدار قسم کے دانشوران ادب نے ان کے عشقیہ جذبات واحساسات یعنی صوفیانہ افکار و خیالات کو بے معنی، بے حیثیت اور تقلیدی کہہ کر ان کے پاکیزہ و بے لوث جذبوں کو درگزر کرنے کی کوشش ناکام کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا تصوف ان کے صوفی صادق ہونے کا ترجمان ہے جس نے ان کی شاعری کو ایک طہارت اور پاکیزگی عطا کی ہے کلیات فانی کے مرتب نے فانی کے عشقیہ جذبات کی تشریح وتوضیح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''فانی کی شاعری کا محور غم وعشق ہے عشق سے مراد عشق الٰہی ہے اور یہ ہی تصوف کی اساس ہے بعض معترضین نے فانی کے غم کی طرح ان کے تصوف کو بھی نمائش اور ہمت شکن تعلیم سے تعبیر کیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ نظر یہ تصوف نے اگر ایک طرف ان کو سہارا دیا تو دوسری طرف فلسفیانہ فکر بھی عطا کی ہے۔''[8]

ان کی ایک اور فارسی رباعی ملاحظہ کیجیے جس میں اہمیت انسانی کا فلسفہ اور زیادہ شدت کے ساتھ جلوہ گر ہے مضمون تو وہ ہی فرسودہ اور کہنہ ہے جو شاعروں کی طرف سے بارہا نظم کیا گیا ہے مگر فانی کے یہاں اچھوتے اسلوب کے سبب زیادہ خوبصورت، حسین اور دل کش محسوس ہوتا ہے۔

خاک پائے بندگان در گہہ عشقیم ما
ہر کجا صیدے بدام اوست صیاد من است
می ندانم تا بہ محشر اعتبار سجدہ چیست
ایں قدر دانم کہ ہیچ است وجبین زاد من است

مختصر یہ کہ مذکورہ بالا سطور میں فانی بدایونی کی فارسی شاعری کے متعلق جو کچھ بھی تحریر کیا گیا ہے اس کا مقصد صرف اس امر کی وضاحت کرنا ہے کہ فانی کو اردو زبان کی ہی طرح فارسی زبان پر بھی حاکمانہ قدرت اور دسترس حاصل تھی یہ درست ہے کہ ان کی فارسی شاعری کمیت کے اعتبار سے بہت ہی کم بلکہ نہ ہونے کے مترادف ہے لیکن ان چند اشعار کو بھی کسی بڑے فارسی کے کلام سے کم مرتبہ قرار نہیں دیا جا سکتا ہے اگر دست برد زمانہ کے سبب ان کا فارسی کلام ضائع نہ ہوا ہوتا تو بلا شبہ آج ان کو ایرانی شاعروں کی صف میں نمایاں مقام دیا جا سکتا تھا مگر افسوس کہ یہ ممکن نہیں ہو سکا البتہ ان کی فارسی شاعری کے متعلق اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ اس میں حلاوت، عذوبت موسیقیت، نغمگی اور جداگانہ انداز بیان ان کے قادرالکلام فارسی گو شاعر ہونے کا شاہد ہے مگر اس میں ان کے اردو کلام کی سی بے ساختگی نہیں ہے با این ہمہ ان کی فارسی غزلیات 'کہتر بہ قیمت بہتر' کی مصداق ہیں۔ اس میں نرمی، گھلاوٹ اور شیرنی کا جو احساس ملتا ہے وہ داخلی وخارجی، درد وغم کی تصویر کشی کے لیے بے حد مناسب وموزوں ہے لیکن ان کی ادبی اختراعات کا سکہ جس طرح سلطنت اردو میں چلتا ہے وہ فارسی کے قلمرو میں نہیں چل سکا بہرحال فانی کی اس خوبصورت رباعی کے ساتھ مضمون کو اختتام پذیر کرنے کی اجازت چاہتی ہوں۔

یارب صلہ رنج فراوانم
تعبیر حیات خواب سامانم کو
کو جلوہ کہ جان نذر بقائی تو کنم
قربان تو عید، عید قربانم

مآخذ ومصادر

1 ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی: فانی کی شاعر، سرفراز قومی پریس لکھنؤ، 1969، ص 123
2 ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی: فانی کی شاعری، سرفراز قومی پریس لکھنؤ، ص 66
3 پروفیسر عبدالشکور مرتب، فانی، فاروقی پریس لال کنواں، دہلی، 1947، ص 34
4 تاج بیگم: مضمون فانی، علی گڑھ میگزین فانی نمبر 1943، ص 152
5 ایضاً
6 ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی: فانی کی شاعری، ص 57
7 تاج بیگم: مضمون فانی، ص 152
8 ڈاکٹر ظہیر احمد مرتب: کلیات فانی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2009، ص 40

■

Dr. Neelofar Hafeez
Department of Urdu and Persian,
University of Allahabad,
Pryagraj -211002 (UP)
Mob.: 7500984444
neelofarhafeez82@gmail.com

شاذیہ عمیر

وقت کی نوک سے ٹپکتا لمحہ: بانی

بیسویں صدی اپنے ساتھ واقعات وحادثات کا ایک لامتناہی سلسلہ لے کر آئی جس کے زخم آج بھی کسی نہ کسی شکل میں تازہ ہیں۔ اس بھرم کو سینے سے لگائے وہ خوش آئند دنوں کے گیت گانے میں منہمک تھا کہ 1947 کے فسادات نے ایسا طوفان برپا کیا کہ اس کے خوابوں کا رنگ محل پلک جھپکتے ہی بکھرتا چلا گیا اور انسانی وجود نے یہ ثابت کردیا کہ اس کے اندر لاکھوں برس پہلے کا وہ حیوان ابھی زندہ ہے جو موقع ملتے ہی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہے۔

اس سانحے نے کتنے ہی لوگوں کو گھر سے بے گھر کردیا۔ بستیاں ویران ہوگئیں۔ شہر کا شہر تباہ وبرباد ہوگیا۔ تقسیم کی اس موج بلا نے محض پندرہ سال کی عمر میں راجندر دیپک کو ملتان سے اجاڑ کر دہلی کے ایک اجنبی ماحول میں بھٹکنے کے لیے مجبور کردیا جہاں نہ کوئی شناسا تھا اور نہ غم گسار، وہ محلّہ، وہ گلی، وہ چھت، وہ منڈیر وہ لوگ جنھیں دیکھ کر وہ جیتے تھے وقت کی آندھی نے آن کی آن میں سب کچھ نگاہوں سے اوجھل کردیا۔ باقی رہ گئے تو بس یادوں کے رستے زخم جس کی سوزش انھیں کسی طرح چین نہیں لینے دیتی اور جب اس کی شدت سے وہ موم کی طرح قطرہ قطرہ پگھلنے لگتے تو گلی گلی دیوانوں کی طرح ان مانوس چہروں کو تلاش کرتے رہتے جو نہ جانے کہاں کھو گئے تھے۔ کہتے ہیں۔

وہ مانوس سلونے چہرے جانے اب کس حال میں ہیں
جن کو دیکھ کے خاک کا ذرہ ذرہ آنکھیں ملتا تھا
کیسے لوگ تھے چاہتے کیا تھے کیوں وہ یہاں سے چلے گئے
گنگ گھروں سے کچھ مت پوچھو شہر کا نقشہ دیکھو تم

لہٰذا گھر ان کے لیے مستقل استعارہ بن گیا جس سے جدائی کا غم ان کے لیے ایک ایسا قیمتی اثاثہ تھا جسے تمام عمر امانت کی طرح انھوں نے اپنے دل کے نہاں خانے میں سجا کر رکھا اور مرتے دم تک اس سے دست کش نہ ہوسکے۔

نہ کوئی جاکے اسے دکھ مرے سنائے گا
نہ کام دوستی اب شہر بھر کی آئے گی
ڈھلے گی شام جہاں کچھ نظر نہ آئے گا
پھر اس کے بعد بہت یاد گھر کی آئے گی

یوں بے گھری کے جان لیوا عذاب نے انھیں بھری دنیا میں تنہا کردیا لیکن یہ تنہائی تو ہر نابغہ کا مقدر ہے اس سے مفر کہاں۔ ناصر کاظمی کو بھی تقسیم ہند کے بعد ویران اداس بنجر دنوں کا جب سامنا کرنا پڑا تو بے اختیار ہو کر یہ کہہ اٹھے کہ۔

تنہا تنہا پھرتے ہیں دل ویراں آنکھیں بے نور
دوست بچھڑتے جاتے ہیں شوق لیے جاتا ہے دور

بانی نے اکیلے پن کے جاں گسل لمحے کو شعر کے پیکر میں یوں پیش کیا ہے۔

دن کو دفتر میں اکیلا شب بھرے گھر میں اکیلا
میں کہ عکسِ منتشر ایک ایک منظر میں اکیلا

لیکن یہی تنہائی بانی کے لیے ایک ایسا عطیہ ثابت ہوئی جس کی ضوفشانی میں ان کی نگاہوں نے وہ وہ کچھ دیکھ لیا جہاں پہنچ کر تخیل کے پر بھی جل اٹھتے ہیں۔ یوں ان کی ذات اور ہم زاد کے بیچ وہ فاصلہ رونما ہوا جس نے راجندر دیپک سے انھیں راجندر منچندا بانی بنادیا۔ بقول من موہن تلخ:

''1958 میں جب میرا پہلا مجموعۂ کلام 'چراغ فکر' شائع ہوا تب تک بانی بانی نہ تھا بلکہ راجندر دیپک تھا......ہوسکتا ہے کہ بانی اپنے کلام میں کسی ایسے رنگ اور انداز بیان کی تلاش میں تھا جو بعد میں نئی ڈکشن کے نام سے اس کے ساتھ منسوب کیا گیا۔''

(آج کل، دسمبر1981)

بانی کو اس بات کا بھی ادراک تھا کہ وہ کوئی عام شاعر نہیں لیکن ان کا زمانہ انھیں پہچاننے سے قاصر ہے اور یہ دکھ بانی ہی کیا اپنے عہد کے بیشتر شاعروں کا دکھ ہے جب میر جیسے خدائے سخن اور غالب جنھیں نجم الدولہ دبیر الملک کے خطاب کے باوجود زمانے کی بے التفاتی کا رنج اٹھانا پڑا تو بانی کو اس سے فرار کہاں تھا۔ مجتبیٰ حسین ان کا قلمی چہرہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بانی اکثر اپنے دوستوں سے کہتے ہیں:

''بھئی بانی صاحب کو تم جانتے بھی ہو وہ کیوں اس طرح کے مشاعروں میں جانے لگے۔ بانی صاحب کو لوگوں نے سمجھ کیا رکھا ہے۔ بانی صاحب کا اپنا ایک الگ مقام ہے۔''

(آدمی نامہ، مجتبیٰ حسین، ص174، 1981، حسامی بک ڈپو، حیدرآباد)

اس عرفان وادراک نے انھیں ایسی بینائی عطا کی کہ وہ اپنی ذات سے نکل کر خود کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے پر قادر ہوگئے۔ فلسفے کی زبان میں جسے The Other اور اردو شاعری میں جس کا ذکر ہم زاد کے طور پر بار بار آتا ہے اور جسے تیسری آنکھ کا بھی نام دیا گیا ہے، اس تیسری آنکھ سے خود کو دیکھنے کے تجربے کو جدید غزل میں بخوبی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اشعار دیکھیے۔

بانی نے محض آسمانی ڈرامے کو ہی اپنی نگاہوں کا مرکز ومحور نہیں بنایا بلکہ ان کے کلام کا مطالعہ کریں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک جان ہار پجاری کی طرح انھوں نے زمین کی ہر خوشبو، ہر آہٹ اور ہر لمس کو منظر بہ منظر اپنے دل کی دھڑکن اور روح میں اتار لیا ہے۔

تو جسم کے اندر ہے کہ باہر ہے کدھر ہے
علوی مری جاں کب سے تجھے ڈھونڈ رہا ہوں

اب ظفر اقبال کا استفسار ملاحظہ کیجیے۔

میرے اندر وہ میرے سوا کون تھا
میں تو تھا ہی مگر دوسرا کون تھا

اسی دوسرے کی تلاش کرتے کرتے راجندر دیپک کو وہ شخص ملا جسے اردو دنیا بانی کے نام سے جانتی ہے اور جب راجندر دیپک کی ملاقات بانی سے ہوئی تو یہ تجربہ ان کے لیے خوشی وغم کا وہ مقام اتصال تھا جب پُرنم آنکھوں کے ساتھ مسکراہٹ کی ایک مہین سی لکیر لبوں پر آویزاں ہوجاتی ہے یعنی آگہی کا ایسا تابندہ لمحہ وجود پذیر ہوا جو اشعار میں ڈھل کر اس طرح لَو دینے لگا۔

مرے بدن میں پگھلتا ہوا سا کچھ تو ہے
اک اور ذات میں ڈھلتا ہوا سا کچھ تو ہے
بدن کو توڑ کے باہر نکلنا چاہتا ہے
یہ کچھ تو ہے یہ مچلتا ہوا سا کچھ تو ہے
مرے وجود سے جو کٹ رہا ہے گام بہ گام
یہ اپنی راہ بدلتا ہوا سا کچھ تو ہے

ایک الگ ذات میں ڈھلنے اور راہ بدلنے کے اس تجربے نے بانی کو وہ جرأت عطا کی کہ ایک ایسے سیال موضوع کو انھوں نے گرفت میں لینے کی کاوش کی جو بقول شہریار۔

عجیب چیز ہے یہ وقت جس کو کہتے ہیں
کہ آنے پاتا نہیں اور بیت جاتا ہے

وقت کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے ہمیشہ سے عارف، صوفی اور فن کار کوشاں رہے ہیں۔ عام آدمی اسے ٹکڑوں اور خانوں میں تقسیم کرکے سمجھتا ہے یعنی ماضی، حال او مستقبل کے روپ میں اور پھر اس کی چھوٹی اکائی صبح، شام اور رات کے خانے میں بانٹ کر۔

لیکن وقت کے بیکراں روپ سے جب بانی متعارف ہوئے تو ان کے اندر ایک کہرام برپا ہوا تھا اور وقت کے ابتداء وانتہا کے بیچ عدم سے وجود تک اور پھر وجود سے عدم تک کی ایک پوری داستان فلم کی طرح ان کے سامنے رقص کرنے لگی اور بانی خود بھی اس لامحدود کہانی میں تجربے کا ایک کردار بن کر شامل ہوگئے۔

سیر شب لامکاں اور میں
ایک ہوئے رفتگاں اور میں
سانس خلاؤں نے لی سینہ بھر
پھیل گیا آسماں اور میں
خاک وخلا بے چراغ اور شب
نقش ونوا بے نشاں اور میں

سیر شب بانی کو یوں محسوس ہوا جیسے یہ کائنات وجود سے واپس عدم کی طرف مراجعت کرگئی ہو اور کائنات میں سوائے صفر کے کچھ بھی موجود نہ ہو۔ اور وہ خود بھی اس کا ایک حصہ بن کر اس کی ذات میں فنا ہوگئے ہوں، لیکن دوسرے ہی لمحے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ع

سانس خلاؤں نے لی سینہ بھر

تو دراصل خلا کا سانس لینا عدم سے دوبارہ وجود کی طرف کائنات کا قدم بڑھانا ہے یوں زمین وآسمان کے دوبارہ جنم لینے کے ساتھ بانی کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا بھی نیا جنم ہوا ہے۔ گویا زندگی اور موت کے تجربے کو وہ ذرے سے لے کر کہکشاں تک میں اپنی تیسری آنکھ سے دیکھنے کی سعادت حاصل کرلیتے ہیں اور اپنے اشعار میں اس تجربے کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

زماں مکاں تھے مرے سامنے بکھرتے ہوئے
میں ڈھیر ہوگیا طول سفر سے ڈرتے ہوئے
دکھا کے لمحۂ خالی کا عکس لاتفسیر
یہ مجھ میں کون ہے مجھ سے فرار کرتے ہوئے
میں ایک حادثہ بن کر کھڑا تھا رستے میں
عجب زمانے مرے سر سے تھے گزرتے ہوئے

پہلے شعر میں زماں ومکاں کے بکھرنے کا ذکر ملتا ہے اور شاعر اس بکھراؤ کے دیدار سے خود بھی ڈھیر ہوکر رہ گیا ہے۔ دوسرے شعر میں لفظ لمحۂ خالی پر غور کریں تو یہ خالی لمحہ دراصل تخلیق کا منبع ہے تبھی تو اس کا عکس ایسا جاوداں اور لامحدود ہے کہ جس کی تفسیر نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ کچھ نہ ہونا دراصل ہونے کی دلیل ہے۔ یہ کائنات بھی عدم سے ہی وجود میں آئی ہے۔ اگر عدم نہ ہو تو وجود بھی ایک واہمہ ہوجائے گا۔ بقول وزیر آغا:

’’عدم اور وجود ایک ہی دائرے کی دو کروٹیں ہیں۔ اس دائرے میں عدم کی یہ خاصیت ہے کہ اس میں طویل عرصہ تک مکمل انجماد قائم رہتا ہے لیکن پھر ایک فطری اصول کے تحت اس کے بطن میں پہلا تحرک پیدا ہوجاتا ہے... گویا کائنات وجود، عدم اور وجود کے دائرے کا نام ہے۔‘‘

(اردو شاعری کا مزاج، وزیر آغا، ص32-431، سیمانت پرکاشن، نئی دہلی2000)

تیسرے شعر میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانے کے بیک وقت ایک اکائی کے طور پر دیدار کا تجربہ شامل ہے۔ اس طرح وقت کے بیکراں ولامحدود روپ نے بانی کو لرزہ براندام کردیا۔ یوں آگہی کے کرب سے وہ کراہ بھی رہے ہیں اور اسے تخلیق کے پیکر میں ڈھال کر ایک انوکھی مسرت سے بھی ہم کنار ہیں۔ نیز وقت کے لامحدود روپ کے دیدار اور ذرے سے لے کر کہکشاں تک کی داستان کو وہ اپنی گرفت میں لینے پر قادر نظر آتے ہیں۔ لیکن ایسے بے پناہ آفاقی شعور (Cosmic Consciousness) کو اشعار کے پیکر میں ڈھالنا کوئی اتنا آسان کام نہیں۔ یہ بانی کی گہری نگاہ اور لامحدود شعور ہے جس نے ایک ایسے موضوع کو شعر کا پیکر عطا کیا جس کے بارے میں سوچنے سے ہی ذہن خالی اور زبان گنگ ہوجاتی ہے۔

حیرت اس بات پر ہے کہ بانی نے محض آسمانی ڈرامے کو ہی اپنی نگاہوں کا مرکز ومحور نہیں بنایا بلکہ ان کے کلام کا مطالعہ کریں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک جان ہار پجاری کی طرح انھوں نے زمین کی ہر خوشبو، ہر آہٹ اور ہر لمس کو منظر بہ منظر اپنے دل کی دھڑکن اور روح میں اتار لیا ہے۔ اور یہی نہیں انھوں نے گوشت پوست کے دھڑکتے پھڑکتے وجود سے محبت بھی کی اور اس سے جدائی کا غم بھی سہا۔ اشعار دیکھیے۔

تمام راستہ پھولوں بھرا ہے میرے لیے
کہیں تو کوئی دعا مانگتا ہے میرے لیے

تمام شہر ہے دشمن تو کیا ہے میرے لیے
میں جانتا ہوں ترا در کھلا ہے میرے لیے
وہ ایک عکس کہ پل بھر نظر میں ٹھہرا تھا
تمام عمر کا اب سلسلہ ہے میرے لیے

اب جدائی کے دکھ نے انھیں کیسا جاں بہ لب کردیا ہے، کچھ اس کے رنگ ملاحظہ کیجیے۔

کوئی کھڑا ہے مری طرح بھیڑ میں تنہا
نظر بچا کے مری سمت دیکھتا ہے بہت
جانے وہ کون تھا اور کس کو صدا دیتا تھا
اس سے بچھڑا ہے کوئی اتنا پتہ دیتا تھا

علاوہ ازیں قدرت کے حسین منظر نے انھیں کیسی سرشاری عطا کی ہے کہ ہوا، بادل چاند ستارے، برگ سبز، شاخ تر، ڈوبتی ہوئی شام، سمندر کا کنارا، شفق کی لالی، تتلی کے پروں کے رنگ، گھٹاؤں کا بکھرنا، چاند کی روپہلی کرن، گلاب رتوں کی شادابی، بارش کے قطروں سے سیراب ہوتے درختوں کی قطار در قطار، موتی کے دانے کی طرح بکھرے شبنم کے قطرے، بیلے کے پھولوں کی طرح مہکتے آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ، سنہری دھوپ میں گل بوٹوں پر گن گن کرتے بھنوروں کی ہر سنگیت، پیلی سرسوں کے کھیت میں لہراتی ہوئی پروائی، خوشبو کی مہکار، چڑیوں کی چہکار اور ایسے کتنے ہی مناظر ہیں جو بانی کے یہاں قطار در قطار کھڑے اپنا حسن بکھیرتے نظر آتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بانی ان تمام مناظر کو گھونٹ گھونٹ مشروب کی طرح اپنے اندر اتار رہے ہوں، جس نے ان کے کلام میں ایسی تر و تازہ اور شاداب کیفیت پیدا کردی ہے جس کے مطالعے سے قاری ایک عجیب سی کیفیت میں گرفتار ہو جاتا ہے اور سرشاری کی ایک روسی اس کے وجود میں سرایت کر جاتی ہے۔

خلا کے سارے رنگ سمیٹنے والی شام
شب کی مژہ پر خواب سجانے والا میں
فضا کا پہلا پھول کھلانے والی صبح
ہوا کے سر میں گیت ملانے والا میں
چھتوں پہ بارش دور پہاڑی ہلکی دھوپ
بھیگنے والا پنکھ سکھانے والا میں
شہر خزاں ہے زردی اوڑھے کھڑے ہیں پیڑ
منظر منظر نظر چھپانے والا میں

ایک فطری بے قراری نے بانی کو کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ ان کی تمام عمر مسافرت میں گزری۔ لہٰذا ان

ایک فطری بے قراری نے بانی کو کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ ان کی تمام عمر مسافرت میں گزری۔ لہٰذا ان کے کلام میں ایسی علامتوں کا ذکر بار بار آتا ہے جس کا مقدر ہی حرکت و حرارت ہے۔ ان میں ایک لفظ 'پانی' ہے۔ پانی جو کسی مقام پر ٹھہرتا نہیں۔ ازل سے ابد تک اس کا مقدر بے قراری ہے۔

کے کلام میں ایسی علامتوں کا ذکر بار بار آتا ہے جس کا مقدر ہی حرکت و حرارت ہے۔ ان میں ایک لفظ 'پانی' ہے۔ پانی جو کسی مقام پر ٹھہرتا نہیں۔ ازل سے ابد تک اس کا مقدر بے قراری ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ایک دریا میں دوبارہ پیر نہیں ڈالا جا سکتا۔ کیونکہ اس کا پانی ہر وقت بدلتا رہتا ہے۔ بانی بھی ہمہ وقت سفر میں رہے، ذات کے اندر بھی اور ذات کے باہر بھی۔ لہٰذا لفظ 'پانی' لاشعوری طور پر ان کے کلام میں جابجا نظر آتا ہے۔

پیہم موج امکانی میں
اگلا پاؤں نئے پانی میں

آج اک لہر بھی پانی میں نہ تھی
کوئی تصویر روانی میں نہ تھی

دیکھیے کیا کیا ستم موسم کی من مانی کے ہیں
کیسے کیسے خشک خطے منتظر پانی کے ہیں

اسی طرح پرندے سے بھی انھیں خاص ربط تھا کیونکہ پرندہ بیک وقت زمین و آسمان دونوں سے جڑا ہوتا ہے۔ وہ زمین سے رزق حاصل کرتا ہے لیکن اس کی اڑان آسمان کی طرف ہوتی ہے اور پھر ایک قوس سی بنا کر زمین کی طرف لوٹ آتا ہے۔ لہٰذا اس کی واپسی ایک نئی بشارت، ایک نئی امید کی کرن پیدا کرتی ہے اور یہی امید بانی کے لیے جہان معنی کے نئے در وا کرتی ہے۔

اڑ چلا وہ، اک جدا خاکہ لیے سر میں اکیلا
صبح کا پہلا پرندہ آسماں بھر میں اکیلا

ڈھانپ لیا سارا آکاش پرندے نے
کیا دل کش منظر تھا پَر پھیلانے کا

مست اُڑتے پرندوں کو آواز مت دو کہ ڈر جائیں گے
آن کی آن میں سارے اوراقِ منظر بکھر جائیں گے

شہر زندگی کی ریاکاری، تصنع، صارفیت اور خود غرضی کو دیکھ کر دکھ کی ایک شدید لہر انھیں اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ انسان کا ظاہر اور باطن ایک دوسرے سے اتنا الگ کیوں ہے۔ آخری دنوں میں جب وہ خود کو موت کے قریب محسوس کرنے لگے تو ایک نوع کے حزن و ملال نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ بظاہر رشتوں میں گھرے رہنے کے باوجود ہر پل ہر لمحہ ان کا تنہا بسر ہوا۔ کمال یہ ہے کہ اس کے باوجود زندگی سے گہرے رشتے میں ان کے یہاں کبھی دراڑ پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر محض 49 سال کے مختصر عرصے میں انھوں نے دنیا کو الوداع کہا لیکن اتنی کم مدت میں اردو شاعری کو وہ اثاثہ فراہم کر گئے جس کے لیے ایک زمانہ احسان مند رہے گا۔ حالانکہ بہت سے لوگوں کو اعتراض ہے کہ ان کا شعری سرمایہ بہت مختصر ہے جبکہ ایک ضخیم دیوان بھی ترتیب دیا جا سکتا تھا۔ میرے خیال میں دیکھنا یہ چاہیے کہ شاعر نے جو سرمایہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے اس کی کیفیت و ماہیت کیا ہے۔ کیا ان کی شاعری آفاقی شعور سے مزین ہے یا ہنگامی موضوعات کا ڈھیر ہے۔ اس پیمانے پر جب ہم ان کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو تخیل اور لفظیات دونوں اعتبار سے ان کا کلام ایک ایسے اچھوتے دیار سے ہمیں روشناس کراتا ہے جس کی درخشندگی نہ صرف اپنے عہد بلکہ آنے والے زمانے کے لیے بھی مشعل راہ ثابت ہوگی۔

ماخذ و مصادر

1. حرف معتبر، بانی، یونین پریس، نئی دہلی، 1971
2. حساب رنگ، ایضاً، 1976
3. شفق شجر، ایضاً، شعرستان، نئی دہلی، 1982
4. کلیات بانی، گلشن ہاؤس، لاہور، 2013
5. غزل کا نیا منظر نامہ، شمیم حنفی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1981
6. جدید اردو غزل 1940 کے بعد، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، 1995
7. اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب، گوپی چند نارنگ، این سی پی یو ایل، 2002

Dr. Shazia Omair
Asst. Prof., Dept of Urdu
Delhi University
Delhi- 110007
drshaziaomair@gmail.com

جنوبی ہند میں فکرِ غالب کا مینار
علامہ شاکر نائطی

ابوبکر ابراہیم عمری

جنوبی ہند خصوصا تامل ناڈو میں مرزا اسد اللہ خان غالب کے فکر و فن کی آبیاری میں علامہ ابوصالح غضنفر حسین شاکر نائطی (1967-1899) کا اسم گرامی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ علامہ کے علاوہ مولانا عبدالرحیم فاروقی اور مولانا امانی پلکنڈوی بھی قابل ذکر ہیں۔

آپ کی پیدائش شہر میسور میں ہوئی، تعلیم مدرسہ لطیفیہ ویلور میں حاصل کی جہاں سے آپ کی فراغت 1919 میں ہوئی۔ جامعہ دار السلام عمر آباد کا قیام 1924 کو ہوا اور غالبا 1925 میں بحیثیت شیخ الادب آپ کا تقرر عمل میں آیا۔ جامعہ سے ایسا تعلق استوار کیا کہ اپنی آخری سانس تک خدمت کر کے اسی زمین میں مدفون ہوئے۔

شاکر نائطی کو کئی علوم پر مہارت حاصل تھی، لیکن آپ کی وجہ شہرت ادیب و شاعر اور استاد ادب کی تھی۔ جامعہ دار السلام عمر آباد کی ادبی آبیاری میں آپ نے اہم کردار ادا کیا۔

نظم و نثر دونوں میں آپ کو قدرت نے ید طولیٰ عطا فرمایا تھا۔ مشہور ماہنامہ 'مصحف عمر آباد' آپ کی ادارت میں 1935 تا 1940 شائع ہوتا رہا جس میں برصغیر کے مایہ ناز قلم کار اور نامور شعرا اپنی تخلیقات خصوصی طور پر ارسال فرمایا کرتے تھے۔ طبیعت میں فطری طور شاعری کا ذوق پایا تھا۔ باقاعدہ کسی سے تلمذ حاصل نہیں کیا ،شاعری میں آپ نے پیر خم خانہ سخن مولانا ناطق گلاوٹھی سے استفادہ کیا ورانھیں اپنا استاد مانا لیکن مولانا ناطق گلاوٹھی جیسا استاد شاعر اور بقول جگر مرادآبادی 'بے رحم نقاد' نے کبھی بھی آپ کو اپنا شاگرد نہیں جانا بلکہ ہم پلہ سمجھا۔

مولانا محمد زکریا ادیب خاور عمری راوی ہیں فرماتے ہیں کہ "مدراس کے ایک مشاعرے میں شاکر نائطی نے جب اپنے استاد کا تعارف مجھ سے کرایا تو علامہ ناطق نے کہا: بھئی۔ بات دراصل یہ ہے کہ نہ میں استاد ہوں، نہ یہ شاگرد ہیں" اس پر علامہ ناطق کی دلیل یہ تھی کہ "ایک ایسا شخص جو عربی و فارسی ادب میں مجھ سے بڑھ کر ہے، کیسے شاگرد ہو سکتا ہے۔ البتہ ہم دونوں ایک دوسرے کے استاد ہیں، کبھی میں ان سے کسی معاملے میں مشورہ کر لیتا ہوں اور وہ کبھی" (پیکر علم و ادب علامہ شاکر نائطی: مرتب، مولانا محمد رفیع کلوری عمری، ص 51)

مولانا حبیب الرحمٰن زاہد اعظمی عمری فرماتے ہیں کہ "مولانا ناطق اردو کے کسی بڑے سے بڑے شاعر کو خاطر میں نہیں لایا کرتے تھے مگر ہمارے مولانا کی شاعری کے بڑے مداح تھے اور آپ کو اردو زبان کا صف اول کا شاعر تسلیم کرتے تھے۔" (حوالہ سابق، ص 30)

مولانا ناطق نے حضرت مولانا نفیس بنگلوری جو کہ جلیل مانک پوری کے شاگرد تھے کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان میں شاکر نائطی کا تذکرہ بڑی اپنائیت اور بڑے احترام سے کیا ہے۔ متفرق خطوط کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

مورخہ 9 جون 1946 کے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں۔ "بہر حال مجھے اس کا ہمیشہ خیال رہتا ہے کہ جب تک زندان حیات میں مقید رہوں مولانا شاکر نائطی کو اور آپ کو میری کوتاہ قلمی مایوس نہ کرے مگر خدا جانے کیا ہو جاتا ہے کہ ہوتا وہی ہے جو میں نہیں چاہتا، تو آپ لوگوں سے یہی کہنا ہے کہ میری واگذاشتوں پر درگزر سے کام لیا کیجیے اور دعا کیجیے کہ خدا جلد آپ لوگوں سے ملائے۔"

ایک اور خط میں مولانا ناطق نے شاکر نائطی کا خیریت نامہ موصول نہ ہونے پر افسوس اور تشویش کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

مورخہ 13 جنوری 1946 کے خط میں لکھتے ہیں "میں یہ بات افسوس کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ مولانا شاکر نائطی کا ہنوز خیریت نامہ نہیں آیا میں نے خود ہو کر بھی انھیں ایک خط لکھا تھا اس کا جواب نہیں ملا... میرے یہاں ان کا شمار اب عام احباب میں نہیں وہ مجھے بہت عزیز ہیں اور ان کی بے توجہی سے مجھے تکلیف ہوتی ہے، آپ کو ان کا کچھ حال معلوم ہو تو ضرور لکھیے۔" (افادات نفیس، مرتب: سلیم بینائی عمری)

شعر گوئی کے حوالے سے ہر شاعر کا اپنا نظریہ ہوتا ہے جس کی بنا پر اس کی شعری کائنات قائم ہوتی ہے، شاکر نائطی کی شاعری میں مقصدیت پائی جاتی ہے، ان کا خیال ہے کہ اچھی اور معیاری شاعری کو دوام حاصل ہوتا ہے اس کے برخلاف سطحی اور غیر معیاری کلام اپنے آپ مر جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے فنی و فکری سرمایے کی منتقلی کے لیے صنف غزل کو اپنا وسیلہ بنایا ہے، علاوہ ازیں تاریخی قطعات، قطعات اور چند نظمیں بھی کہی ہیں جو کمیت میں مختصر ہونے کے باوجود آپ کی استادانہ مہارت کی عکاس ہیں۔

جنوبی ہند خصوصا علاقہ مدراس میں جب آتش و ناسخ کی پیروی کو اصل شاعری سمجھا جا رہا تھا وہاں پر انھوں نے اردو شاعری کو وہ موڑ دیا جو کہ غالب کی فکر اور اس کے آہنگ سے قریب تھا۔ شاکر نائطی غالب کو بڑا شاعر گردانتے تھے، غالب کی فکر کو انھوں نے اس علاقے میں عام کیا اور اپنے شاگردوں کا ایک بڑا جال بچھا دیا۔ کاظم نائطی لکھتے ہیں:

"آپ نے تمل ناڈو کے شعر و ادب کو نئی فکری سمتوں سے آشنا کراتے ہوئے ایک ایسا موڑ دیا کہ 'غالب اسکول' کے نام سے شروع ہو کر، اگر مبالغہ نہ ہو تو 'شاکر اسکول' پر ختم ہوتا ہے۔ مولانا شاکر نے سیکڑوں شاگردوں کو غالب کی فکری آفاقیت اور تخلیقی ہنرمندیوں کے ڈھنگ اور آداب سیر و شناس کیا۔"

(پیکر علم و ادب علامہ شاکر نائطی۔ مرتب، مولانا محمد رفیع کلوری عمری، ص 60)

شاکر نائطی غالب کو شاعر اعظم سمجھتے تھے، دیگر شعرا کے کلام سے کلام غالب کا موازنہ کر کے اس کی انفرادیت ثابت کرتے تھے۔ آپ کے پاس غالب کی شاعری پر کوئی بھی اعتراض نہ معقول تھا اور نہ مقبول، شاکر نائطی کے شاگرد مولانا عبدالرشید عمری ادھونی فرماتے ہیں:

"مرزا غالب آپ کے پسندیدہ شاعر تھے، غالب کے نہ صرف مداح تھے بلکہ اردو زبان کا شاعر اعظم سمجھتے تھے، شاعر ہی نہیں غالب کو مفکر و مدبر اور حکیم اور دانشور بھی مانتے تھے۔ کلام غالب کی خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے تھکتے نہیں تھے اور مختلف شعرا کے کلام کا موازنہ کرتے ہوئے غالب کی انفرادیت کو ثابت کرتے تھے۔ غالب کی شاعری پر کوئی اعتراض آپ کے یہاں معقول و مقبول نہیں ہوتا تھا۔ معترض چھوٹا ہوتا تو اسے 'بونا' تصور کرتے اور بڑا ہوتا تو اس کے اعتراض کو 'غالب شکنی' پر محمول کرتے۔" (ایضا، ص 11-10)

شاکر نائطی شاعری میں غالب کا ہم پلہ کسی کو نہیں مانتے تھے، یہاں تک کہ علامہ اقبال اور غالب کے درمیان یہ فرق روا رکھتے تھے۔ بقول مولانا ثناء اللہ عمری

ایم اے عثمانیہ ''اقبال کو اصطلاحی معنوں میں شاعر نہیں گردانتے تھے، جیسے غالب کو مانتے تھے، بلکہ پیامبر یقین کرتے تھے۔'' (ایضاً،ص 90)

وہ اپنے شاگردوں میں سے جن کے اندر شعر کہنے کی صلاحیت دیکھتے تو خاص طور پر ان کی جانب توجہ مبذول فرماتے اور ان کی فکری وفنی آبیاری کی پوری کوشش فرماتے۔ مولانا ابوالبیان حماد عمری فرماتے ہیں:

''طلبہ میں شعروادب سے دلچسپی پیدا کرنا، ان کی مناسب رہنمائی کرنا، انھیں اونچا اٹھانے کی کوشش کرنا، ان کے کلام پر اصلاح دینا، اور ان کی فنی خوبیوں کو تلاش کر کے ایسی ہمت افزائی کرنا کہ طالب علم اپنے اندر ایک مضبوط خود اعتمادی محسوس کرے، یہ سارے کام اس خوبی، خوشی اور خوش اسلوبی سے فرماتے کہ گویا یہ آپ کے فرض منصبی ہوں۔'' (ایضاً، ص 22)

شاکر نائطی کا ماننا تھا کہ راست طور پر شاعر کے کلام کے مطالعے سے معانی وافکار کی جو گیرائی حاصل ہوتی ہے وہ شروحات سے ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں آپ کے مایہ ناز شاگرد مولانا حبیب الرحمٰن زاہد عمری اپنا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں ''ایک مرتبہ آپ نے اردو زبان وادب میں ترقی کے تعلق سے ناچیز کو یہ قیمتی مشورہ دیا کہ 'دیوان غالب' کا گہرائی سے مطالعہ کیا کرو۔ پھر کچھ عرصہ بعد آپ نے اس سلسلے میں دریافت فرمایا تو بندے نے پورے ادب واحترام کے ساتھ عرض کیا کہ آپ کی ہدایت پر برابر عمل پیرا ہوں، مگر غالب کے بعض اشعار کے معنی ومفہوم سمجھ سے بالاتر ہیں۔ استاد محترم نے نہایت محبت کے ساتھ فرمایا کہ ''اس میں قصور غالب کے اشعار کا نہیں، بلکہ تمہارے ناپختہ ذہن کا ہے، پڑھو اور مسلسل پڑھتے رہو تو کچھ عرصے بعد ان اشعار کا مطلب خود بخود سمجھ میں آنے لگے گا۔'' (ایضاً، ص 35)

شاکر نائطی شاعری میں استادی کے مقام پر فائز تھے، استادانہ مہارت کے باوجود 'صنف نعت' سے اپنے آپ کو دور رکھا۔ آپ کے دیوان میں صرف ایک نعت بطور تبرک شامل ہے۔ غالب جیسے عظیم المرتبت شاعر نے بھی صنف نعت سے دوری رکھی ہے۔ بجز ایک فارسی نعت کے کوئی مکمل کلام دستیاب نہیں ہے۔ غرض غالب نے جن بھی وجوہات کی بناپر اس صنف سے دوری اختیار کی ہو، علامہ کے نزدیک یہ ایک مبارک صنف ہے جس میں حددرجہ احتیاط کی ضرورت ہے ورنہ حبط اعمال کا خوف لگا رہتا ہے۔

غالب کی ابتدائی شاعری میں فارسی لفظیات کا استعمال خوب ملتا ہے اور وہ فارسی تراکیب کو برتنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے تھے۔ علامہ نے بھی اپنی شاعری میں فارسی لفظیات اور تراکیب کو بڑے سلیقے اور قرینے سے استعمال کیا ہے۔ آپ نے فارسی کی آمیزش کو اتنا ہی گوارا کیا جتنی کسی شے میں قند یعنی شکر کی ضرورت اور اہمیت ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

شاکر پسند ہے جو تجھے لذت زباں — اردو نمک کے ساتھ ملا فارسی کی قند

چند اور اشعار ملاحظہ فرمائیں جن میں علامہ نے فارسی کی لفظیات اور تراکیب کا استعمال عمدہ پیرایہ میں کیا ہے۔

تقدیر ہی سب کچھ سہی، تدبیر بھی کچھ ہے — بے ربطی کردار پہ قسمت کا گلہ ہیچ
ہنوز شورِ فغاں شورشِ جہاں میں ہے گم — ہوا نہ رازِ محبت کچھ آشکار ہنوز
اک زحمت بے جا ہے یہاں فکرِ مداوا — زائل نہیں ہوتا مرضِ عشق دوا سے

مولانا سید زکریا ادیب خاور عمری نے علامہ کی شاعرانہ عظمت کو ثابت کرتے ہوئے آپ کو غالب سے یوں جوڑا ہے۔ رقم طراز ہیں ''طرزِ ادا کی جو جدت غالب کے کلام میں ہے، شاکر کے یہاں اس سے زیادہ ملتی ہے، شوخ نگاری، عشق ومحبت کا والہانہ پن، زندگی کا حکمت آمیز پہلو، شاکر کی شاعرانہ بصیرت پر دلالت کرتا ہے۔ کلام میں جو تازگی، مضامین میں تنوع اور فسوں کاری ملتی ہے وہ شاکر کو غالب سے بہت قریب کردیتی ہے۔

شاکر نائطی اسلوبِ غالب کے بڑے مداح 'دیوانِ شاکر' میں کئی ایک غزلیں غالب کی زمین میں ملتی ہیں، جن میں لفظیات اور فکر کی بھی کہیں کہیں یکسانیت نظر آتی ہے۔ شاکر نائطی کی چند غزلوں کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ غالب کی غزل کا حسنِ مطلع ملاحظہ ہو۔

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک

شاکر نائطی نے گیارہ اشعار پر مشتمل ایک طویل غزل اسی زمین میں کہی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کیسے کاٹیں گے شبِ غم کو سحر ہونے تک — ہم پہ کیا گزرے گی یہ معرکہ سر ہونے تک
ڈر کسی کا نہیں ساری شبِ غم اپنی ہے — خوب رولے دلِ ناکام سحر ہونے تک

(دیوان شاکر، ص 110)

غالب کی ایک اور غزل کا مطلع ملاحظہ ہو۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے — ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

اسی بحر میں ان کے یہاں بھی ایک لاجواب غزل ملتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہے کوئی چیز، حاصل دنیا کہیں جسے — اس کے سوا کہ بادہ و مینا کہیں جسے
ہوں سب میں اور سب سے جدا سب سے بے نیاز
میں ہوں بھرے جہان میں تنہا کہیں جسے

(دیوان شاکر، ص،41)

غالب کا حسنِ مطلع ملاحظہ فرمائیں۔

گر تجھ کو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ — یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ

شاکر نے اس زمین پر ایسی غزل کہی ہے جو آپ کی استادانہ عظمت کی دلیل ہے، غزل کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہو مانگنا تو مانگ، مگر ناروا نہ مانگ — بے شک خدا سے مانگ، مگر ماسوا نہ مانگ
جینے سے فائدہ نہیں مرنے کی فکر کر — تو زہر مانگ چارہ گروں سے دوا نہ مانگ

(دیوان شاکر، ص:86)

غالب کا حسنِ مطلع ملاحظہ فرمائیں۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

غالب کی اس زمین پر شاکر نائطی نے اپنی فکری پرواز کی اس طرح اڑان بھری ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

چارہ کار ہوا حد سے سوا ہوجانا — اب مرے درد کو آیا ہے دوا ہوجانا
یہ بتانے کی نہیں بات جتانے کی نہیں — خود بہ خود چاہیے اظہار وفا ہو جانا

(دیوان شاکر، ص:32)

شاکر نائطی نے غالب کی زمین میں کئی غزلیں کہی ہیں اور اپنی فنی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے، اور اپنے تخیل کی کہکشاں کو روشن کیا ہے۔ غرض شاکر نے جنوب میں غالب کو ایک نئی زندگی عطا کی ہے، اور اپنے شاگردوں کے وسیلے سے ملک و بیرونِ ملک غالب کے فکری سرمایے کو منتقل کیا ہے۔

■

Dr. Abubakar Ibraheem Umri
3/6 Mulla Street, Cross, Pernambut
Vellore, Dist. Tamilnadu
Pin:365810
ibraheemumari@gmail.com

شخصیات

راز کا شعری جہاں

اکمل نعیم صدیقی

اردو زبان وادب کے ارتقائی سفر پر نظر ڈالی جائے تو ہم پاتے ہیں کہ ادب کی مختلف اصناف کا کسی نہ کسی دور میں غلبہ رہا ہے۔ دکن کے ادبا نے جہاں مثنویوں کو اپنے ذوق سخن کے لیے منتخب کیا وہیں مرثیے کو بھی عروج بخشا۔ اس کے بعد مرثیے کو انیس و دبیر نے بلندیوں تک پہنچا دیا۔ سودا اور ذوق جیسے شعرا نے قصیدے میں طبع آزمائی کی اور اسے عروج عطا کیا۔ شمالی ہند میں ہی مثنوی کو میر حسن جیسا قادر الکلام شاعر ملا جس نے اس صنف کو بلندیوں تک پہنچایا۔

ترقی پسندوں نے نظم کو اپنی تحریک کا آلہ کار بنایا اور اس صنف نے بہت فروغ پایا۔ جدید دور میں مشرق کے تتبع میں نظم کی ہیئت کے ساتھ بہت سے تجربات کیے گئے اور اس کے بندھن ڈھیلے کرتے کرتے اسے بالکل آزاد ہی کر دیا گیا۔ ردیف، قافیہ اور بحر کو سرے سے نکار دیا گیا۔ یہ وہی دور ہے جب غزل کی گردن بے تکلفی سے اڑانے کی بات کہی گئی اور اسے بے وقت کی راگنی اور نیم وحشی صنف قرار دیا گیا۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ قلی قطب شاہ سے لے کر آج تک اردو ادب کی مقبول ترین اور چہیتی صنف سخن کی بات کی جائے تو سب کی زبان پر برجستہ غزل کا نام آتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ غزل کی روایت ہر دور میں زندہ رہی ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا رہا اردو ادب کی دوسری اصناف اپنی مقبولیت کھوتی رہیں لیکن غزل کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ غزل کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ جو لوگ اردو زبان نہیں جانتے وہ بھی اس کے شیدائی ہیں۔ دنیا کے ہر خطے میں آپ کو غزل کے چاہنے والے مل جائیں گے۔ برصغیر ہند و پاک میں تو غزل کا ہر کوئی دیوانہ ہے۔ راجستھان جیسا خشک سال علاقہ بھی اس کے جادو سے خود کو نہ بچا سکا۔ راجستھان کا ایک بہت خوبصورت شہر، شہر آفتاب یعنی جودھپور بھی غزل کی آبیاری میں ہمیشہ پیش پیش رہا ہے۔ جودھپور سے تعلق رکھنے والے شعرا کی ایک طویل فہرست ہے۔ اس فہرست میں ایک نام بہت نمایاں ہے اور وہ نام ہے ایم اے غفار راز۔

ڈاکٹر ضیا نے اپنی تصنیف 'مارواڑ میں اردو' میں ان کا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "جناب ایم اے، غفار راز کا شمار جودھپور کے برگزیدہ شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ کے کلام کی عظمت کا لوہا ہندوستان کے بڑے بڑے شعرا اور ناقدین نے مانا ہے، جن میں کمار پاشی، مخمور سعیدی، سالک عزیزی، کالی داس گپتا رضا، کے ڈی خان مونس، شین کاف نظام، نامور سنگھ، ندا فاضلی، افتخار امام صدیقی، موہن لال کول، اثر اجمیری اور راہی شہابی کے نام شامل ہیں۔ راز جودھپوری کی پیدائش 14 نومبر 1931 کو جودھپور میں ہوئی۔ آپ کے والد جناب عبد المغنی مہاراجہ امر سنگھ والی جودھپور کے سیلون انچارج تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم جناب ننھے خاں، پھر ان کے صاحبزادے عبد الباری تنہا اور شرف الدین یکتا کی نگرانی میں ہوئی۔ حالانکہ آپ گھریلو حالات کی وجہ سے تعلیم مکمل نہیں کر سکے لیکن ادبی سنگت نے آپ کے اندر ایسی رنگت بھر دی جس کی وجہ سے آپ فن شاعری میں ماہر ہوئے۔ طبیعت موزوں تھی ہی لہٰذا کسی استاد کی اصلاح کے محتاج نہیں رہے اور 'وقت ہی شاگرد اپنا، وقت ہی استاد ہے' کی طرز پر حالات نے آپ کو سب کچھ سکھا دیا۔ زندگی جینا بھی اور تصویر شاعری میں رنگ بھرنا بھی۔"

کسی بھی شعر یا غزل کا محاسبہ ہم مختلف زاویوں سے کر سکتے ہیں۔ فنی اعتبار سے کسی غزل یا شعر کے محاسن و عیوب پر تنقید کی جا سکتی ہے یا اس کے مرکزی خیال کی اہمیت، ندرت اور انداز بیان کی خصوصیات سے بحث کی جا سکتی ہے۔ شاعر کے کلام میں اس کی شخصیت کے مظاہر تلاش کیے جا سکتے ہیں تو اس کی سوچ و فکر، خیالات اور مختلف موضوعات کے تعلق سے اس کا نقطۂ نظر کیا ہے اس پر بھی غور کیا جا سکتا ہے کیونکہ ہر شاعر کا اپنا نقطۂ نظر ہوتا ہے جو اس کے کلام میں دانستہ اور نادانستہ طور پر شامل ہو ہی جاتا ہے۔ مضامین کی ندرت، پرانے مضامین کو نئے اور انوکھے انداز میں پیش کرنا، نئی اصطلاحات وضع کرنا اور شعر میں کسی مضمون کو کس طرح سے باندھا گیا ہے ان سب کی بنیاد پر کسی شاعر کے کلام کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی انھیں علمیاتی اور وجودیاتی تصورات میں منقسم کرتے ہیں۔ راز صاحب کی شاعری میں یہ دونوں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یعنی ان کی شاعری وجودیاتی تصورات اور علمیاتی تصورات کی کسوٹی پر پوری اترتی ہے۔

راز صاحب کے کلام کا بیشتر حصہ ایسی غزلوں پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے چھوٹی بحروں پر غزل کی بنیاد رکھی ہے۔ درحقیقت کم الفاظ اور چھوٹی بحر میں معنی خیز بات کہنا کسی ہنر سے کم نہیں ہے اور یہی اردو غزل کا خاصہ بھی ہے۔ جو بات مقرر ایک طویل تقریر کے ذریعے کہتا ہے وہی بات شاعر محض ایک شعر کے ذریعے زیادہ موثر

انداز میں کہہ دیتا ہے۔ راز صاحب کو یہ ہنر بخوبی آتا ہے۔

آپ اکثر وہ بات کہتے ہیں　　جو نہ کہنے کی بات ہوتی ہے
ہم تو یوں بھی یقین کر لیتے　　کس لیے آپ نے قسم کھائی
اف یہ کیسا ستم ہو گیا　　درد پہلے سے کم ہو گیا

راز صاحب کے کلام کا ایک نمایاں وصف 'الفاظ کی تکرار' بھی ہے۔ وہ اپنے اشعار میں الفاظ کو مکرر استعمال کرتے ہوئے ان کے حسن کو ہی دوبالا نہیں کرتے بلکہ اس سے معنویت بھی پیدا کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

راز توبہ، میری آج توبہ　　نذر جام و سبو ہو گئی ہے

اس شعر کے پہلے مصرعے میں لفظ 'توبہ' کی تکرار محض تکرار نہیں ہے بلکہ معنی خیز بھی ہے اور یہی اس مصرعے کا حسن ہے۔ وہ توبہ کرتے ہوئے اپنی گذشتہ توبہ کی بات کر رہے ہیں جو کہ جام و سبو کی نذر ہو گئی۔

منزل ہے میری دور، مجھے دور ہے جانا　　بھیگی ہوئی پلکوں سے نہ اب مجھ کو صدا دے

مندرجہ بالا شعر کے پہلے مصرعے میں لفظ 'دور' کی تکرار ہے۔ اس لفظ کے ذریعے جہاں انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ ان کی منزل دور ہے وہیں وہ دوبارہ اسی لفظ کے ذریعے سے یہ بھی بتا رہے ہیں کہ انھیں اس منزل تک پہنچنا بھی ہے۔ اسی طرح ایک شعر اور ہے۔

جو خود ہی راز اپنی راہبر ہو　　وہی دیوانگی، دیوانگی ہے

اس شعر میں لفظ 'دیوانگی' کی تکرار وضاحت کے لیے استعمال کی گئی ہے یعنی یہ بتایا ہے کہ اصل دیوانگی کسے کہتے ہیں۔ وہیں مندرجہ ذیل شعر پر بھی غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں لفظ 'مشکل' کی تکرار دراصل 'تقریباً ناممکن امر' کی جانب اشارہ کرنے کے لیے استعمال کی گئی ہے۔

راز اس دور میں مشکل ہے بہت مشکل ہے　　میر و غالب سا کوئی دوسرا پیدا ہونا

راز صاحب کے کلام میں ایک قسم کی کشش پائی جاتی ہے اور اس کی وجہ ان کی سادہ بیانی ہے۔ وہ بہت ہی آسان اور عام فہم الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے مضمون کو موثر طریقے سے بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں دقیق الفاظ کا استعمال متروک ہے۔ وہ سامعین اور قارئین کی علمی لیاقت کا امتحان نہیں لیتے ہیں بلکہ بڑی سادگی، برجستگی، نرمی اور آہستگی کے ساتھ اپنی بات اس انداز سے کہہ جاتے ہیں کہ اشعار سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں۔

آؤ ہم بیچ کی نکالیں راہ　　آپ اور تو کے بیچ میں تم ہے

اس شعر میں کتنی سادگی کے ساتھ انھوں نے ایک بہت ہی معنی خیز بات چند الفاظ میں بیان کر دی ہے۔ ان کے اسی انداز میں بیان کے کچھ اور نمونے دیکھیے۔

دیکھ کر مجھ کو تو مسکراتا ہے کیوں　　کیا تیری اور میری جان پہچان ہے
ایک تم ہی نہیں ہو پریشاں فقط　　راز دنیا ہی ساری پریشان ہے
سب ہمیں سے کہہ رہے ہیں عشق سے باز آئیے　　کیوں نہیں لیتا ہے کوئی ان کو سمجھانے کا نام
یہ نہ ہونا چاہیے جو منھ میں آیا کہہ دیا　　بات کرنی چاہیے انساں کو انساں دیکھ کر

پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں شاعر کا یہ کہنا کہ ''کیا تیری اور میری جان پہچان ہے'' وہیں دوسرے شعر میں شاعر کو خود یہ کہتے ہوئے تسلی دینا کہ تم اکیلے نہیں بلکہ ساری دنیا ہی پریشان ہے، معصومیت سے پر ہے۔ اسی طرح تیسرے شعر کا دوسرا مصرع 'کیوں نہیں لیتا ہے کوئی ان کو سمجھانے کا نام' تو بالکل بچوں کی سی سادگی اور معصومیت کا مظہر ہے۔ عموماً جب بچوں کو ڈانٹا یا سمجھایا جاتا ہے تو ان کی یہی شکایت ہوتی ہے کہ صرف مجھے ہی کیوں نصیحت کی جا رہی ہے یا مجھ پر ہی تنبیہ کیوں کی جا رہی ہے اس کو بھی تو کچھ کہو۔ اسی طرح چوتھے شعر میں 'جو منھ میں آیا کہہ دیا' جیسے عام سے محاوراتی جملے کے عمدہ استعمال سے بڑی سادگی کے ساتھ ایک عمدہ پیغام پیش کیا ہے۔

راز نے غالب کے کئی مضامین کو بھی اپنے اسی انداز میں سادگی کے پیکر میں ڈھال کر پیش کرنے کی سعی کی ہے مثلاً غالب کا ایک شعر ہے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اسی مضمون کو راز نے اس انداز سے باندھا ہے۔

درد دل بڑھ گیا حد سے جب دوستو　　درد ہی درد دل کی دوا ہو گیا

راز کے یہاں انداز بیان ہی سادہ نہیں ہے بلکہ بہت سے مضامین بھی سادہ اور عام ہیں لیکن ان کو نظم کرنے کا انداز ان کو خاص بنا دیتا ہے۔

آل احمد سرور کہتے ہیں کہ ''غزل کا آرٹ اشاروں کا آرٹ ہے اور یہ اشارے بڑی بڑی داستانوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔'' یہ حقیقت ہے کہ ردیف و قافیہ کے علاوہ اشارے اور کنایے میں کسی موضوع کا بیان ہی شعر کو نثر سے ممتاز کرتا ہے۔ اچھی شاعری انسانی جذبات اور کیفیات کی مرصع کاری کا کام بھی بخوبی انجام دیتی ہے۔ راز کی شاعری میں یہ خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ایک شعر دیکھیے۔

بارہا ایسا ہوا ہے کہ تیری بزم سے میں　　اٹھ کے جاتا ہوں مگر لوٹ کے آ جاتا ہوں

اس شعر میں شاعر نے اپنی قلبی کیفیت یعنی قلب کی بے چینی اور اضطراب کی بہترین عکاسی کی ہے۔ ایک شعر اور دیکھیں۔

نہ ملا کوئی بھی مفہوم سمجھنے والا　　اشک بن کے میری آنکھوں میں سوالات رہے

یہ حقیقت ہے کہ ہر شاعر کا اپنا اسلوب ہوتا ہے۔ یہ اسلوب اس کی شناخت قائم کرنے اور اسے دوسروں سے ممتاز کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی موضوع کو بہت سے شاعر اپنے اشعار کے ذریعے پیش کرتے ہیں اور ان سب کا جداگانہ انداز بیان ہی ان کے شعر میں جدت اور تاثر پیدا کرتا ہے۔ راز بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

یہ طلبگار نہیں قافیہ پیمائی کی　　شاعری آپ سے اسلوب نیا مانگے ہے

انھوں نے بھی اپنی شاعری میں روایتی مضامین کو جگہ دی ہے لیکن اپنے انداز میں، جس وجہ سے ان کے اشعار میں تازگی پیدا ہو گئی ہے۔ بقول مخمور سعیدی ''راز کی غزل فکر کی تازگی لیے ہوئے ہے اور نئی لفظیات کی بھی حامل ہے۔''

نشاط عیش و مسرت سے کھیلنے والو　　غم حیات سے نسبت نہیں تو کچھ بھی نہیں
ذرا سنبھال کے رکھنا تو اپنی توبہ کو　　ہر ایک موڑ پہ زاہد شراب خانہ ہے
میری بربادیوں پہ ہنسنے والو یہ حقیقت ہے　　بنا غم کے تو کوئی صاحب عرفاں نہیں ہوتا

اسلوب میں الفاظ کی ترتیب اور ان کے انتخاب کا سلیقہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور اسی پر اسلوب کا دارومدار بھی ہے۔ سوئفٹ، اسلوب کی تعریف میں کہتا ہے کہ ''صحیح لفظ، صحیح جگہ پر''۔ الفاظ کا انتخاب، ان کی ترتیب اور ان کا باہمی ربط و تعلق ہی موضوع اور معنی کو جنم دیتا ہے اور یہی کسی جملے یا شعر کا خاصہ ہے۔ راز کا بھی اپنا اسلوب ہے۔ وہ بہت مدھم اور نرم لہجے میں اپنی بات کہتے ہیں لیکن وہ جو کہتے ہیں

اس کی گونج بہت تیز سنائی دیتی ہے۔

تعلقات بڑھانا تو سہل ہے لیکن — تعلقات نبھانا بہت ہی مشکل ہے
الفت کا اپنی اثر دیکھتا ہوں میں — جو بات ہے ادھر وہ ادھر دیکھتا ہوں میں

غالب کے خطوط پڑھتے ہوئے اس امر کی صداقت کا احساس ہو جاتا ہے کہ انھوں نے یقیناً مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔

لیکن یہ سب کچھ شعر کے ساتھ اس طرح گتھا ہوا ہے کہ قاری کو پڑھنے میں مزہ دیتا ہے۔ یہاں جو بات سب سے اہم ہے وہ یہ کہ اس سب کے باوجود، ان کے اشعار سادگی اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتے اور چھوٹی بحروں کا ساتھ بھی ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ بقول طرب میرٹھی ''راز کا سب سے نمایاں وصف ان کی سادہ مزاجی اور سادہ بیانی ہے۔''

غزل کے لغوی معنی حسن و عشق کی باتیں کرنا بھی مانا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جس شعر میں حسن و عشق اور عاشق و معشوق کا تذکرہ ہوا سے خالص غزل کا شعر کہا جاتا ہے۔ راز کے یہاں بھی خالص غزل کے اشعار کثرت سے موجود ہیں۔ اس طرح کے اشعار میں شاعر مختلف صنعتوں کا استعمال کرتے ہوئے انھیں خوب صورت اور پر لطف بناتا ہے۔ اس ضمن میں راز صاحب کے یہاں بھی خوب صورت تشبیہات و استعارات کا استعمال ملتا ہے۔ ان کی تشبیہات آس پاس کی موجودات سے ہی جنم لیتی ہیں خصوصاً قدرتی مناظر اور قدرتی اشیا سے وہ شبیہ حاصل کرتے ہیں اور شعر میں نگینے کی مانند جڑ دیتے ہیں۔ ان کے اشعار میں لفظوں کا عمدہ انتخاب اور ان کی بہترین ترتیب سے شعر میں وہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ قاری اور سامع متاثر ہوئے بنا نہیں رہ پاتا۔ اس ضمن میں کمار پاشی لکھتے ہیں کہ ''ایم اے غفار راز غزلیہ شاعری کی روایت کے پاسدار ہیں۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ اردو مرکز سے دور رہ کر بھی انھوں نے کلاسکی غزل سے اپنے ذہنی اور جذباتی رشتے کو قائم رکھا ہوا ہے۔ فنی نکات پر گرفت مضبوط اور طبیعت رواں ہو تو ڈھلے ڈھلائے مصرعے ہاتھ باندھے سامنے آجاتے ہیں۔''

طول شب فراق کی اف ری سیاہیاں! — اکثر گماں ہوا تیری زلف دراز کا

اس شعر میں راز صاحب نے 'شب فراق کی طوالت' کو معشوق کی سیاہ زلف کی لمبائی سے تشبیہ دی ہے۔ شب کو زلف سے تشبیہ دینا عام بات ہے مگر 'طول شب فراق' اور 'زلف دراز' کی مشابہت الگ لطف پیدا کر رہی ہے۔ پھر پہلے مصرع میں 'اف ری' کے اضافے سے جو تاثر پیدا ہو رہا ہے وہ شعر کے حسن میں مزید اضافہ کر رہا ہے۔ اسی طرح دوسرے مصرع میں لفظ 'اکثر' بھی اس مصرع کو پر لطف اور موثر بنا رہا ہے۔

راز صاحب نے یوں تو بہت سے روایتی اور غیر روایتی استعارات سے اپنے اشعار کو مزین کیا ہے۔ ان میں گھر، کمرہ، کھڑکی، زاہد، شراب خانہ، ریت، سوکھے پتے، برف، ندی، پہاڑ وغیرہ شامل ہیں۔

زندگی بن کے پہاڑوں سے اترنے کے لیے — برف کا جسم تھا ہر لمحہ پگھلتا ہی رہا
کھڑکی کی نگاہوں میں ہیں کمرے کے مناظر — مشرق میں تو مغرب کی ہوا آتی نہیں ہے

مگر استعارات کے ضمن میں ایک بات اور قابل غور یہ ہے کہ ان کے اشعار میں آپ کو گھر کا استعارہ جابجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ ان کا محبوب ترین استعارہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی وجہ ان کا تعمیراتی کام ٹھیکیداری سے جڑاؤ ہونا ہو۔

دوسری صنعتوں کا استعمال بھی وہ بڑی چابک دستی کے ساتھ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر تلمیح کے اشعار دیکھیں۔

راز صاحب کے شعری مجموعے 'خوشبوئوں کا سفر' کے مقدمے میں شین کاف نظام رقم طراز ہیں کہ ''ہمارا معاشرہ علم سے زیادہ عبرت حاصل کرنے والا ہے اور عبرت ممانعت و ممنوعات کے راستے کھولنے والی چیز ہے۔ ان اور ایسی دوسری وجوہ سے ہمارے یہاں شاعری میں Quatability کو مستحسن سمجھا جانے لگا، اقوال زریں کے منظوم بیان کو شعری معراج تصور کیا جانے لگا اور Pseudo-Philosophical باتوں کو شاعری کی دلیل سمجھا جانے لگا۔''

کب اپنے غلاموں سے کوئی پیار کرے ہے — یہ بات تو یوسف کا خریدار کرے ہے
حسن نادم بھی ہے اور مغرور بھی — نور بھی ہے کبھی شعلہ طور بھی

متضاد الفاظ کے استعمال سے بھی شاعر اپنے اشعار میں حسن پیدا کرتے ہیں۔ راز کے یہاں بھی یہ روایت پائی جاتی ہے۔

کیا کہیں دے گئی کیا تیری اک نظر — مرہم زخم بھی دل کا ناسور بھی
واللہ کیا ادا ہے میرے دل نواز کی — سلجھائے اپنے گیسو تو الجھا دیا مجھے

مضامین کے اعتبار سے بھی راز صاحب کی شاعری تازگی لیے ہوئے ہے۔ ان کا شمار جودھپور کے ان شعرا میں کیا جاتا ہے جنھوں نے اس سرزمین میں حقیقت پسندانہ شاعری کی ابتدا کی۔ ان کے یہاں محض خام خیالی نہیں ہے۔ وہ انسان کی ترقی کے حامی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ کردار کی پاکیزگی اور ذہن کی سادگی کو بھی از حد ضروری گردانتے ہیں۔

شاعر حساس طبیعت کا مالک ہوا کرتا ہے۔ وہ اپنے معاشرے کے حالات سے آنکھیں نہیں چرا سکتا۔ راز نے بھی اپنے معاشرے میں جو دیکھا اور محسوس کیا اس کو اشعار کا جامہ پہنا کر آئینے کی شکل میں معاشرے کے سامنے رکھ دیا۔

اے راز جودھپور کے لڑکے شریر ہیں — اس شہر میں نہ شیشہ گری کی دکان کر
ریل پیل کتنی ہے شہر میں مگر لوگوں — کاٹنے کو دوڑے ہے زندگی کا سوناپن

راز صاحب کے شعری مجموعے 'خوشبوؤں کا سفر' کے مقدمے میں شین کاف نظام رقم طراز ہیں کہ ''ہمارا معاشرہ علم سے زیادہ عبرت حاصل کرنے والا ہے اور عبرت ممانعت و ممنوعات کے راستے کھولنے والی چیز ہے۔ ان اور ایسی دوسری وجوہ سے ہمارے یہاں شاعری میں Quatability کو مستحسن سمجھا جانے لگا، اقوال زریں کے منظوم بیان کو شعری معراج تصور کیا جانے لگا اور Pseudo-Philosophical باتوں کو شاعری کی دلیل سمجھا جانے لگا۔'' ایم اے غفار راز کے کلام میں بھی آپ کو ایسی شاعری کے نمونے جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔

سر نیاز جھکا بھی لیا تو کیا حاصل — خلوص دل سے عبادت نہیں تو کچھ بھی نہیں

ڈاکٹر ضیا اپنی تصنیف 'مارواڑ میں اردو میں' رقم طراز ہیں کہ ''راز صاحب کے یہاں روایت سے محبت کے ساتھ ساتھ جدیدیت سے بھی الفت نظر آتی ہے، آپ روایت کی محبت میں اتنے بھی غرق نہیں ہیں کہ جدیدیت کے جلوے نظر ہی نہ آئیں اور جدیدیت کے جلووں میں اس قدر گم نہیں ہیں کہ روایت کا راستہ ہی بھول جائیں، دونوں ہی چیزوں کا احترام اور اعتراف آپ کے یہاں پایا جاتا ہے۔'' اس ضمن

میں کے. ڈی. خان مونس اجمیری فرماتے ہیں: ’’کلاسیکی ادب کا انھوں نے ہمیشہ دل سے احترام کیا مگر عصری رجحانات سے روگردانی بھی مناسب نہیں سمجھی، روایت کے امین بنے رہے مگر روایت پر ہی قناعت نہیں کی۔‘‘

راز صاحب کے کلام میں جہاں ایک اور روایتی رنگ دیکھنے کو ملتا ہے جس میں زاہد و واعظ پر لعن تعن ہے، دیر و کعبہ اور شراب خانہ ہے اور شاعر غم عشق کا حریص نظر آتا ہے تو وہیں بعد کے دور کی شاعری میں ایک نمایاں تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس ضمن میں شین کاف نظام لکھتے ہیں کہ ’’بہت ممکن تھا کہ راز ایسے ہی موضوعات کے اسیر ہو کر رہ جاتے لیکن شکر کا مقام ہے کہ انھوں نے لکیر کا فقیر بننے کی بجائے اپنے تخلیقی راستوں کو کھلا رکھا۔ اسی کھلے پن نے ان کی شاعری کو ان کے ہم عصروں سے مختلف بھی کیا اور ممتاز بھی۔‘‘

شام کی سیڑھیاں چڑھ کر سورج
رات کے گھر میں اتر جاتا ہے

مردہ جسموں سے لپٹ کر کوئی روئے کب تک
پھوٹ کر روئیں اگر جسم کوئی زندہ ملے

زندگی تجھ سے ملاقات نہیں ہوتی ہے
شام کے بعد بھی اب رات نہیں ہوتی ہے

یوں تو ملنے کو ہر یک موڑ پہ مل جاتی ہے
زندگی تجھ سے مگر بات نہیں ہوتی ہے

کوئی مجھ کو سمجھ نہیں پایا
کیا میں راز خط ہڑپا ہوں

مخمور سعیدی بھی اس تبدیلی کی جانب نشاندہی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ’’ابتدا میں وہ غزل کی سال خوردہ روایات کی گرفت میں تھے لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے فکر و فن کے عصری تقاضوں کو پہچانا اور ان سے اپنا رشتہ استوار کیا۔ اب ان کی غزل فکر کی تازگی لیے ہوئے ہے اور نئی لفظیات کی حامل بھی ہے۔ راز صاحب نے جدید لب و لہجے کو فیشن کے طور پر اختیار نہیں کیا ہے بلکہ ان کے یہاں یہ عمل فطری طور پر نمو پذیر ہوا ہے۔

راز صاحب کی جدید شاعری میں نئے مضامین ہیں، فکر کی تازگی ہے، لفظیات کی جدت ہے اور استعارات میں نیا پن ہے۔ ان کے اشعار کسی رواں دواں دریا کی مانند ہیں کہ جس میں کہیں کوئی اٹکاؤ اور بھٹکاؤ نہیں ہے بلکہ ایک خوبصورت نظارہ ہے اور کانوں کو بھلی لگنے والی موسیقیت ہے۔ ان کے کلام میں یہ تبدیلی دراصل دانستہ طور سے کی گئی سعی نہیں ہے بلکہ فطری طور پر نمودار ہوئی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار مصنوعی نہیں لگتے بلکہ قاری کو متاثر کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ بقول راہی شہابی ’’راز کی شاعری ایک صاحب فکر و نظر کے مشاہدات و محسوسات کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے اردو کلاسیکی اسلوب کو دور حاضر کے مسائل کا ذریعہ بنایا۔ اس آمیزش نے ان کی شاعری کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔‘‘

غزل جذب و خیال، متنوع موضوعات کا حیرت کدہ اور جہانِ معانی کا آئینہ خانہ ہے۔ غزل میں زندگی کی سی وسعت ہے جس طرح زندگی اپنے اندر تمام موسم، رنگ، واقعات، جذبات، تحریکیں، چہرے، نظریے اور رویے سمو لینے پر قادر ہے۔ اسی طرح غزل بھی ان سب عناصر کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ پیکر تراشی اس ضمن میں شاعر کو بہت معاونت کرتی ہے۔ پیکر شاعری کا وہ طاقتور لسانی عنصر یا اظہار کی موثر صورت ہے جو شاعر کے اندرون کو قاری یا سامع کے سامنے مکمل اور موثر طور پر منکشف کر دیتی ہے کیونکہ اس سے تصور و خیال کی چلتی پھرتی تصویریں آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں۔ شاعر کا نصب العین اپنے اندرون کا اظہار ہوتا ہے اس لیے پیکر کو شاعر کی شخصیت کا آئینہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ راز صاحب کے یہاں بھی پیکر تراشی کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

مذہب کے تعلق سے راز صاحب کا تصور بہت سیدھا اور صاف ہے۔ وہ اپنے ظاہر و باطن کی صفائی پر دھیان دینے کی بات کرتے ہیں۔

یہ دیر و کعبہ کی باتیں ہیں بعد کی اے راز
میں اپنے دل کے نگر کا مطالعہ کر لوں

انھیں ذات، برادری اور رنگ و نسل کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم گوارا نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

انسان کو جو ذات کے خانوں میں بانٹ دے
ہوگا خدا مگر وہ ہمارا خدا نہیں

حالانکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ذات اور نسل کو صرف انسانوں کی پہچان کا ذریعہ بتایا ہے۔ اس کی بنیاد پر کسی کی تذلیل یا خود پر فخر کرنا بے وقوفی ہے۔ خدا کی نظر میں افضل اور اعلیٰ شخص وہ ہے جو متقی اور پرہیزگار ہے۔ وہ خدا میں یقین رکھتے ہیں تبھی کہتے ہیں۔

جو لوگ خدائی کا کیا کرتے تھے دعویٰ
ملتا ہی نہیں ان کا کہیں نام و نشاں تک

وہ اپنا محاسبہ کرنے اور غور و فکر کرنے کی جانب توجہ بھی دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ دنیا میں ہماری ذلت اور پستی کی وجوہات کیا ہیں ورنہ ہمارے عقبی بھی تو اسی دین کے پیروکار تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے دنیا بھر کی عزت اور بڑی بڑی حکومتوں سے نوازا تھا۔

ہم کیوں ذلیل و خوار ہیں ہے سوچنے کی بات
وہ ہم نہیں رہے، کہ ہمارا خدا نہیں

راز صاحب کے اشعار میں زندگی کا فلسفہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ فلسفہ بہت سیدھا سادہ ہے۔ وہ ایک دردمند دل رکھتے ہیں اس لیے انھیں دنیا کے سود و زیاں کی پرواہ نہیں ہے بلکہ ان کی نظر میں تو زندگی کا مقصد دوسروں کی مدد کرنا ہے۔ وہ انسان اور انسانیت کی فلاح و بہبودی کا جذبہ دل میں رکھتے ہیں۔ انھیں سب سے محبت ہے چاہے وہ دوست ہو یا دشمن۔

وہ عقل بھی اے راز بھلا عقل ہے کوئی
محدود رہی جو فقط سود و زیاں تک

زندگی ہے دوسروں کے غم میں کام آنے کا نام
شمع کی مانند جلنے اور پگھل جانے کا نام

مجھ کو تجھ سے الفت ہے تجھ کو مجھ سے نفرت ہے
وہ تیری کہانی ہے یہ میری کہانی ہے

راز صاحب کے کلام کا ایک اور خاصہ ہے ان کے اشعار میں ہندی زبان کے الفاظ کا خوب صورت استعمال۔ ہندی الفاظ کے استعمال سے وہ اپنے شعر کو نہ صرف خوبصورت بناتے ہیں بلکہ اسے معنویت بھی عطا کرتے ہیں۔

اردو شاعری میں ایسے شعر کہنے کی روایت رہی ہے جس میں شاعر اپنی یا اپنے کلام کی تعریف خود بیان کرتا ہے۔ اسے تعلّی کہا جاتا ہے۔ تو آیئے چلتے چلتے راز صاحب کے چند وہ خوبصورت اشعار بھی دیکھتے چلیں جو تعلّی کی شکل میں ہیں۔

کتنے لوگوں کے دلوں پر ہے حکومت ان کی
راز صاحب تو مقدر کے سکندر نکلے

نہ ہو کیوں کر غزل پہ ناز اپنی
میرا انداز ہے میرا بیاں ہے

ابر و انور قول و بیکس رمزی و قاضی کبیر
مرحبہ کہنے لگے مجھ کو غزل خواں دیکھ کر

■

Akmal Naim Siddiqui
Partap Nagar
Jodhpur- 342003 (Rajasthan)
Mob.: 9413844624
vedandquraan@gmail.com

مظفر حنفی
کی شاعرانہ انفرادیت

محمد اسرار

مظفر حنفی کا شمار اردو کے مشہور و معروف شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ اسلوب کے لحاظ سے بلا شبہ ایک صاحب طرز شاعر قرار دیے جاسکتے ہیں۔ جو باتیں انھیں دوسروں سے ممتاز یا منفرد کرتی ہیں ان میں ان کی شاعری کا انداز، کھنک دار تیکھا لہجہ، اور زور بیان ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ کسی کی تقلید نہیں کرتے بلکہ خود انھوں نے ایک نیا انداز پیدا کیا ہے۔ یوں تو شاعری صدیوں سے ہو رہی ہے اور اکثر نقاد یہ بھی کہتے ہیں کہ مضامین کا تنوع بہت کم شعرا کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس اعتبار سے بھی مظفر حنفی کی شاعری قابل توجہ قرار پاتی ہے کہ ان کے پاس مضامین کی کمی نہیں۔ وہ پرانے مضامین کو نئے انداز سے کہنے کا ہنر بھی رکھتے تھے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ دوسروں سے کم متاثر ہوئے اور لوگوں کو زیادہ متاثر کیا۔ بلا شبہ تین چار نسل ان کی شاعری پڑھ کر متاثر ہوئی اور اس بات کا قائل ہونا پڑا کہ مظفر حنفی واقعی جدید لب ولہجہ کے ایک بہترین اور نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بات کو سیدھے انداز میں کہتے ہیں۔ ان کے یہاں ناز نخرے والا کوئی معاملہ نہیں ہے۔

مظفر حنفی نے ترقی پسند تحریک کا عروج دیکھا۔ اپنی نظروں کے سامنے جدید تحریک کی بنیاد اور اس کا عروج بھی دیکھا۔ جدید تحریک نے کس طرح ترقی پسند تحریک کو پیچھے کر دیا یہ بھی دیکھا۔ وہ کسی ایک ازم یا تحریک سے وابستہ نہیں رہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جدید ادب نے انھیں متاثر کیا۔ وہ محض کھوکھلے نعروں اور دکھاوے کی ہمدردی کے قائل نہیں تھے۔ وہ جس مزاج کے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں بھی غریبوں، مزدوروں، دبے کچلے لوگوں سے ہمدردی تھی۔ لیکن وہ اسے شاعری میں ٹھونسنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھے۔ ان کے یہاں اس بات کے لیے ایک رکھ رکھاؤ اور معیار ہے۔

مظفر حنفی نے بلا وجہ کی تنقید اور طنز سے پرہیز کیا ہے۔ ان کا طنز یہ نشتر معاشرے اور قوم کی بھلائی کے لیے کام دیتا ہے۔ ان کی شاعری اس لیے بھی آفاقی قرار پاتی ہے کہ وہ بڑی بات کو آسانی سے کہنے اور مضمون کو سلیقے سے برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ ان شاعروں میں سے نہیں جو جلد فراموش کر دیے جائیں۔ ان کی شاعری انھیں زندہ رکھنے کا کام کرے گی۔

کسی کی بطور خاص پیروی نہیں کرنے سے یہ بھی ہوا کہ وہ بھیڑ سے الگ ہو گئے۔ میرے خیال میں ان کی یہ بات فطری تھی۔ کیونکہ اگر وہ محض کوشش سے ایسا کرتے تو شاید اپنی روش پر تمام زندگی قائم نہیں رہ پاتے۔ اس لیے کہ شاعری بے ساختہ ہوتی ہے اور اس میں فطرت ہی کام آتی ہے۔

مظفر حنفی کی شاعری ایک منفرد آہنگ رکھتی ہے۔ وہ روایتی خیال کے ساتھ جدید انداز کی آمیزش اس طرح کرتے ہیں کہ شعر بالکل نیا لگتا ہے۔ بس اسی انداز اور آہنگ کو چونکا دینے والی شاعری کہا جاتا ہے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کسی شاعر کا مکمل کلام منفرد ہو، یہ ممکن ہی نہیں۔ ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی میر اکثر غزلوں میں کچھ اشعار کا ہی انتخاب کیا ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ اگر دس گیارہ اشعار کی غزل میں دو چار اشعار بھی اعلیٰ درجے کے ہو جائیں یہی کافی ہے۔ اس معیار پر مظفر حنفی کی شاعری دوسروں سے کہیں زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے۔

یہاں ہم کسی سے موازنہ نہیں کر رہے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ مظفر حنفی جو ایک راہ اختیار کی وہ کیوں الگ ہے یہ بتانا مقصود ہے۔

مظفر حنفی کے کئی اشعار ایسے ہیں جو اکثر نظامت کرتے وقت ناظم مشاعرہ یا ناظم جلسہ پڑھتے ہیں۔ ان کے اشعار موقع کی مناسبت سے بھی پڑھے جاتے ہیں۔ آج کل کے شعرا کا کلام لوگوں کو کم ہی یاد رہتا ہے لیکن مظفر حنفی کے اشعار لوگوں کو کچھ نہ کچھ ضرور یاد رہتے ہیں۔ وہ تقریباً پچاس برس مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے انھیں کئی نسلوں کو متاثر کرنے والا شاعر کہا ہے۔ وہ بے وجہ داد کے طلبگار نہیں، ان کی ذات میں ایک قسم کی قناعت کا اظہار ہوتا ہے۔

مظفر حنفی صاحب کا لہجہ حقیقتاً دوسروں سے جدا تھا۔ یوں تو اکثر شاعروں پر مضامین لکھتے ہوئے مضمون نگار یہ لکھتے ہیں کہ فلاں صاحب منفرد لب و لہجے کے شاعر ہیں۔ لیکن اس رائے میں دروغ گوئی سے کام لیا جاتا ہے۔ اب اگر بات کریں مظفر حنفی کی تو شاید ہی کوئی انکار کر سکے کہ وہ منفرد لب و لہجے کے شاعر تھے۔ اگر وہ کرخت زبان استعمال کرتے تھے یا اپنی غزل کو کھردری غزل کہتے تھے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ الفاظ کا انتخاب کاٹ دار لہجے کی ترجمانی کرتا ہے۔ انھوں نے ثابت بھی کر دیا کہ ایسے الفاظ کو برت کر بھی تہ دار شاعری کی جاسکتی ہے۔

یکم اپریل 1936 تا 10/ اکتوبر 2020 یہ حنفی صاحب کا عرصہ حیات ہے۔ وہ مدھیہ پردیش کے کھنڈوا شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ 84 برس کی عمر میں انتقال کرنے والا یہ شاعر نہ صرف شاعر بلکہ محقق مترجم نقاد اور نہ جانے کیا کیا کچھ یہ ایک باکمال شخص تھا جسے ہم عبقری شخصیت کہہ سکتے ہیں۔ ان کی شاعری احتجاجی اور جارحانہ تھی۔ محبوب کے ناز رکھنے برداشت کرنے والا معاملہ بالکل نہیں بلکہ صاف سیدھی سچی محبت یا قطع تعلق۔ ایک غزل درج کرنے کے بعد اپنی بات آگے بڑھاتا ہوں۔

فرق نہیں پڑتا ہم دیوانوں کے گھر میں ہونے سے
ویرانی امڈی پڑتی ہے گھر کے کونے کونے سے

اپنی اس کم ظرفی کا احساس کہاں لے جاؤں میں
سن رکھا تھا الجھن کچھ کم ہو جاتی ہے رونے سے

بعد از وقت پشیماں ہو کر زخم نہیں بھر سکتے تم
دامن کے دھبے البتہ مٹ سکتے ہیں دھونے سے

کانٹے بونے والے سچ مچ تو بھی کتنا بھولا ہے
جیسے راہ رک جائیں گے تیرے کانٹے بونے سے

میرے تیکھے شعر کی قیمت دکھتی رگ پر کاری چوٹ
چکنی چپڑی غزلیں بے شک آپ خریدیں سونے سے

آنکھوں میں یہ رات کٹے تو ٹھیک مظفر حنفی جی
رہزن جھنجھلایا بیٹھا ہے اک منزل سر ہونے سے

(ریختہ ڈاٹ کام)

دیکھیے کہ الفاظ کا انتخاب کس طرح کا ہے۔ کچھ الفاظ تو غزل کے لیے بالکل رواں اور سبک ہیں۔ آپ ان لفظوں پر غور کریں جسے نبھانا مشکل ہوتا ہے۔ محاورہ کانٹے بونا لفظ چکنی چپڑی تیکھے شعر جھنجھلایا ان الفاظ پر غور کریں۔ پھر شعر بھی کمال کا کہنا کیا یہ سب کے بس کی بات نہیں ہے۔ مظفر حنفی نے ڈاکٹر محبوب راہی کی کتاب یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ میں ڈیڑھ صفحات پر مشتمل ایک مضمون میں اپنے متعلق اس طرح لکھا ہے:

''شاد و فراق و نارنگ کے ساتھ راہی نے مجھ کم ترین کو بھی اس طویلے میں باندھ رکھا ہے۔ ایاز کو اپنی قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ ہے البتہ

وہ بگولہ ہے کہ اڑنے پہ سدا آمادہ
میں جو مٹی ہوں تو مٹی بھی کہاں مانتی ہے

اس طرح یہ کتاب کم از کم نظر بد سے محفوظ رہے گی۔''

(یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ: ڈاکٹر محبوب راہی، اسباق پبلی کیشنز پونے، 2015، ص 8)

واضح ہو کہ ڈاکٹر محبوب راہی نے مظفر حنفی صاحب پر 'مظفر حنفی حیات اور کارنامے' اس عنوان سے پی ایچ ڈی بھی کی ہے۔ اپنے ایک خط میں پروفیسر مظفر حنفی صاحب یوں لکھتے ہیں، 'ترقی پسند مجھے جدید شمار کرتے ہیں اور جدید لوگوں کو میں ترقی پسند نظر آتا ہوں بات یہ ہے کہ کبھی خوش آمد اور تعلقات استوار کرنے کی روش اختیار کی نہ گروپ بندی کی اس کے باوجود لوگ اگر کسی نہ کسی طرح اعتراف کرتے ہیں تو دراصل یہ ان کی مجبوری ہے۔' (ایضاً، ص 236)

مظفر حنفی یوں تو جدید شاعری کا اہم نام ہے لیکن وہ خود کبھی یہ ظاہر نہیں کرتے کہ باقاعدہ کس گروپ سے وابستہ ہیں۔ یہ شاعر کا اعتماد ہے کہ مجھے ضرور نوٹس کیا جائے گا کسی سے رسم و راہ استوار کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب شاعر کو اپنے کلام پر مکمل اعتماد ہوتا ہو تو اسے ایسی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ ایسے شاعروں کا معاملہ نقادوں کے ساتھ بھی اسی طرح کا رہتا ہے۔ جو مستند قسم کے نقاد ہیں وہ ذرا کم ہی کسی شاعر کو خاطر میں لاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی اہم ناقد کسی کا ذکر کر دے یا اس پر مضمون لکھ دے تو وہ شاعر لوگوں کے نزدیک اہم ہو جاتا ہے۔ حنفی صاحب ان تمام باتوں سے بے نیاز اپنے کاموں کی طرف متوجہ رہے۔ بس اسی فطرت نے انھیں سب کے لیے قابل قبول بنا دیا۔ اکثر گروپ بندی کسی ایسے شاعر یا ادیب کو بھی آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیتی ہے جن کی تخلیقات میں کوئی اہم پہلو شامل نہیں ہوتا ہے۔ اس گروپ بندی کا اثر آج ادبی حلقوں میں اور زیادہ ہو گیا ہے۔ پہلے تو صرف کلاسیک ترقی پسند جدید یا اسی طرح کے کسی حلقے میں شامل کیا جاتا تھا مگر اب شاعروں اور ادیبوں کا خاص حلقہ ہو گیا ہے۔ بہر حال اگر 1980 میں حنفی صاحب یہ باتیں لکھ رہے تھے تو ظاہر ہے اس وقت بھی اس کے اثرات ضرور رہے ہوں گے۔

حنفی صاحب کے چند اور جملے اس طرح ہیں:

''بھائی جتنا کچھ اس دور ابتلا میں کہیں سے مل جائے غنیمت جانو کہ آج کل متاع سخن کے خریدار کہاں ہیں اور خوشامد وغیرہ جیسے حربے استعمال کرنے کے لیے بھی ظرف چاہیے جو ہمارے پاس نہیں۔''

''مدیران رسائل کی نگاہ میں ٹیڑھی امیج بنی ہوئی ہے اسے برقرار رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے کسی کتاب پر تبصرے کے لیے ایک کے بعد دوسرا خط کسی مدیر کو نہیں لکھا۔''

حنفی صاحب خود ستائش میں کبھی مبتلا نہیں رہے۔ خود جو کچھ لکھا وہ بھی اپنی مرضی سے اور دوسروں نے ان پر جو کچھ لکھا اسے بھی خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ زیادہ تعریف و توصیف پر انھیں خوش ہونے کی عادت نہیں تھی یہ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ اپنی غزلوں کو شاعر سبک اور رواں بتاتے ہیں۔ شاعری میں نغمگی شائستگی روانی سلاست فصاحت شیرینی عشق و محبت رومانیت کی تلاش کی جاتی ہے۔ اپنی غزل کو کھردری غزل بتانے والے مظفر حنفی کی ایک دوسری مکمل غزل پر غور کیجیے

اس کھردری غزل کو نہ یوں منہ بنا کے دیکھ
کس حال میں لکھی ہے میرے پاس آ کے دیکھ
وہ دن ہوا ہوئے کہ بچھاتے تھے جان و دل
اب ایک بار اور ہمیں مسکرا کے دیکھ
پردہ پڑا ہوا ہے تبسم کے راز پر
پھولوں سے اوس آنکھ سے آنسو گرا کے دیکھ
یہ دوپہر بھی آئی ہے پرچھائیوں کے ساتھ
ویسے نظر نہ آئیں تو مشعل جلا کے دیکھ
گلچیں نے جب تمام شگوفوں کو چن لیا
کانٹے پکار اٹھے کہ ہمیں آزما کے دیکھ
تو میرا ہمسفر ہے تو پھر میرے ساتھ چل
ہے راہزن تو نقش قدم رہنما کے دیکھ
اپنی نظر سے دیکھ برہنہ حیات کو
آنکھوں سے یہ کتاب کی عینک ہٹا کے دیکھ
از راہ احتیاط سفر کو نہ ختم کر
یہ پھول ہیں کہ آگ قدم تو جما کے دیکھ
ٹھپہ لگا ہوا ہے مظفر کے نام کا
اس کا کوئی بھی شعر کہیں سے اٹھا کے دیکھ

(ریختہ ڈاٹ کام)

اس غزل کی لفظیات بھی قابل توجہ ہے۔ یہی لفظیات انداز بیان اور تیکھا پن مظفر حنفی کو دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔

اوپر مظفر حنفی کی غزل میں لفظ کھردری، حیات کو برہنہ دیکھنے کی بات یا لفظ ٹھپہ شاید ہی کسی نے استعمال کیا ہو۔ یہی باتیں اور خیالات نسلوں کو متاثر کرتے ہیں۔ تقریباً تین نسلوں نے یا چار نسلوں نے مظفر حنفی کو پڑھا ہے اور سبھی متاثر ہوئے ہیں۔ اتنی سخت شاعری کرنے کے لیے دل و دماغ کا نہایت مضبوط ہونا ضروری ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ حنفی صاحب کی شاعری محبوب کے ذکر سے بالکل خالی ہے یا وہ حسن و عشق کی باتیں نہیں کرتے۔ علامتوں استعاروں اور تلمیحات کا استعمال کر کے انھوں نے بھی حسن و عشق کی باتیں کی ہیں لیکن اس میں محبوب سے ایک طرح کا فاصلہ ہے۔ وہ ایسے مضامین محدود دائرے میں کہتے ہیں۔ اس طرح کے مضامین کو برتنے میں کچھ شعرا حدود کا خیال نہیں رکھتے اور بے حجابانہ بات کہتے ہیں جس سے شاعری کا لطف غارت ہو کر محض چٹخارہ رہ جاتا ہے۔ یہ بات حنفی صاحب نہیں کرتے وہ سلیقے سے اور تہذیب کے دائرے میں کہتے ہیں حالانکہ اشارہ اور خیال وہی ہوتا ہے۔ اس کے باوجود شعر لطف دیتا ہے۔ میں مظفر حنفی کے دو شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

گلنار ہو گئے ہم گلریز ہو گئے ہم
جب یاد آئے ہو تم زرخیز ہو گئے ہم
پتھر سے دودھ کل تک ہم بھی نکالتے تھے
فرہاد آگئے تو پرویز ہو گئے ہم

■

Mohammad Asrar
Assistant Professor, Urdu Department
S.K. Prowal College of Art, Science &
Commerce, Kamptee,
Dist. Nagpur- 441001 (Maharashtra)
Mob.:9822724276
Email : asrarmohammad1977@gmail.com

عبدالحلیم ندوی

عربی زبان کی امتیازی خصوصیات

کسی زبان کی اہمیت اور مقبولیت کا پیمانہ صرف یہ نہیں ہے کہ اس کا دائرۂ عمل زمین کے کتنے لمبے اور چوڑے رقبے پر پھیلا ہوا ہے یا اسے دنیا کی آبادی میں سے کتنی بڑی اکثریت بولتی اور سمجھتی ہے، بلکہ اس کے ساتھ اس کی کسوٹی یہ بھی ہے کہ اس کا دامن کتنا وسیع ہے۔ اس میں کتنی گہرائی اور کتنی گیرائی ہے۔ اس کے نحوی قاعدوں اور گرامر کے اصولوں میں کتنا استحکام، پختگی اور اسی کے ساتھ کتنی وضاحت ہے۔ اس کے الفاظ کتنے شیریں، اس کا پیرایہ بیان کتنا دلکش اور اس کا طریق تلفظ اور صوتی اثرات کتنے موثر اور اس کے سیکھنے سکھانے کے امکانات اور طریقے کتنے سادے اور آسان ہیں۔ جس زبان میں دائرۂ عمل کی وسعت اور کثرت استعمال کے ساتھ ساتھ نحوی قاعدے (گرامر) جتنے سائنٹفک، واضح اور مستحکم ہوں گے، جس کے الفاظ جتنے شیریں اور طرز ادا جتنا دلکش اور اسلوب بیان جتنا موثر اور جس کے معانی جتنے عمیق اور گہرے ہوں گے اسی اعتبار سے زبان کی اہمیت، مقبولیت اور کارفرمائی کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اس نقطۂ نظر سے اگر ہم عربی زبان کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس میں یہ تمام خوبیاں پوری طرح موجود ہیں اور اس وجہ سے اسے دنیا کی مروجہ زبانوں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ عربی زبان کی یہی بے مثال خوبیاں اور امتیازی خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے سرداران قریش باہر سے آنے والے عربوں کے کانوں میں قرآن کی بھنک بھی نہ پڑنے دینا چاہتے تھے کہ مبادا اس کی سحر طرازی کی وجہ سے اسلام لے آئیں۔ اس زبان کی یہی خوبیاں اور امتیازی خصوصیات ہیں، جنھوں نے ڈیڑھ ہزار سال سے نہ صرف اسے بول چال کی ایک کثیر الاستعمال زبان کی حیثیت سے قائم رکھا ہے بلکہ ایک ترقی پذیر، وسیع اور دلکش ادبی وفنی زبان کے قالب میں زندہ رکھا ہے اور اس کو بدلنے یا کمزور کرنے کی مختلف کوششوں کے باوجود اس کے اثر ورسوخ اور ہمہ گیری میں کوئی کمی نہیں آئی۔ کیونکہ اس میں زندہ رہنے، ترقی کرنے، زمانے کے ساتھ چلنے اور پھلنے پھولنے کی وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو ایک زبان کو زندہ جاوید بنا دیتی ہیں۔

سامی زبانوں کی شاخوں میں عربی زبان سب سے زیادہ سائنٹفک مربوط، منضبط اور اصول وقواعد کے اعتبار سے گٹھی اور منظم زبان ہے جن کی وجہ سے اس میں چند ایسی امتیازی خصوصیات پیدا ہوگئیں جو عام طور سے دوسری زبانوں میں کمیاب ہیں۔ ان خصوصیات میں سے چند درج ذیل ہیں۔

عربی زبان کی گرامر: عربی زبان کو لکھنے بولنے اور اس میں مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے جو نحوی اور صرفی قاعدے وضع کیے گئے ہیں ان کی بنیاد قرآن وحدیث کے لسانی شواہد خالص عربی قبائل میں مروج طریقوں اور مستند علما وادبا کے طریق استعمال پر ہے اور ان کے وضع کرنے میں علمائے لغت نے بڑی کاوش اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہے اور مدتوں کی تحقیق وجستجو، جہاں بینی اور غور وفکر کے بعد ان کو آخری شکل دی ہے۔ اس لیے ان میں ایسا استحکام، ایسی پختگی اور تیقن کی شان پیدا ہوگئی ہے کہ تغیر وتبدل، حذف واضافہ کی مطلقاً گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔ زبان کے قاعدوں کی امتیازی خصوصیت کی وجہ سے اس کے سیکھنے سکھانے میں بڑی آسانی ہوگئی ہے کیونکہ جو قاعدہ ہے وہ اپنی جگہ اٹل ہے اور اگر کہیں استثنا کی شکل ہوتی ہے تو اس کا ذکر بھی اسی جگہ کر دیا جاتا ہے اور اس قسم کی استثنائی صورتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ اس صفت کی وجہ سے ان قاعدوں کو یاد کر کے برتنا بہت آسان ہوگیا ہے۔ یوں تو عربی زبان کے قواعد ایک مستقل فن بن گئے ہیں، لیکن جہاں تک زبان سیکھنے اس میں دسترس حاصل کرنے اور مافی الضمیر کو ادا کرنے کی ضرورت ہے اس پورے دفتر کو پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ اس میں مہارت تامہ حاصل کرنے کی۔ یہ کام تو ان لوگوں کے لیے ضروری ہے جو 'نحو' کو بحیثیت فن سیکھنا چاہتے ہوں اور ایسے لوگوں کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ عربی زبان کے ادیب یا انشا پرداز بن جائیں۔ زبان کو لکھنے اور بولنے اور سمجھنے کے لیے ان سب قاعدوں کو نوک زبان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کام کے لیے تو چند گنے چنے اور متعین قاعدے یاد کر کے انھیں قلم وزبان پر رواں کر لینا ہی کافی ہے اور تجربے نے بتایا ہے کہ اس طریقے پر عمل کر کے بعض علما اس ہندوستان میں بھی عربی ادب کے اچھے انشا پرداز اور خطیب بن گئے ہیں۔

عربی زبان کا اعراب: عربی زبان دنیا کی شاید ان چند زبانوں میں سے ایک ہے جن میں الفاظ کی آوازوں کو علامتوں کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے اور یہ اس زبان کے وسیع، متمدن اور صاف ستھرے ہونے کی دلیل ہے۔ چنانچہ عربی میں الفاظ کی صوتی شکلوں کو لکھ کر نہیں بلکہ چند اشاروں کے ذریعے جنھیں اعراب کہا جاتا، ظاہر کیا جاتا ہے اور اس کے لیے زیر، زبر اور پیش کی علامتیں ایجاد کی گئی ہیں۔ اس طریقے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ لکھنے کے حروف کم ہو جاتے ہیں اور اس سے وقت کی بچت ہو جانے کے علاوہ ادبی ذوق اور ملکہ کی پوری طرح آبیاری ہوتی ہے کہ اگر گرامر کے قاعدے اور اصول ذہن نشین ہیں تو عبارت کو پڑھنے اور سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔

نزاکت بیان: زبان میں نزاکت کا وجود خواہ وہ لفظی ہو یا معنوی یا ترکیبی، اس کی خوبصورتی اور دل آویزی میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ عربی زبان اس نقطۂ نظر سے دنیا کی بڑی سامعہ نواز اور دل آویز زبانوں میں سے ہے۔ اس کے حروف تہجی میں ثقیل حروف مثلاً ٹ، پھ، چھ، ڈھ، گھ، ڑھ وغیرہ کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کے الفاظ بہت شیریں اور سامعہ نواز ہو گئے ہیں۔ غیر زبانوں کے جو الفاظ اس میں مستعار آئے ہیں انھیں عربی ذوق

کا ایسا جامہ پہنا دیا گیا ہے کہ معرب ہو کر وہ بھی عربی زبان کے حسن میں ڈھل کے نکھر گئے ہیں۔ عربی الفاظ کی نزاکت بیانی کا یہ عالم ہے کہ معانی کے جزئیات بھی پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں اور کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہتا۔ جیسے دن کے ہر گھنٹہ اور پہر کے لیے ایک الگ مخصوص نام کا پایا جانا، یا چاندنی رات کے ہر مرحلہ کا ایک مخصوص نام۔ اسی طرح بالوں، آنکھوں اور ان کے امراض کے اور اونٹ و گھوڑے کے ذرا سے فرق کے ساتھ الگ نام اور تلوار کے اس کی صفات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل الگ اور امتیازی نام۔

اسی طرح اس زبان میں بعض ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جن کے معانی میں اتنی وسعت اور گہرائی ہے کہ اس کا ترجمہ کئی سطروں میں آتا ہے۔ یہی حال مصادر اور ان کے مشتقات کا ہے کہ ایک ہی مصدر کی جڑ سے مختلف معانی دینے والے مختلف قسم کے افعال مشتق ہوتے ہیں۔ چنانچہ افعال میں ایک حرف بڑھا دینے سے یا گھٹا دینے سے معانی بالکل بدل جاتے ہیں جیسے 'طعم' (کھایا)، 'اطعم' کھلایا۔ اسی طرح صلات کے بدلنے سے افعال کے معنی بالکل بدل جاتے ہیں جیسے 'رغب الی' (کسی کی طرف مائل ہونا) اور 'رغب عن' (کسی سے منہ موڑ لینا۔ نفرت کرنا) عربی ادب میں صلات کے علم کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ بعض علما نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ زبان دانی صرف صلات کا علم ہے۔ انسان کے اوصاف اور اس کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لیے جو موزوں ترین طریقے اور جو الفاظ عربی زبان میں پائے جاتے ہیں شاید ان کی مثال دوسری زبانوں میں نہ ملے۔ چنانچہ صرف محبت کے جذبات اور اس کے مختلف نازک ترین مراحل کے اظہار کے لیے عربی زبان میں کم سے کم دس الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح نفرت و حسد اور بخل و سخاوت اور لالچ اور ان کے مختلف مراحل کے لیے بھی متعدد الفاظ پائے جاتے ہیں۔ جو ان صفات و احساسات کے جزئیات تک کو واضح کر دیتے ہیں۔

اعجاز و ایجاز: عام طور سے دنیا کی ہر زبان میں کم الفاظ کے ذریعے بہت معانی پیدا کرنے کا طریقہ رائج ہے جسے اصطلاح میں 'اعجاز' کہا جاتا ہے۔ عربی زبان اعجاز کے معاملہ میں منفرد زبان ہے۔ اس میں بکثرت ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جن کی تشریح کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ مثلاً لفظ 'الحمد' کو لے لیجیے جس سے قرآن کی سورہ فاتحہ شروع ہوتی ہے، جس کے معانی علما یہ بتاتے ہیں کہ انعامات و احسانات کے اعتراف کے جذبہ کے ساتھ انسان نے شکر ادا کرنے کے جتنے طریقے ایجاد کیے ہیں یا ایجاد کرے گا یا سوچا ہے یا سوچ سکتا ہے وہ سب اس خدائے منعم و محسن کے لیے مخصوص ہیں۔ اس ایک لفظ میں ایسی جامعیت اور شمولیت ہے کہ دفتر کے دفتر اس معنی کو ادا کرنے کے لیے ناکافی ہیں اور الفاظ کی یہ صفت جامعیت عربی زبان میں بہت عام ہے۔ بات کو اشاروں کے ذریعے پرلطف بنانے کے لیے کنایہ، مجاز اور اسلوب کو دلنشیں اور موثر بنانے کے لیے معانی و بدیع کا استعمال عربی زبان کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔

مترادفات اور اضداد کا وجود: دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ایک معنی کے ادا کرنے کے لیے کئی لفظ استعمال کرنے کا طریقہ رائج ہے۔ ان الفاظ کو 'مترادفات' یا 'مرادف الفاظ' کہا جاتا ہے۔ عربی زبان کا دامن مترادفات کے معاملہ میں بڑا وسیع ہے۔ چنانچہ علماءِ لغت نے صرف سال کے لیے 24 نام اور روشنی کے لیے 21، تاریکی کے لیے 52، کنویں کے لیے 88، پانی کے لیے 170، شیر کے لیے 350 اور اونٹنی کے لیے 255 نام لکھے ہیں۔ اسی طرح انسانی حلیہ کے لیے اور اوصاف کے لیے بھی متعدد الفاظ آتے ہیں۔ چنانچہ عربی میں درازی قد کے لیے 91 الفاظ، پستہ قدی کے لیے 120 الفاظ آئے ہیں۔ اوصاف میں بخل، سخاوت، شرافت، رذالت وغیرہ کے الفاظ کے لیے بھی مختلف الفاظ آئے ہیں۔

الفاظ کے معانی کے اظہار کے سلسلہ میں عربی زبان کو دوسری زبان کے مقابلہ میں یہ امتیازی خصوصیت حاصل ہے کہ اس میں بعض الفاظ ایسے ہیں جو متضاد معنی دیتے ہیں جیسے 'دون' کا لفظ ہے کہ اس کے معنی کم، زیادہ، قریب، دور اور آگے پیچھے کے بھی آتے ہیں۔

ایک لفظ کے کئی معانی کا نکلنا: غالباً عربی زبان دنیا کی زبانوں میں اس حیثیت سے بالکل منفرد زبان ہے کہ ایک ہی لفظ بسا اوقات کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ علماءِ لغت نے دو سو سے زائد الفاظ ایسے جمع کیے ہیں جو تین معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اور 100 سے زائد الفاظ جو 4 اور 5 معنی دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض الفاظ 25 معنی دینے والے بھی ہیں۔ چنانچہ 'فال' کا لفظ 27 معنی کو ظاہر کرتا ہے اور 'عین' کا لفظ 35 معنی کو اور 'عجوز' کا لفظ 60 معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

حکم و امثال کا وجود: کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی کو دلنشیں انداز میں ظاہر کرنے کا طریقہ کم و بیش ہر زبان میں پایا جاتا ہے جسے مثل یا کہاوت کہتے ہیں مگر عربی زبان میں اس کی بہت کثرت اور اس میں بڑا تنوع ہے۔ عربوں کو اپنے مخصوص طرز زندگی کی وجہ سے عناصر فطرت سے براہ راست مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ اس طرز زندگی کے تجربات سے عربوں نے براہ راست نتائج اخذ کیے۔ ان نتائج کو حکمت و فلسفہ، دانش مندی و جزرسی کی آمیزش سے الفاظ کے ایسے خوبصورت قالب میں ڈھالا گیا جو صوتی اثرات کے حسن و جمال کے علاوہ معنویت میں بھی ایک بحر بے کراں تھے اور یہی قالب 'ضرب الامثال' یا کہاوتیں کہلائیں۔

ان اہم اور امتیازی خصوصیات کے علاوہ عربی زبان میں 'سجع' یعنی مقفّی اور مرصع نثر کا طریقہ بھی رائج تھا جسے عام طور سے اسلام سے پہلے پروہت (کہان) اور مقررین بھی استعمال کرتے ہیں۔

الفاظ کے صوتی اثرات کے ذریعہ منظر کشی کرنے میں عربی زبان کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس زبان میں بعض ادبا ایسے گزرے ہیں جنھوں نے الفاظ کے ذریعے کسی چیز کا ایسا نقشہ کھینچ دیا کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ جیسے ابوزید الطائی نے حضرت عثمان کے سامنے شیر کا حلیہ اس طرح بیان کیا کہ اس کا مہیب تصور آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

غرض کہ عربی زبان ان گوناگوں امتیازی خصوصیات کی وجہ سے مختلف زمانوں کے نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی، مختلف ملکوں اور قوموں سے تعلق پیدا کرتی ہوئی، کبھی ان سے چھٹتی ہوئی، کبھی ان سے جڑتی ہوئی نہ صرف آج تک باقی ہے بلکہ روز بروز ترقی کر رہی ہے اور اپنا دائرۂ اثر و عمل بڑھا رہی ہے۔

■

ماخذ: عربی ادب کی تاریخ، **مصنف**: عبدالحلیم ندوی، **چھٹی طباعت**: 2014، **ناشر**: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

انیس الحسن صدیقی

فخرِ ہندوستان دوم

خلا میں سورج کی مشاہدہ گاہ ایل-اوّل

14 جولائی اور 23 اگست 2023 ہندوستان کی تاریخ میں سنہرے الفاظ سے لکھے گئے ہیں۔ 14 جولائی 2023 کو فخر ہندوستان ۔اول خلائی جہاز چندریان۔سوم نے اپنا خلائی سفر شروع کر کے 23 اگست 2023 کو وِکرم لینڈر کو کامیابی کے ساتھ چاند کی سطح پر اتار دیا تھا۔ وِکرم لینڈر کے اندر سوار خود کار گاڑی پر گیان نے باہر نکل کر چاند کی سطح کا جائزہ لیا اور چاند کی تصویریں اتار کے ہندوستان روانہ کی تھیں۔ خود کار گاڑی پر نصب سائنسی آلات نے چاند کی سطح کے متعلق اہم معلومات ہندوستانی سائنس دانوں کو 14 دنوں تک روانہ کی تھیں۔

اب 2 ستمبر کا دن بھی ہندوستان کی تاریخ میں سنہرے الفاظ سے لکھا گیا ہے۔ اس دن ایک اور فخرِ ہندوستان۔ دوم، خلا میں سورج کی مشاہدہ گاہ آدتیہ ایل۔اول، خلائی گاڑی پی۔ایس۔ایل۔وی۔ پر سوار ہماری زمین سے خلائی سفر کے لیے ہندوستانی وقت کے مطابق ٹھیک 11.30 پر کامیابی کے ساتھ روانہ ہوئی۔اس خلائی گاڑی نے پندرہ منٹ میں سورج کی مشاہدہ گاہ آدتیہ ایل۔اول کو خلا میں 250 کلومیٹر کی دوری تک پہنچا دیا تھا۔اب یہاں سے آدتیہ ایل۔اول کا خلائی سفر شروع ہوا۔ چند گھنٹوں بعد ہندوستانی خلائی تنظیم کے سائنس دانوں نے خلا میں اپنے رسل و رسائل کے ٹیلی سسٹم کے ذریعے اس مشاہدہ گاہ کو زمین کے گرد 235 x 19,500 کلومیٹر کے ترجیحی مدار میں کر دیا۔

اس کے بعد زمین کے گرد 5 ستمبر 2023 کو 245 x 20,023 کلومیٹر کے ترجیحی مدار میں کر دیا۔اسی طرح اس کا زمین کے گرد مدار بڑھاتے بڑھاتے اس کو اپنی منزل ایل۔ اول تک 125 دنوں میں پہنچا دیا جائے گا۔ اس مہم کی خاتون ڈائرکٹر محترمہ ڈاکٹر نگار شاہ جی نے بتایا:

''اسرو کی خلائی مہم سورج کی مشاہدہ گاہ آدتیہ ایل۔اول خلا میں ایل۔اول مقام جو ہماری زمین سے 1,50,00,000 کلومیٹر کی دوری پر ہے یعنی چاند کی دوری کا تقریباً چار گنا، اس تک 125 دنوں میں پہنچے گی۔ وہاں پہنچ کر وہ سورج کے بالا موسم کا مشاہدہ کرے گی۔ یہ سورج کی مشاہدہ گاہ آدتیہ ایل۔اول 1,475 کلوگرام وزنی ہے اور اس پر 7 سائنسی آلات نصب ہیں جو سورج کے بارے میں معلومات ہماری زمین پر اسرو کے خلائی اسٹیشن پر پہنچائیں گے۔ اس خلائی مہم کی تیاری اسرو تنظیم 2006 سے کر رہی تھی۔''

اس سے پہلے اسرو نے سورج کے باہر موسم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنی خلائی مہم کے تحت سورج کی مشاہدہ گاہ سیارچہ اسٹروسیٹ (Astrosat) کو 2006 میں خلا کے لیے روانہ کیا تھا۔

دنیا کے سائنس دانوں کی نگاہیں اسرو تنظیم کی اس خلائی مہم اور اس کی خاتون ڈائرکٹر محترمہ ڈاکٹر نگار شاہ جی پر لگی ہوئی ہیں۔ کیونکہ یہ پہلا سنہرا موقع ہے کہ ایک خلائی مہم کی ڈائرکٹر ایک ہندوستانی خاتون سائنسداں ہے۔

کون ہیں محترمہ ڈاکٹر نگار شاہ جی؟

محترمہ ڈاکٹر نگار شاہ جی 1964 میں شیخ میرن او رسائی تھون بیوی کے کسان گھرانے میں تامل ناڈو کی تحصیل ٹینکاسی کے تحت سین گوٹائی میں پیدا ہوئی تھیں۔ آپ سین گوٹائی میں پلی اور بڑھیں اور وہاں کے ایک اسکول ایس آر ایم گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول میں تعلیم پائی۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے

گورنمنٹ کالج آف انجینئرنگ، مقام ترون ویلی، مدورائی کامراج یونیورسٹی کے تحت الیکٹرونکس اینڈ کمیونیکیشنز میں ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد آپ نے الیکٹرونکس میں ماسٹر کی ڈگری برلا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنا لوجی، میسرا سے حاصل کی۔

1987 میں اسرو خلائی تنظیم میں، یو آر راؤ سیٹلائیٹ پروگرام کے تحت داخل ہوئیں۔آپ نے مختلف پروگراموں میں کام کیا اور بحیثیت ایسوسی ایٹ پروجیکٹ ڈائرکٹر آف ریسورسیٹ۔دوم۔اے انجام دیا۔اس کے بعد سے خلائی

مشاہدہ گاہ آدتیہ۔اول پر مستقل کام کررہی ہیں۔آپ کے خاوند بھی ایک انجینئر کے حیثیت سے دبئی میں کام کررہے ہیں۔آپ کے فرزند نیدر لینڈ میں ایک سائنس داں کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔آپ کی بیٹی ایک سند یافتہ ڈاکٹر ہیں اور پوسٹ گریجویشن کی تعلیم حاصل کررہی ہیں۔

آج کل آپ بنگلور میں اپنی والدہ اور بیٹی کے ساتھ مقیم ہیں اور خلائی مشاہدہ گاہ آدتیہ ایل۔اول کے سائنس دانوں اور تکنیکی ماہروں کی ٹیم کی سربراہ کی حیثیت سے نگرانی کررہی ہیں۔

بہت سے زیادہ لوگوں نے آپ کے اس پروجیکٹ کو سراہا ہے اور تعریف کی ہے اور بعضوں نے تو ہندوستانی عظیم سائنس داں اے پی جے عبدالکلام کے نقشِ قدم پر گامزن سائنس داں لکھا ہے جیسا کہ آپ تصویر میں دیکھ سکتے ہیں۔

خلا میں ایل۔اول کا مقام کیا ہے؟

یہ خلا میں سورج اور زمین کے درمیان وہ مقام ہے جہاں خلائی جہاز و مشاہدہ گاہ آدتیہ ایل۔اول خود کو اس مقام پر رکھے گا۔اس لیے اسرو کے مشن کے سائنس دانوں نے سورج کا مشاہدہ بغیر کسی رکاوٹ کے کرنے کے لیے خلا میں یہ مقام طے کیا ہے۔خلا میں اس نقطہ کو Lagrange-1 مقام کہا گیا ہے۔لیگرینج ایک ماہر ریاضی کا نام ہے جس نے خلا میں سورج اور زمین کے درمیان ایسے پانچ نقطوں کو دریافت کیا تھا۔اس لیے یہ پانچ نقطے اس کے نام سے موسوم ہیں۔یہ وہ مقام ہیں جہاں دو خلائی جرم گھومتے اور گردش کرتے ہوئے بڑے اجرام کے مادوں کی قوت کی نفی کرتا ہے۔اس لیے کوئی بھی خلائی جہاز سورج اور زمین کے درمیان ان نقطوں پر دونوں اجرام کی کشش کے کھنچاؤ اور مرکز گریز قوت (Centrifugal force) کے تحت وہیں ٹکا رہے گا اور زمین کے ساتھ ساتھ گھومتا رہے گا۔سورج اور زمین کے درمیان ایسے پانچ مقام ہیں۔

خلا میں ایل۔اول مقام ہماری زمین کے ان پانچ نقطوں میں سے پہلا نقطہ ہے جو ہماری زمین سے 1,50,00,000 کلومیٹر کی دوری پر ہے۔یعنی چاند سے چار گنا زیادہ فاصلے پر۔اس نقطے پر جو بھی جرم رکھ دیا جائے گا وہ ہمیشہ وہیں پر رہے گا اور زمین کے ساتھ ہی ساتھ سورج کے گرد گردش کرتا رہے گا۔خلا میں اس نقطہ سے سورج کے ہالہ نور (Halo) کا مشاہدہ آسانی سے بغیر کسی رکاوٹ کے ہوگا۔اس نقطہ پر سورج اور زمین کی کشش کا کھنچاؤ یعنی قوت جاذبہ خلائی مشاہدہ گاہ آدتیہ ایل۔اول کو ہماری زمین کے ساتھ ہی ساتھ گھماتی رہے گی۔آج کل خلائی سیارچہ ایس او ایچ او (SOHO) بھی اسی نقطے سے سورج کے ہالۂ نور کا مشاہدہ کررہا ہے۔

اگر دیکھا جائے تو خلا میں یہ نقطہ خلائی مشاہدہ گاہ آدتیہ ایل۔اول کے پارکنگ کی جگہ ہے۔جہاں سے یہ مشاہدہ گاہ اسرو کے زمین پر خلائی اسٹیشن کو سورج کے ہالۂ نور کی تصویریں مستقل روانہ کرتی رہے گی اور ہمیں ہمیشہ شمسی آندھی کے بارے میں پیشگی اطلاع فراہم ہوتی رہے گی۔

خلا میں ایل۔اول مقام پر مشاہدہ گاہ ایل۔اول کو قائم رکھنے کے کیا فائدے ہیں؟

پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس مقام سے سورج کا مشاہدہ بغیر کسی رکاوٹ کے ہوسکتا ہے یہاں تک کہ سورج گرہن کے دوران بھی۔

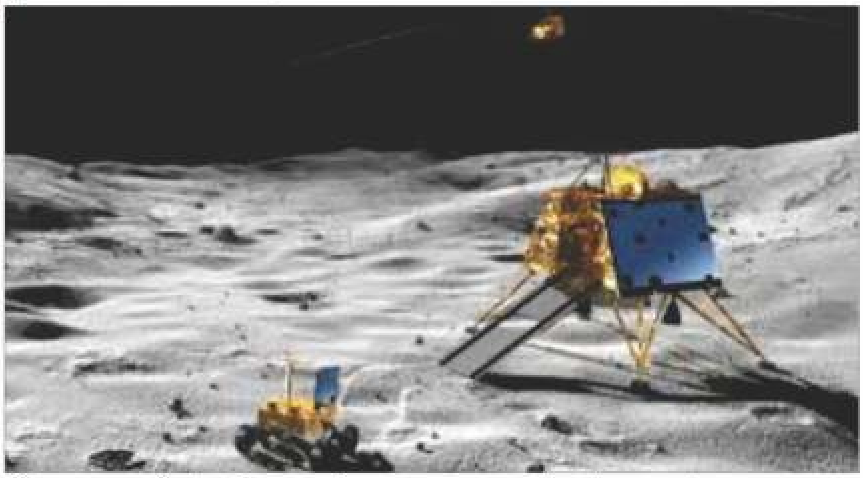

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ خلا میں ایل۔اول مقام سورج اور ہماری زمین کے درمیان کے فاصلہ کا ایک فیصد ہے۔اس لیے مشاہدہ گاہ ایل۔اول پر نصب تمام سائنسی آلات سیدھے سورج کا مشاہدہ آسانی سے کرسکیں گے۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اس مشاہدہ گاہ پر نصب سائنسی آلہ وی ایل ای سی سورج سے خارج شدہ مادے کا آسانی سے مشاہدہ کرسکے گا۔

چوتھا فائدہ یہ ہے کہ اس مقام پر مشاہدہ گاہ آدتیہ ایل۔اول کا کم سے کم ایندھن خرچ ہوگا۔

خلا میں اس مقام سے تمام سائنسی مقاصد پورے ہوں گے۔ مثلاً اس مشاہدہ گاہ کے ذریعے ہمارے سب سے قریب ستارہ یعنی سورج کا گہرا مطالعہ ہوسکے گا یعنی کس طرح سورج کی ریڈیشن، گرمی، سورج سے بھر پور ذرات کا خارج ہونا اور ان کا کتنا اثر ہماری زمین کے مقناطیسی علاقے پر ہوتا ہے۔اس مشاہدہ گاہ پر نصب آلات سورج کی بالا فضا کی تہہ جس کو لونی فضا (Chromosphere) کہا جاتا ہے یعنی سورج کے آس پاس کی فضا پر چھایا ہوا گیس کا غلاف ہے جو کرۂ ضیائی اور سورج کے ہالہ کے درمیان واقع ہے۔اس کا مطالعہ آسانی سے ہوسکے گا۔نخز مائیہ (Plazma) اور مقناطیسی علاقے جو سورج کے ہالہ سے خارج ہوا مادہ کہلاتا ہے (Coronal mass ejection) کا بھی ہمارے سائنس داں مطالعہ کرسکیں گے۔سورج کے ہالہ کا مقناطیسی علاقہ اور سورج کی فضا کا بھی مطالعہ کیا جائے گا۔

سائنس دانوں کو بہت عرصہ پرانا پوشیدہ راز بھی معلوم ہوسکتا ہے کیونکہ اتنا زیادہ چمکدار سورج کے ہالہ کا درجۂ حرارت 10,00,000 سینٹی گریڈ ہے جب کہ سورج کی سطح کا درجۂ حرارت صرف 5,500 سینٹی گریڈ ہے۔ایسا کیوں؟ یہ سائنس دانوں کو سورج پر ذرات کی رفتار بڑھنے کے عمل کے اسباب جو شمسی آندھی کی رہنمائی کرتے ہیں ان کو بھی سمجھنے میں مدد کرے گا۔

اس شمسی مشاہدہ گاہ ایل۔اول پر نصب آلہ ویلیک (VLEC) کا میکینزم ہے کہ جس کے ذریعے چمکدار دکھائی دینے والی روشنی بند ہوجاتی ہے اور صرف وہ روشنی جو سورج کے ہالہ سے آرہی ہے جانچی جاتی ہے۔یہ آلہ سورج کے ہالہ کا مطالعہ کرنے کے لیے بہت ہی قلیل وقفہ کے لیے کھلے گا یعنی صرف 5 ملی سیکنڈ۔تب ہی سورج کے ہالہ کے بارے میں معلومات ہوسکتی ہیں۔انسانی آنکھ سورج کے ہالہ کو نہیں دیکھ سکتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ سورج کے موسم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

اس لیے کہ سورج بھی کائنات میں دوسرے ستاروں کی طرح ایک ستارہ ہے جو ہماری زمین سے سب سے قریب ستاروں میں سے ایک ہے۔ یہ ستارہ ہماری زمین سے 14,96,00,000 کلومیٹر کی دوری پر ہے۔ سورج کا اپنا نظام شمسی ہے، جس کے تحت اس کے گرد 8 سیارے گردش کررہے ہیں جن میں ہماری زمین جس پر ہم اور آپ بستے ہیں، سورج سے تیسرا سیارہ ہے۔ اس سیارہ پر ہی زندگی موجود ہے۔ باقی کے پانچ سیاروں پر زندگی یا زندگی کے آثار ابھی تک نہیں پائے گئے ہیں۔ سورج کی گرمی کے ذریعے ہی اس زمین پر سورج کے مزاج پر موسم منحصر ہیں۔ سورج، دہکتی آگ کا ایک گولہ ہے۔ اس میں ہائیڈروجن گیس بذریعہ کیمیائی ردعمل Fusion ہیلیم گیس میں تبدیل ہورہی ہے۔ اس تبدیلی کے ذریعے سورج میں مستقل آگ بھڑک رہی ہے۔

سورج پر آگ اتنی شدید ہے کہ جس کی تپش کے ذریعے ہماری زمین پر زندگی موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی شدید تپش کے ذریعے ہماری زمین پر طوفان، سیلاب وغیرہ بھی آتے ہیں۔ یہ سب ہماری زمین کے موسم پر اثر کرتے ہیں۔ سورج سے شمسی آندھی تو ہمارے بجلی پیدا کرنے کی گرڈ اور سیارچوں پر بری طرح اثر کرتی ہے۔ سورج کے موسم کے بارے میں ہمیں پیشگی اطلاع کے ذریعے ہی ہم اپنی بجلی کی گرڈ اور سیارچوں کو بچاسکتے ہیں۔ اس سائنسی دور میں ان خطرات سے بچاؤ کرنے کے لیے ہمیں سورج کے موسم کے بارے میں پیشگی اطلاع کی شدید ضرورت ہے۔ یہ پیشگی اطلاع سورج کی مشاہدہ گاہ ایل۔اول ہی دستیاب کراسکتی ہے۔

شمسی مشاہدہ گاہ ایل۔اول پر کون کون سے سائنسی آلات نصب ہیں؟

شمسی مشاہدہ گاہ ایل۔اول پر 7 سائنسی آلات نصب ہیں۔ ان سائنسی آلات کی سورج کی شدید گرمی سے حفاظت کے لیے شمسی مشاہدہ گاہ ایل۔اول کا ڈھانچہ بہت ہی زیادہ طاقتور اسٹیل کے آمیزہ سے بنایا گیا ہے۔ یہ اسٹیل کا آمیزہ نہ صرف دیرپا قائم رہنے والا ہے بلکہ خلا میں شدید درجہ حرارت کو برداشت کرسکتا ہے۔ اسی لیے شمسی مشاہدہ گاہ ایل۔اول پر نصب تمام سائنسی آلات باوجود سورج کی شدید گرمی کے بحفاظت اپنا کام کرتے رہیں گے۔

1 سب سے خاص آلہ دکھائی دینے والی خارج ہوئی لائن ہالہ گراف (Visible Emission Line Cornograph) یعنی (VLEC) جو کہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسٹروفزیکس کے ذریعے ڈیزائن کیا گیا ہے اور جو سب سے زیادہ اہم سورج کے ہالہ کا سب سے نچلا حصہ اوپر کی طرف کا مطالعہ کرنے میں مدد کرے گا۔ یہ آلہ سورج کے ہالہ کی تصویر کشی کرسکتا ہے یعنی سورج کے نصف قطر کا 1.05 گنا۔ ابھی تک کسی بھی نصب آلہ نے اتنا قریب سے سورج کے ہالہ کی تصویر کشی نہیں کی ہے۔

2 آلہ شمسی الٹرا وائلٹ تصویر کشی دوربین (Solar Ultraviolet Imaging Telescope) یعنی (SUIT)۔

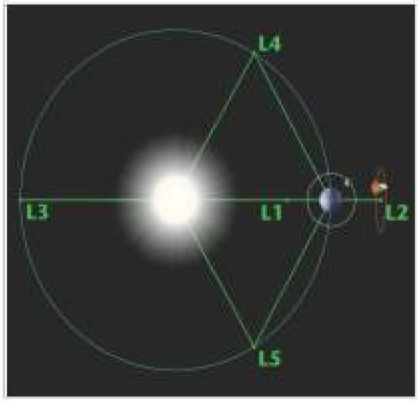

یہ آلہ انٹر یونیورسٹی سینٹر برائے اسٹرونامی اینڈ فزیکس (IUCAA) کے ذریعے تیار کیا گیا ہے۔ یہ آلہ الٹراوائلٹ روشنی کو پکڑے گا اور شمسی کرہ نور کی تصویر کشی کرے گا۔ سورج سے خارج ہوئی روشنی کی توانائی کے فرق کا مطالعہ کرنے میں یہ آلہ مدد کرے گا۔

3 آلہ قلیل شمسی توانائی ایکسرے طیف پیما (The Solar Low Energy X-RaySpectrometer) یعنی (SoLEXS) اور زیادہ توانائی ایل۔اول، ذرات ایکسرے طیف پیما (HEL1OS) یہ آلہ، آر۔ راو سیٹلائٹ سینٹر نے تیار کیا ہے جو کہ سورج کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کا ایکسرے کرنے میں مدد کرے گا۔

4 آلہ دی آدتیہ شمسی آندھی ذرات تجربہ (The Aditya Solar Wind Particle Experiment) یعنی (ASPEX) یہ آلہ شمسی آندھی کے بارے میں پیشگی اطلاع دے گا۔

5 آلہ پلازمہ انالائزر برائے آدتیہ (Plazma Analyser Package for Aditya) یعنی (PAPA) یہ آلہ اسرو کے فزیکل ریسرچ لیباریٹری کے ذریعے تیار کیا گیا ہے۔ اس آلہ کے ذریعے شمسی آندھی اور توانائی کے آیونز کا مطالعہ کیا جائے گا۔

6 آلہ ہیلیو (HELIO) یہ آلہ سورج کی فضا کا مشاہدہ کرے گا۔ خاص طور پر کرہ لون (Chromosphere) اور سورج کا ہالہ۔

7 آلہ میگ (MAG) یہ آلہ سورج کی مشاہدہ گاہ ایل۔اول کے سورج کی طرف کے حصہ پر نصب ہے۔ یہ آلہ مقناطیسی علاقہ کا سینسر ہے۔ اس آلہ کو لیباریٹری برائے الیکٹرو آپٹکس سسٹم (LEOS) نے تیار کیا ہے۔ یہ آلہ بین سیاروی قدر (Magnitude) اور زمین کے گرد مقناطیس کی سمت ناپے گا۔

مستقبل میں ہندوستانی خلائی اسرو تنظیم کے مزید خلائی پروگرام آنے کی امید کی جارہی ہے۔

وہ بچے و بچیاں جو اس مضمون کا مطالعہ کررہے ہیں، وہ ابھی سے اپنی زندگی میں عظیم سائنس داں، تکنیکی ماہر، اسٹرونائٹ وایروانجینئر وغیرہ بننے کی تیاری شروع کردیں۔ اس کے لیے آپ کو اپنے اسکول میں مضامین ریاضی، سائنس، بایولوجی، فزیکس پر زیادہ سے زیادہ دھیان دینا ہوگا۔

حوالہ جات

1 کتاب 'خلا میں ہندوستانی پروگرام کی جھلکیاں' مصنف: انیس الحسن صدیقی، شائع 2018، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی مسائل، حکومت ہند، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025

2 خلائی اسرو تنظیم کی ویب سائٹ:
http:www.isro.org/

3 مضمون 'چاند پر قدم، نظر سورج پر' (Feet on Moon, eyes on Sun)، مصنف: انونا دت، شائع: دی انڈین ایکسپریس، نئی دہلی ایڈیشن، بتاریخ 29 اگست

4 مضمون: ''سورج کے نزدیک: آدتیہ ایل۔اول مشن اور اس کے مقاصد'' (The Sun up close: Aditya l-1 mission and its objectives) مصنف: انجلی مرار، شائع، دی انڈین ایکسپریس، نئی دہلی ایڈیشن، بتاریخ 2 ستمبر، 2023

■

A. H. Siddiqui
679, Sector-22-B
Gurugram-122015
Mob.: 9654949434
aneessiddiqui2003@gmail.com

اُپنشد

رائے شیومو ہن لعل ماتھر

لفظ اُپنشد کا ابتدائی مفہوم گرو کے قدموں کے نزدیک بیٹھنا اور اطاعت گزاری کے ساتھ اس کے اپدیش کو سننا تھا۔ چنانچہ مکس ملر اپنشد کی تمہید میں کہتا ہے کہ سنسکرت زبان کی تاریخ اور ذہانت اس بات میں کچھ شبہ باقی نہیں رکھتی کہ ابتدا اُپنشد کا مفہوم مجلس تھا اور بالخصوص ایسی مجلس جو شاگردوں پر مشتمل ہو اور جو اپنے استاد کے چاروں طرف ادب سے تھوڑے فاصلہ پر جمع ہوں۔ ڈیوسن کا خیال ہے کہ اس لفظ کا مطلب پوشیدہ تعلیم ہے جو پردۂ راز میں دی جاتی ہے اور خود اپنشدوں کی بہت سی عبارتوں سے ان کا ثبوت ملتا ہے۔ مکس ملر کو بھی اتفاق ہے کہ یہ لفظ اپنشدوں میں اس معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس تعلیم کو پوشیدہ رکھنے کے لیے بہت سے احکام کی تعمیل کرنی پڑتی تھی اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ تعلیم اسی شاگرد یا طالب علم کو دی جائے جو اپنی اعلیٰ اخلاقی پابندی اور نیک خواہشات سے خود کو سننے کا اہل ثابت کرے۔ اپنشدوں کے مشہور شارح شنکر اچاریہ نے اس لفظ کو ماخذ 'سد' قرار دیا ہے۔ جس کے معنی تباہ کرنے کے ہیں اور یہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ جبلی جہالت کو تباہ کرتا ہے اور صحیح علم کے اظہار سے نجات کی طرف لے جاتا ہے لیکن اگر ہم ان بہت سی عبارتوں کا مقابلہ کریں جن میں لفظ اپنشد واقع ہوا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ڈیوسن کے معنی درست ہیں۔ اس بارے میں خصوصی توجہ دی جاتی تھی کہ یہ تعلیم کسی غیر مستحق کو نہ دی جائے تا کہ اس کے بارے میں غلط فہمی اور اس کا غلط استعمال یا بے جا تصرف نہ ہو سکے۔ چنانچہ 'پرشن اپنشد' کے قول کے مطابق چھ شاگرد ایک بڑے گرو کی خدمت میں اعلیٰ ترین حقیقت کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے پہنچتے ہیں لیکن گرو تعلیم دینے سے قبل یہ مشورہ دیتا ہے کہ وہ ایک سال تک اس کے ساتھ سکونت اختیار کریں۔ بظاہر اس غرض سے کہ ان کی حرکات و سکنات پر نظر رکھی جائے، تا کہ ان کو تشفی ہو جائے کہ وہ ایسی تعلیم کے مستحق ہیں اور 'کٹھ اپنشد' میں جب نچکیتا یہ جاننا چاہتا ہے کہ روحِ انفرادی یا جیو آتما موت کے بعد زندہ رہتی ہے یا نہیں، تو یم (موت کا دیوتا) اس وقت تک کوئی جواب نہیں دیتا جب تک کہ اس کم سن طالب علم کے خلوص اور ذہنی قوت کی پوری آزمائش نہیں کر لیتا۔ ست اور آست کی تمیز کے بغیر کسی کو اعلیٰ ترین صداقت کی تعلیم دینے سے گریز کرنے کا طریقہ کچھ ہندوستان میں ہی نہ تھا بلکہ تمام قدیم باشندوں میں سب جگہ پایا جاتا تھا۔

اُپنشدوں کے ادب کا جو کہ نسلاً بعد نسل ہم تک منتقل ہوا ہے، ماخذ کا پتا چلانا کسی قدر دشوار ہے۔ ہندو روایت میں ان کا وہی رتبہ ہے جو ویدک ادب کی دیگر نوع مثلاً 'منتروں' یا 'برہمنوں' کو دیا گیا ہے۔ ان سب کو حیرت انگیز انکشاف یا 'اشروتی' خیال کیا جاتا ہے یعنی یہ ایسی تصانیف ہیں جن کا مصنف کوئی انسانی وجود نہیں ہے۔ اپنشدوں میں ہمیں ادھر اُدھر ایسے مختصر اور پر مغز بیان ملتے ہیں جن میں 'سوتروں' یا ضابطوں کے مخصوص نشان پائے جاتے ہیں اور وہ ادبی مسالہ جس میں وہ مضبوطی کے ساتھ جمے ہوئے ہیں، کچھ اس نہج کا ہے کہ جس سے ان میں محفوظ صداقت کی تشریح اور اس کا تفصیل سے بیان ہو جاتا ہے۔ مزید برآں ان بیانات کو متعدد جگہوں پر اپنشد کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ شروع شروع میں یہ لفظ 'سوتر' یا ضابطہ کے لیے استعمال کیا گیا ہو جس میں فلسفہ اپنشد کی اہم صداقت کا لب لباب موجود ہو۔ مثال کے طور پر (تت توام اسی) 'وہ تو ہی ہے' پیش کیا جا سکتا ہے جس سے یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ انفرادی روح اور کائناتی روح بنیادی طور پر بالکل ایک اور یکساں ہے۔ قدیم زمانے میں اسی قسم کے فلسفیانہ سوتروں کا راز گرو اپنے چیلے پر افشا کرتے تھے اور اسی موضوع پر تشریحی تقریریں پہلے ہوتیں تو کبھی بعد میں۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ان تقریروں نے خاص صورتیں اختیار کر لیں اور ان اپنشدوں کے آغاز کا سبب نہیں، جو اس وقت ہمیں دستیاب ہیں۔ اگر چہ اس وقت تک یہ تحریری شکل میں نہیں لائی گئی تھیں۔ جس طریقے پر کہ اصل عبارت کی نشو و نما ہوئی ہے۔ یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ اس میں فقط ایک گرو کی تعلیم ہی نہیں ہے بلکہ اساتذہ کا ایک سلسلہ ہے اور اس نشو و نما میں قدیم تصورات نئے تصورات سے مل جل گئے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اس امر کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ ایک ہی اپنشد کی تعلیم میں بعض وقت مختلف عناصر نظر آتے ہیں۔ ایک زمانے کے ہندوؤں کا قدیم علم و فضل جب اکٹھا اور مرتب کیا گیا تو اپنشد اس صورت میں 'برہمن' ادب کے ساتھ تتمہ کے طور پر شامل کیے گئے اور جب یہ ایک ہی صنف میں شامل کیے گئے تو دونوں یکساں قدیم شمار کیے جانے لگے۔ اس طرح ویدوں کے آخر میں واقع ہونے کے سبب اپنشدوں کو ویدانت کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ قدیم اور مستند اپنشدں کا عہد ٹھیک طور سے معین نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ان کے کسی مصنف کا حوالہ دیا جا سکتا ہے لیکن یہ سب بدھ سے قبل قرار دیے جا سکتے ہیں۔ کائنات کی فلسفیانہ تشریح کرنے میں وہ انسان کی اولین جد و جہد کی نمائندگی کرتے ہیں

اس لحاظ سے انسانی فکر کی تاریخ میں بہت ہی انمول ہیں۔ وہ تمام نظامات ہاندی فلسفے کے اور بالخصوص 'ویدانت' کے اساسی عناصر ہیں۔ وہ تاریخی اہمیت سے بہت آگے ہیں۔ اس لیے کہ ان کی نرالی روحانی قوت اور ان کی عالم گیر دل کشی کا عنصر فکر کی از سر نو تعمیر میں اور مستقبل کے لیے زندگی کا از سر نو خاکہ تیار کرنے میں بہت زیادہ اثر پذیر ہے۔

یہ اپنشد بالخصوص جو کافی ضخیم ہیں زیادہ تر مکالموں کے طرز میں ہیں۔ ان کا طریقہ استدلال فلسفیانہ کے بجائے شاعرانہ ہے۔ یہ فلسفیانہ نظمیں ہیں جو عام طور پر استعارے اور کنایے کے ذریعے صداقت کا اظہار کرتی ہیں۔ طرز ادا میں بہت زیادہ حذف عبارت سے کام لیا گیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان تصانیف کی تفسیر کے لیے وہی شخص مخصوص کیا جاسکتا ہے جو آسانی سے اس کمی کو پورا کر سکے جو موضوع کو پیش کرتے وقت رہ گئی تھی۔

ویدک ادب پر مشتمل تصانیف میں سے غیر ملکیوں کی توجہ سب سے پہلے اپنشدوں پر مبذول ہوئی۔ ان میں سے کئی کتابوں کا ترجمہ مغلوں کے زمانے میں فارسی میں کیا گیا اور پھر ان کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا گیا اور لاطینی زبان کے ذریعے یورپ میں پہلی مرتبہ ان سے واقفیت ہوئی۔ چنانچہ شوپنہار کو اپنشدوں کا، جنھیں وہ نہایت قابل قدر سمجھتا ہے، علم اسی طرح حاصل ہوا۔ اس نے اپنی مشہور کتاب میں اپنشدوں کے متعلق اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ ''اپنشد کی ہر سطر مستحکم، معین، کامل اور متناسب معنی پیش کرتی ہے۔ ہر ایک فقرے سے عمیق، اصلی، پرجلال خیالات برآمد ہوتے ہیں اور وہ سب ایک اعلیٰ، مقدس اور باوقار اسپرٹ سے چھایا ہوا ہے۔ تمام دنیا میں اصلی اپنشدوں کے سوا کوئی مطالعہ اس قدر مفید اور اعلیٰ نہیں ہے۔ یہ میری زندگی کی تسکین ہے اور یہی میری موت کے وقت وجہ تسلی ہوگا۔'' شوپنہار کے ذریعے اپنشدوں کا مطالعہ جرمنی میں زیادہ ہوا اور سنسکرت کے مطالعے سے عام دلچسپی بڑھی تو یہ اپنشد دیگر ممالک میں بھی جا پہنچے۔ حالیہ زمانے میں ان کے بے شمار ترجمے راست سنسکرت سے مغربی زبانوں میں کیے گئے ہیں اور ان کی تعلیم غیر ملکی عالموں کے لیے جاذب توجہ رہی ہے۔ فلسفہ اپنشد سے متعلق بہت سی شائع شدہ کتابوں میں سے ڈیوسن کی اعلیٰ درجے کی تصنیف کا ذکر ضروری ہے جو خاص پر از معلومات ہے اور جس میں اپنشدوں کے مکمل خلاصے یا لب لباب بیان کرنے کے لیے بڑی احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔

اپنشد میں دلچسپی کا مرکز بجائے بیرونی خالق کے اندرونی آتما ہو جاتا ہے، ویدوں کی وحدت پرستی کے میلان کا فطری نشو و نما خدا پرستی کی ترقی یافتہ شکل میں ہوسکتا تھا نہ کہ اس نظریے کی طرف کہ ذات ہی اصلی حقیقت ہے اور باقی ہر ایک چیز اس سے بالکل ادنیٰ حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں نہ تو کسی قسم کی عبادت کی جاتی ہے نہ کسی دیوتا اور پجاری کا کوئی تعلق ہی معلوم ہوتا ہے بلکہ ساری تلاش اعلیٰ ترین صداقت کی ہے اور انسان کی حقیقی ذات ہی حقیقتِ عظمیٰ معلوم ہوتی ہے۔ فلسفیانہ فکر کی تاریخ میں یہ سب سے اہم واقعہ ہے کہ ہندو ذہن برہمنی فکر سے اپنشدی خیال کی طرف راغب ہوا اور دلچسپی کا مرکز بیرونی خالق کی بجائے آتما ہوگئی۔ فلسفیانہ حیثیت کا یہ تغیر بے حد دلچسپ ہے اس لیے کہ اپنشدوں میں معروض سے موضوع کی طرف خیال کی تبدیلی کسی فلسفیانہ بحث یا نفس کی دقیق تحلیل سے حاصل نہیں کی گئی بلکہ اس کا تجربہ براہِ راست ادراک سے ہوا ہے اور یہ اذعان جس سے کہ اس صداقت کو سمجھ لیا گیا ہے، کسی بھی مطالعہ کرنے والے پر اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہ سمجھنا تو بالکل خلافِ قیاس ہے کہ طریق 'برہمن' کے تصورات سے اپنشدوں میں 'برہمہ' کے نظریے کا نشو و نما ہوا ہوگا۔

سب سے قدیم اپنشد نثر میں تحریر ہوئے ہیں اور اپنے طرز ادا میں تقریباً رموزی کیفیت رکھتے ہیں۔ وہ بسیط، پر مغز اور دل پر اثر کرنے والے ہیں۔ ہم ان کو بار بار پڑھیں تب بھی نہیں تھکتے۔ یہ ہمیشہ تازہ ہیں، ان کا لطفِ عبارت ان کے خیالات کی قیمت سے الگ ہے، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ لفظ اپنشد پوشیدہ اصول یا تعلیم کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اپنشد تعلیمات کا منشا یہ تھا کہ رازداری کے ساتھ خلوص سے دریافت کرنے والوں کو یہ تعلیم دی جائے جو اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ خود ایثاری کے جذبے سے متصف ہوں اور جن کی غرض نجات حاصل کرنی ہو اور اس طرح ایک مرتبہ جب اپنشد کی اعلیٰ ترین طرز تحریر کا طریقہ ظاہر ہوگیا تو وہ مذہبی لوگوں کے لیے خاص دلچسپی اور دل فریبی کا باعث بن گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب سنسکرت میں دوسری نثر و نظم کی تصنیفیں لکھی جانے لگیں۔ تب بھی اپنشدی صورت موقوف نہیں ہوئی۔ اس طرح اگرچہ ابتدائی اپنشد 500 ق م میں لکھے گئے، تاہم ہندوستان میں اسلامی اثر پھیلنے تک وہ اسی طرح لکھے جاتے رہے ہیں۔ ان میں ابتدائی اور اہم ترین وہ ہیں جن کی شرح شنکراچاریہ نے کی ہے۔ ان کے نام ہیں برہدآرنیک، چھاندگیہ، ایتریہ، تیتتریہ، ایمن، کین، کٹھ، پرشن، منڈک، ماندوکیہ، اس سلسلے میں یہ بات قابل غور ہے کہ الگ الگ اپنشد ایک دوسرے سے مضمون اور طرز بیان میں مختلف ہیں۔ بعض تو وحدتی اصول ذات پر زور دیتے ہیں کہ وہی ایک حقیقت ہے، بعض یوگ کے عمل پر زور دیتے ہیں، بعض شیوا یا وشنو کی عبادت پر زور دیتے ہیں اور بعض فلسفہ یا تشریح بدن پر۔ حسبِ علی الترتیب ان کے نام پڑ گئے۔ یہ سب مل کر تعداد میں 108 ہیں۔

> اپنشد میں دلچسپی کا مرکز بجائے بیرونی خالق کے اندرونی آتما ہو جاتا ہے، ویدوں کی وحدت پرستی کے میلان کا فطری نشو و نما خدا پرستی کی ترقی یافتہ شکل میں ہوسکتا تھا نہ کہ اس نظریے کی طرف کہ ذات ہی اصلی حقیقت ہے اور باقی ہر ایک چیز اس سے بالکل ادنیٰ حیثیت رکھتی ہے۔

اپنشد الہامی ویدک ادب کے اختتامی حصے ہیں اور ان کو ویدانت کہا جاتا ہے۔ بالعموم یہ یقین ہے کہ سب سے اعلیٰ حقائق صرف ویدوں کے الہام ہی میں پائے جاتے ہیں۔ عقل کو عام طور پر کم درجہ دیا گیا ہے اور اس کا اصلی استعمال یہ تھا کہ انھیں دانائی کے ساتھ ویدوں کے تصورات کے معنی واضح کرنے کے لیے کام

میں لایا جائے۔ یہ خیال کیا گیا ہے کہ حقیقت اور صداقت کا اعلیٰ علم کلیتاً اپنشدوں میں ظاہر ہو چکا ہے اور عقل کا کام صرف یہ تھا کہ اس کو تجربے کی روشنی میں کھولے اور یہ انتہائی گستاخی سمجھی جاتی تھی کہ کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی فاضل اور لائق کیوں نہ ہو، وہ اپنی رائے کی سند پر یا اپنی زبردست دلیلوں کی بنا پر صداقت کو بسیط طور پر بیان کرسکے۔ اس کا نظریہ اس وقت تسلیم کیا جاتا جب کہ وہ یہ ثابت کرے کہ اپنشد اس کی تائید کرتے ہیں۔ اس طرح ہندو فلسفے کے اکثر مذاہب اپنا اصلی فرض یہ سمجھتے ہیں کہ اپنشدوں کی تعبیر اس غرض سے کریں کہ یہ ثابت ہو کہ ان کا بیان کیا ہوا نظریہ ویدانت کے اصول کو ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح ہر شارح نے اپنے موقعے پر عبارتوں کو خود اپنے نمایاں اصولوں کے موافق بنا کر پیش کیا اور دوسروں کو دبا دیا ان کی تشریح کرکے ان کو رد کردیا لیکن اپنشدی تعبیر کے مختلف نظامات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شنکر آچاریہ نے جو تعبیر کی ہے وہ وسیع طور پر ابتدائی اصولوں کے عام مجموعے کی رائے کو ظاہر کرتی ہے، اگرچہ بعض اصول ایسے ہیں جو دوسرے نظامات کے اصولوں پر ممیز طور پر پردہ ڈالتے ہیں۔ اس طرح ویدانت بالعموم شنکر آچاریہ کی تعبیر سے وابستہ ہے۔ اگرچہ اور بھی نظامات ہیں جو اس امر کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ حقیقی ویدانت کے اصول کو ظاہر کرتے ہیں، لیکن صرف شنکر کے نظام کو ہی نظام ویدانت کہا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں اپنشدوں کی جدید تعبیر کرنے والے کا فریضہ ہو جاتا ہے کہ وہ ان شرح کرنے والوں کی طرف مطلق توجہ نہ دے اور اپنشد کو باضابطہ کتاب نہ سمجھے بلکہ مختلف خیالات کا خزانہ سمجھے جس میں سب متاخر فلسفیانہ تصورات ابھی تک حیرت انگیز انکشاف کی حالت میں ہیں۔ اگرچہ یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ شنکر کا وحدتی اصول یا اس حد تک رسائی بہت سے اپنشدوں کا واحد مضمون ہے۔

جدید تعبیر کرنے والے کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ وہ قدیم تعبیر کرنے والوں کی پیروی نہ کرکے اپنشدوں کو مستقل طور پر علیحدہ علیحدہ دیکھے اور ان کے معنی متعین کرے لیکن ربط عبارت کا خاص لحاظ رکھے جس میں وہ ظاہر ہوتے ہیں، صرف یہی وہ طریقہ ہے جس سے ہم اپنشدوں میں دوسرے ہندی نظامات کے افکار کے اثرات کا مقابلہ کرسکتے ہیں اور اس طرح ان میں افکار کے میلانات کی ابتدائی تحریروں کو پاسکتے ہیں۔

اپنشد کوئی باقاعدہ کتابیں نہیں ہیں جو کسی شخص نے لکھی ہوں، بلکہ وہ خود کلامیوں، مکالموں یا قصوں پر مشتمل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں سادہ مباحث ہیں، لیکن کہیں علم کی شیخی یا منطقی ورزش نہیں، ایک سرسری طور پر پڑھنے والا بھی رشیوں کے جوش، سرگرمی اور صداقت طلبی کو دیکھ کر متحیر ہو جاتا ہے کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ایسے استاد کی تلاش میں بڑے شوق سے مارے مارے پھرتے ہیں جو ان کو برہمہ کے طریقے پر تعلیم دینے کے لائق ہو کہ برہمہ کہاں ہے، اس کی نوعیت کیا ہے۔ ان کو اس تصور کی تلاش تھی کہ خارجی عالم کی تعبیر کے تحت ایک غیر متغیر حقیقت ہے اور وہ عین اس کے مطابق ہے جو انسان کے جوہر میں ہے۔ 'سمہتا' کے آخری زمانے میں ایسے لوگ تھے جو عالم کے واحد خالق اور نگرانی کرنے والے کے تصور تک پہنچ گئے تھے اور اس کو مختلف ناموں سے یاد کرتے تھے۔ مثلاً پرجاپتی، وشوا کرما، پرش، برہمہ، لیکن یہ ربانی متصرف ابھی تک صرف دیوتا ہی تھا اور اس دیوتا کی تلاش اپنشدوں میں شروع ہوئی۔ رشیوں نے ابتدا ہی اس خیال کے ساتھ کی کہ اعلیٰ اہتمام کرنے والا جو ہر وہ ہے جو انسان اور عالم پر حکمران ہے لیکن اس کی نوعیت کیا ہے؟ کیا وہ فطرت کے دوسرے دیوتاؤں کے مطابق ہے یا وہ ایک جدید دیوتا ہے یا کوئی دیوتا ہی نہیں؟ اپنشد اس جستجو کی تاریخ پیش کرتے ہیں اور ان نتائج کا ذکر کرتے ہیں جو حاصل ہوئے۔

جدید تعبیرکرنے والے کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ وہ قدیم تعبیر کرنے والو ںکی پیروی نہ کرکے اپنشدوں کو مستقل طور پر علیحدہ علیحدہ دیکھے اور ان کے معنی متعین کرے لیکن ربط عبارت کا خاص لحاظ رکھے جس میں وہ ظاہر ہوتے ہیں، صرف یہی وہ طریقہ ہے جس سے ہم اپنشدوں میں دوسرے ہندی نظامات کے افکار کے اثرات کا مقابلہ کرسکتے ہیں اور اس طرح ان میں افکار کے میلانات کی ابتدائی تحریروں کو پاسکتے ہیں۔

اس جستجو میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ابھی آرینکی تصورات اور عبارت کی علامتی صورتوں سے باہر نہیں آئے ہیں 'پران' (حیاتی سانس) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ انسانی زندگی میں لازمی وظیفہ ادا کرتا ہے اور بہت سے قصے یہ ثابت کرنے کے لیے بیان کیے گئے ہیں کہ وہ دوسرے اعضا مثلاً آنکھ، کان، وغیرہ پر فوقیت رکھتا ہے اور اسی پر سب وظائف کا دارومدار ہے۔ پران کی فوقیت کے اس اقرار سے اس پر برہمہ کے طور پر مراقبہ کرنا شروع ہوا گویا کہ وہ بہت مفید نتائج برآمد کرنے والا ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ 'آکاش' کی اعلیٰ خصوصیات، ہمہ جائیت اور ازلیت کے باعث اس پر برہمہ کے طور پر مراقبہ کیا جاتا ہے اور اسی طرح من یا نفس اور آدتیہ یا سورج پر برہمہ کے طور پر غور کیا جاتا ہے۔ پس برہمو کے حاصل کرنے کے لیے ہم ایک سرگرم جستجو دیکھتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اس نصب العین کا تشفی بخش جواب نہیں دے سکا جو برہمہ سے درکار تھا۔ برہمہ کی نوعیت کے صحیح علم تک پہنچنے کے لیے رشیوں کو ایسی بہت ناکامیوں، جدوجہد اور کشمکش سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

ویدک شعرا کے دل مرئی ظہور کے دیوتاؤں کی پرستش کے اس قدر طویل مدت سے عادی تھے کہ وہ ایک مثبت اور معین برہمہ کی تلاش میں اس کو ترک نہیں کرسکتے تھے۔ انھوں نے قدرت کی پرجلال قوتوں کی بہت سی علامتوں کی آزمائش کی، لیکن کسی سے اطمینان کلی نہ حاصل ہوسکا، برہمہ کس کے مانند ہے، وہ نہیں جانتے تھے، وہ اپنی روحوں کی گہری طلب میں اس کا دھندلا اور خواب کا سا خیال رکھتے تھے جو مستقل اصطلاحات میں ظاہر نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہی چیز ان کو منزل مقصود تک لے گئی کیونکہ وہ بہترین سے کم کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوسکتے تھے جہاں تک انھوں نے آخری حقیقت کو متعین اور ایجابی صورت دینے کی کوشش کی، وہ ناکام رہے۔

■

ماخذ: قدیم ہندی فلسفہ، **مصنف:** رائے شیو موہن لعل ماتھر، **دوسرا ایڈیشن:** 1998، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

خصوصی گفتگو

خان محمد رضوان

اردو کا صوتی ذخیرہ اور صوتی نظام لاثانی ہے

پروفیسر رئیس انور

ادب بنیادی طور پر موضوع، اسلوب اور ہیئت کا اٹوٹ، مربوط اور دلکش مجموعہ ہوتا ہے۔ ادب کا مطالعہ کرتے وقت یہ دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس میں جذبہ، احساس یا خیال کیسا ہے۔ اس کی زبان اور اس کا اسلوب کیسا ہے نیز جس ہیئت میں پیش ہوا ہے، اس میں سما کر اس کے تقاضوں کو پورا کررہا ہے یا نہیں۔

خان محمد رضوان: پروفیسر رئیس انور صاحب، یوں تو آپ کی تحریریں رسالوں میں ایک عرصے سے دیکھ رہا ہوں مگر ذاتی طور پر آپ کے متعلق میری واقفیت کم ہے۔ اپنے بارے میں قارئین کو کچھ بتائیں۔

پروفیسر رئیس انور: رضوان صاحب، اس مصاحبے کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ دراصل میرا آبائی وطن بہار شریف ضلع نالندہ ہے۔ وہاں کے استھاواں بلاک میں ایک گاؤں موتنی ہے جہاں میرے جد امجد جیوٹھلی (ضلع پٹنہ) سے آکر آباد ہوگئے تھے۔ میرے والد مجیب الرحمن مرحوم بچپن میں تعلیم حاصل کرنے کلکتہ چلے گئے تھے اور فراغت کے بعد وہیں پر پیسڈینسی کالج (جسے اب یونیورسٹی کا درجہ مل گیا ہے۔) میں فارسی کے استاد ہوگئے۔ اسی بنا پر میری پیدائش اور رہائش وغیرہ کلکتہ میں تھی۔ محمد جان ہائی اسکول، مولانا آزاد کالج اور کلکتہ یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کی۔ 1978 میں ایم اے کرنے کے بعد ریسرچ میں مشغول ہوگیا۔ جلد ہی 1979 میں بھاگلپور یونیورسٹی میں لکچرر شپ مل گئی مگر بہ وجوہ میں نے ایک سال بعد جون 1980 میں جوائن کیا۔ جنوری 1988 میں مجھے متھلا یونیورسٹی میں ریڈر کی حیثیت سے منتخب کیا گیا۔ وہیں میں ترقی پاکر پروفیسر اور صدر شعبہ بھی بنا۔ سنٹرل لائبریری اور لائبریری اور انفارمیشن سائنس کا ڈائرکٹر بھی رہا۔ علاوہ بریں بارہ سال تک مولانا آزاد چیئر کا ڈائرکٹر رہا۔ کلکتہ کا ایک خاص ماحول، مزاج اور کلچر ہے جس سے میں متاثر ہوں۔ اس لیے بہار میں مجھے ایڈجسٹ کرنے میں دقت ہوتی رہی ہے۔ مجھے ابھی 2024 میں دوبارہ مولانا آزاد چیئر کے نگراں کے عہدے پر بحال کیا گیا ہے۔

خ د: آپ اپنے ہم عصروں پر بھی روشنی ڈالیں۔

ر ا: کلکتہ میں غلام نبی، محمد مظفر حسین، فہمیدہ بیگم اور ساجدہ بانو وغیرہ میرے ہم جماعت تھے۔ غلام نبی، وکٹوریہ میموریل کلکتہ میں آفیسر ہوگئے تھے۔ مظفر حسین اورنگ آباد (بہار) کے کسی کالج میں استاد تھے جب کہ فہمیدہ اور ساجدہ کلکتہ کے کالجوں میں تدریس کرتی رہیں۔ سینئر لوگوں میں یوسف ترقی، شمیم انور اور ابوبکر جیلانی تھے۔ یہ لوگ بھی وہیں کالج اور یونیورسٹی سے وابستہ تھے۔ بھاگلپور میں شاداب رضی اور محمد بدرالدین اچھے استاد اور دوست تھے۔ دربھنگہ میں ڈاکٹر منصور عمر، ڈاکٹر مظفر مہدی اور ڈاکٹر ارشد جمیل میرے اہم رفقا تھے۔ ان سے علم وادب پر نوک جھونک بھی ہوتی تھی۔ معاصرانہ چشمک ایک فطری عمل ہے۔ اگر یہ مثبت، صحت منداور ادب و تہذیب کے دائرے میں ہو تو اس سے فائدے بھی ہوتے ہیں۔

خ د: محترم آپ کے وقت میں اردو کے وہ کون سے رسالے تھے جو زبان وادب کی ترویج کر رہے تھے اور سب سے زیادہ آپ کو کس رسالے نے متاثر کیا؟

ر ا: ہمارے زمانے میں بیسویں صدی، شمع، سریتا اور کھلونا وغیرہ بڑوں اور بچوں میں مقبول تھے اور کلکتہ میں آسانی سے مل جاتے تھے۔ جب میں کالج میں پہنچا تو ماہنامہ آجکل، نیا دور، شاعر اور کتاب پڑھنا شروع کیا۔ بعد میں زبان وادب، پٹنہ اور روح ادب کلکتہ بھی مطالعے میں آیا۔ کالج میں استاذی پروفیسر اعزاز افضل ترقی پسندانہ مزاج رکھتے تھے۔ 'عصری ادب' اور 'عصری آگہی' ان کے یہاں زیر بحث رہتا۔ یونیورسٹی میں استاذی ظفر اوگانوی 'شب خون'، 'سوغات' اور 'الفاظ' کے مندرجات پر گفتگو کرتے۔ استاذی شاہ مقبول احمد

اور والد محترم کی توجہ کلاسیکی ادب پر مرکوز تھی۔ اسی بنا پر میں کسی خاص ادبی تحریک یا رجحان سے وابستہ نہیں ہوا۔ ہاں سن شعور کو پہنچنے کے بعد 'عصری ادب'، 'عصری آگہی'، 'الفاظ' اور 'سوغات' وغیرہ زیادہ انہماک سے پڑھتا تھا۔

خ د: آپ اپنے علمی و ادبی کام کی تفصیلات بتائیں۔

د ا: رضوان صاحب میں نے شروعات شاعری سے کی۔ شاید والد محترم اور استاذی اعزاز افضل سے قربت کا اثر تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں افسانے اور ناول بھی پڑھا کرتا تھا۔ اس لیے افسانہ نگاری کی بھی کوشش کی۔ شاعری اور افسانے کلکتہ ریڈیو پر بھی پڑھے۔ رسالے میں بھی چھپوائے۔ اس کے بعد رپورتاژ لکھے پھر مضمون نگاری اور تحقیق کی طرف راغب ہوا۔ غالب کے ایک بنگالی ہم عصر جنم جی مترا ارمان کے دو مخطوطے 'تذکرہ نسخۂ دلکشا' اور 'منتخب التذکرہ' ترتیب دے کر شائع کیا۔ ایک اور کتاب 'جنم جی مترا رمان حیات و خدمات' لکھی۔ مضامین کا مجموعہ 'بازیافت پرویز شاہدی' مرتب کیا۔ تنقیدی و تحقیقی مضامین، تقریظ، تبصرے، ترجمے وغیرہ لگاتار شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس نوع کی تحریروں کے کئی مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔ حالیہ برسوں میں 'بنگال کے اردو تذکرے' (2021) اور 'تلامذۂ میر: غلام علی راسخ عظیم آبادی' (2023) شائع ہوئی ہیں۔

خ د: آپ ہندی اور انگریزی زبان کے ادب کے مقابلے میں اردو ادب کو کہاں پاتے ہیں؟

د ا: دیکھیے اصل میں ادب اپنے ماحول میں پنپتا ہے۔ کسی بھی ملک یا علاقے، اس کے سماج، اس کے کلچر اور اس کی تہذیب کا عکس ادب میں موجود ہوتا ہے۔ مغربی ممالک کا سماج، وہاں کے جغرافیائی حالات، روزمرہ کی زندگی اور دوسرے معمولات مشرقی ملکوں سے الگ ہیں۔ وہاں کی روزمرہ کی زندگی میں بہت سی ایسی قدریں ہیں جو ہمارے یہاں معیوب سمجھی جاتی ہیں جیسے نام نہاد آزادی، از حد کھلاپن، عریانیت، تصوراتی نراجیت وغیرہ۔ اتنا کہا جاتا ہے کہ وہاں کی تقلید میں یا یورپی ادب کے اثر سے ہندی اور اردو میں بھی کچھ عناصر داخل ہوئے ہیں اور اس عمل کو Intellectualism کا نام دیا جاتا ہے۔ پھر بھی اردو ہندی کا نثری ادب اپنی الگ اور آزادانہ پہچان بنائے ہوئے ہے۔

جہاں تک ہندی ادب کا سوال ہے، افسانے، ناول، تنقید وغیرہ بڑے معیاری ہیں مگر شاعری کسی حد

ادب اپنے ماحول میں پنپتا ہے۔ کسی بھی ملک یا علاقے، اس کے سماج، اس کے کلچر اور اس کی تہذیب کا عکس ادب میں موجود ہوتا ہے۔ مغربی ممالک کا سماج، وہاں کے جغرافیائی حالات، روزمرہ کی زندگی اور دوسرے معمولات مشرقی ملکوں سے الگ ہیں۔

تک کمزور ہے۔ اردو شاعری میں جس پائے کے نفیس و نازک احساسات اور جمالیات کا دل کو چھو لینے والا اظہار ہوتا ہے اور دلکش اسلوب بھی ہوتا ہے، ہندی شاعری اس سے قدرے دور ہے۔

خ د: کیا اردو اساتذہ کا معیار کچھ کم ہوا ہے؟ اب اچھے ادیب، نقاد اور شاعر پیدا نہیں ہو رہے ہیں؟

د ا: تلخ سچائی یہ ہے کہ ہمارے کئی اساتذہ صرف ملازمت کرتے ہیں اور اردو کے استاد بن کر دوسرے کام میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ اردو زبان کے مستقبل، طلبا کے مستقبل اور تدریس کے فرائض سے انھیں کم سے کم دلچسپی ہوتی ہے۔ طلبا کو نوٹس دے کر سمجھتے ہیں کہ فرض منصبی ادا ہوگیا۔ زبان و ادب کو پڑھنے، اپنے طور پر سمجھنے اور سمجھانے سے بہت کم تعلق رکھتے ہیں۔ بعض اساتذہ تدریس کے بجائے سمینار، سمپوزیم اور جلسوں میں ایسا مصروف رہتے ہیں کہ رزق کے حلال اور حرام کی تمیز ہی نہیں رہتی۔

جب استاد اور شاگرد کا رشتہ اتنا کمزور ہو۔ تدریس کے تقاضے اور تقدس پامال ہونے لگیں تو ماحول میں بیزاری آنے لگتی ہے۔ ایسے میں درس گاہوں سے اچھے ادیب، نقاد اور شاعر کیسے نکلیں گے۔ آپ ہی سوچیے۔

خ د: کیا تحقیق و تنقید کا معیار گرا ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟

د ا: جامعاتی تحقیق میں یقیناً گراوٹ آئی ہے یہ ہر سبجیکٹ میں ہے۔ اس کی وجہ یو جی سی کے بنائے ہوئے اصول و قواعد ہیں جن کے مطابق ریسرچ پیپر اور ریسرچ ڈگری کے لیے مخصوص اضافی نمبر ہیں۔ اسی بنا پر باصلاحیت طلبا کے ساتھ ساتھ بے صلاحیت بھی اس کے لیے جگاڑ لگاتے ہیں اور ہم میں سے چند لوگ پیسے کی خاطر پیپر اور تھیسس لکھ کر بے صلاحیت یا کم صلاحیت والوں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ انھیں لکھ کر دے دیتے ہیں یا نقل کروادیتے ہیں۔ اسے ڈگری کا کمرشیلائزیشن کہنا چاہیے۔ لہٰذا معیار کی گراوٹ میں چند طلبا کے ساتھ ساتھ بعض اساتذہ بھی شریک ہیں۔

خ د: ادب کی مبادیات کیا ہیں؟ ایک طالب علم یہ کیسے محسوس کرے گا کہ اس فن پارے میں ادبیت ہے یا نہیں ہے؟

د ا: یہ بہت مشکل اور سنجیدہ سوال ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے میں یہ واضح کردوں کہ ادب بنیادی طور پر موضوع، اسلوب اور ہیئت کا اٹوٹ، مربوط اور دلکش مجموعہ ہوتا ہے۔ ادب کا مطالعہ کرتے وقت یہ دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس میں جذبہ، احساس یا خیال کیسا ہے۔ اس کی زبان اور اس کا اسلوب کیسا ہے نیز جس ہیئت میں پیش ہوا ہے، اس میں سما کر اس کے تقاضوں کو پورا کر رہا ہے یا نہیں۔ یہاں ایک مسئلہ یہ بھی سامنے آتا ہے کہ ایک ہی خیال کو کئی شاعر یا نثر نگار اپنے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں تقابل کا سوال ابھرتا ہے کہ کس فن پارے میں اثر آفرینی ہے۔ کسے پڑھ یا سن کر ہماری حس بیدار ہوجاتی ہے۔ ہمارے شعور میں گرماہٹ پیدا ہوتی ہے۔ آل احمد سرور کی زبان میں مسرت اور بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ دراصل ادب میں اسلوب کی بڑی اہمیت ہے۔ موضوع یا خیال اسی کے وسیلے سے ہیئت میں ضم ہوتا ہے۔ اس لیے میری نظر میں ادب کی قدر و قیمت کا دار و مدار اسلوب پر ہے۔ میں اسلوب کے سلسلے میں زیادہ نہیں بولوں گا۔ اس کی تعریف و تشریح بڑی پیچیدہ اور بڑی حد تک فلسفیانہ ہے۔ اس میں زبان، تکنیک اور تخلیقی عمل وغیرہ کی بحث شامل ہوجائے گی۔

خ د: کیا یہ درست ہے کہ اردو رفتہ رفتہ ختم ہوتی جارہی ہے یا اسے ختم کرنے کی سازش رچی جارہی ہے؟

د ا: اس میں بہت حد تک سچائی ہے۔ آج کل اردو جاننے والے بلکہ پڑھے لکھے لوگ ہندی سے متاثر نظر

آتے ہیں۔ اسی وجہ سے اردو کا بنیادی ڈھانچہ دن بہ دن کمزور ہوتا جارہا ہے۔ آپ غور کیجیے، اردو الفاظ اور محاورات کس تیزی سے بگڑ رہے ہیں یا بگاڑے جارہے ہیں۔ اب معلوم چلا، علاؤں، حالاتوں وغیرہ میڈیا سے ہوتے ہوئے عوام میں رائج ہوتے جارہے ہیں۔ اگر پڑھے لکھے لوگ صحت زبان کا لحاظ نہیں رکھیں گے تو زبان کمزور ہوگی اور ہماری اردو زبان کا اردو تہذیب کا نقصان ہوگا۔

آسان زبان یا ہندوستانی الفاظ پر مشتمل زبان استعمال کرنا اچھا ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اردو میں علاقائی الفاظ بھی کھپائے جاسکتے ہیں مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اردو قواعد، اس کے اپنے کینڈا اور اس کی اپنی پہچان سے سمجھوتہ کیا جائے۔

خ د: کیا مدارس کے فارغین کی وجہ سے آج اردو بچی ہوئی ہے؟ اگر مدرسہ والے نہ ہوتے تو اردو میں قابل قدر کام نہ ہوتا؟

د ا: یہ جزوی طور پر درست ہے۔ آج کل بہار کے مدرسوں سے جو بچے اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے آرہے ہیں، وہ بہت کمزور ہوتے ہیں۔ ان میں ادب کا وہ شعور نہیں ہوتا جو پہلے کبھی ہوا کرتا تھا۔ بہار میں عالم اردو کی سند والے ایم۔ اے۔ اردو میں داخلہ لیتے ہیں۔ ان کا املا اور جملہ بہتر ہوتا ہے مگر شعر و ادب اور تاریخ ادب کی سمجھ برائے نام ہی ہوتی ہے۔ ان پر اساتذہ کو زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے۔

جہاں تک قابل قدر کام کا سوال ہے۔ جیسا کام پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر ظفر اوگانوی، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر ظفر احمد صدیقی وغیرہ نے کیا ہے جو بہت پہلے مدرسوں سے فارغ ہوئے تھے مگر ان لوگوں کے بعد ایک گیپ ہوگیا ہے۔

خ د: اردو کے مستقبل کے تعلق سے آپ کی کیا رائے ہے؟

د ا: میری سمجھ سے اردو کا مستقبل زیادہ روشن نہیں ہے۔ ایک عرصے سے لپی بدلنے کی بات ہورہی ہے۔ اردو کے کئی اساتذہ کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں جو صحیح زبان نہیں لکھ سکتے ہیں، املا تک غلط لکھتے ہیں۔ پانچ دس منٹ کسی موضوع پر بول نہیں سکتے ہیں۔ میں نے بہار، کے دو مشہور کالج اور دو یونیورسٹی میں تدریس کی ہے اور بہت کچھ دیکھا ہے۔ اردو کے طلبا عام طور پر دستخط یا درخواست کے لیے ہندی کا انتخاب کرتے ہیں۔ اکثر طلبا اردو میں درخواست لکھ بھی نہیں سکتے۔ اب ایسی صورت میں اردو کے مستقبل کے بارے میں کیا رائے دی جائے۔ میرا ماننا ہے کہ شمالی ہندوستان میں بول چال کی زبان اردو ہے مگر لکھنے کی زبان ہندی ہوگئی ہے۔

> **آسان زبان یا ہندوستانی الفاظ پر مشتمل زبان استعمال کرنا اچھا ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اردو میں علاقائی الفاظ بھی کھپائے جاسکتے ہیں مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اردو قواعد، اس کے اپنے کینڈا اور اس کی اپنی پہچان سے سمجھوتہ کیا جائے۔**

خ د: اردو رسم الخط ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنتا رہا ہے۔ غیر تو غیر اپنے بھی اردو رسم الخط کی مخالفت کرتے ہیں۔ کیا اردو کو اس کے رسم الخط کے بغیر باقی رکھا جاسکتا ہے؟

د ا: دیکھیے بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو اردو رسم الخط ہی میں زندہ رہ سکتے ہیں۔ دیوناگری یا رومن لپی میں وہ دم توڑ دیں گے۔ ذ، ز، ض، ظ والے الفاظ تو فنا ہوجائیں گے۔ ان کا صحیح تلفظ ناپید ہوجائے گا۔ یہی حال 'ژ' والے لفظوں کا ہوگا۔ دراصل اردو کا صوتی ذخیرہ لاثانی ہے۔ اس کا نظام بھی بڑا جامع اور وقیع ہے۔ اصوات کی ایسی زرخیزی غالباً دوسری کسی زبان میں نہیں ہے۔ صوتی ذخیرے کا دارو مدار لپی پر ہے۔ لپی کی تبدیلی سے یہ بے نظیر ذخیرہ بالکل ختم ہوجائے گا۔ اردو کی ساری دلکشی، چاشنی اور سحر انگیزی مختلف اصوات کی شمولیت اور انضمام سے ہے اور اس معاملے میں برصغیر کی کوئی زبان اردو کی ہمسر نہیں ہوسکتی۔ دوسری کسی لپی میں ایسی انضمامی توانائی اور تخلیقی سلیقہ مندی نہیں ہے کہ حسن ادا کے ساتھ دوسری زبانوں کے الفاظ کو نیا پیراہن عطا کردے یا دوسری زبانوں کے الفاظ کو صحیح Accent کے ساتھ ادا کرسکے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ زبان اپنی لپی کے ساتھ زندہ رہتی ہے۔ ہمیں عبرانی زبان سے سبق لینا چاہیے۔ قیام اسرائیل سے قبل یہودیوں کا کوئی الگ ملک نہیں تھا مگر اس قوم نے اپنی زبان کو سینہ بہ سینہ محفوظ رکھا اور ملک ملنے کے بعد وہاں اسے رائج کیا۔ اس لیے اردو زبان کو اس کی لپی کے ساتھ ہی زندہ رکھا جاسکتا ہے ورنہ یہ جس لپی میں لکھی جائے گی، اسی میں ڈھل کر ختم ہوجائے گی۔

خ د: اچھا اب یہ بتائیں کہ نئی نسل اردو سے کیوں دور ہوتی جارہی ہے؟ اسے اردو سے کیسے جوڑے رکھا جاسکتا ہے؟

د ا: دیکھیے، یہ دور کمرشیلائیزیشن اور ٹیکنالوجی کا ہے۔ تعلیم کا بہت چرچا ہے مگر روایتی تعلیم کی طرف سماج کا کمزور طبقہ راغب ہوتا ہے۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی تحصیل باعث فخر ہے مگر مہنگی ہے۔ سوائے ہندی کے دوسری دیسی زبانوں کا اسکوپ کم سے کم ہوتا جارہا ہے۔ اردو بھی اس رجحان سے متاثر ہورہی ہے۔ اچھے پرائیویٹ اسکولوں بلکہ کئی سرکاری اسکولوں میں اردو کی تعلیم نہیں ہوتی ہے اور گارجین بڑی خوشی سے بچوں کو انگریزی کے علاوہ ہندی یا دوسری زبان پڑھنے دیتے ہیں۔ کہیں کوئی احتجاج یا تحریک نہیں ہوتی۔ ان کا اصل مقصد اچھی اور اعلیٰ مروجہ تعلیم حاصل کرنا ہوتا ہے۔

اس صورت حال میں اگر ہمیں اپنے بچوں کو اپنے کلچر، اپنی تہذیب اور اپنے مذہب سے جوڑے رکھنا ہے تو گھر پر محنت کرنا ہوگی۔ اردو تحریک کا نعرہ دینے اور میٹنگ کرکے اخباروں میں فوٹو چھپوانے سے مسئلہ حل ہونے والا نہیں ہے۔ گھر پر اردو اخبار، رسالے اور کتابیں مہیا کرانا اور بچوں کو انھیں پڑھنے کی ترغیب دینا ہوگی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تحصیل کوئی بری بات نہیں مگر اسی کے ساتھ اپنی زبان کی بھی جانکاری رکھنے میں کیا قباحت ہے۔

خ د: رئیس انور صاحب میں بہت ممنون ہوں کہ اردو زبان و ادب کے حوالے سے آپ سے تفصیلی بات چیت ہوئی اور مختلف موضوعات پر آپ کے خیالات سے آگاہ ہونے کا موقع ملا۔ ایک بار پھر آپ کا شکریہ۔

Dr. Khan Mohd Rizwan
D-307, M.M.I Publisher
Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar
New Delhi- 110025
Mob.:9810862283
afeefrizwan@gmail.com

ماہنامہ شاعر اور افتخار امام صدیقی

قمر احمد

بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی اردو زبان و ادب کے ادبی رسائل کے لیے بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس دور میں 'اردو'، 'نگار'، 'ہمایوں'، 'نیرنگ خیال'، 'عالم گیر'، 'نقاد'، 'صحیفہ'، 'ساقی'، 'ادب لطیف'، 'سب رس' اور 'شاعر' جیسے موقر رسائل منصۂ شہود پر آئے۔ ماہنامہ 'شاعر' کا شمار اردو کے ان معدودے چند رسائل میں کیا جا سکتا ہے جو اپنی قدامت اور مقبولیت دونوں اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی مقبولیت کی بنیاد پر بعض تجزیہ نگاروں نے شاعر کو ادبی رسائل کا سرتاج ہی نہیں بلکہ سالار کارواں کہا ہے۔ ماہنامہ 'شاعر' کو علامہ سیماب اکبر آبادی نے غالب کی برسی پر 15 فروری 1930 کو بطور پندرہ روزہ اخبار کی حیثیت سے آگرہ سے جاری کیا۔ دو سال سے بھی کم عرصہ میں ماہنامہ کی صورت اختیار کر گیا۔ مارچ 1932ء تک 'شاعر' پندرہ روزہ اخبار کی ہیئت میں بیس صفحات پر شائع ہوا، اس کے بعد اپریل مئی کا مشترکہ شمارہ تیس صفحات پر محیط ہے۔ 'شاعر' کی شروعات ادارہ 'قصر الادب' کی زیر نگرانی ہوئی جس کو سیماب اکبر آبادی نے 1923 میں آگرہ میں قائم کیا تھا۔ حامد اقبال صدیقی لکھتے ہیں:

''اولاً اسے ہفت روزہ اخبار کے طور پر شائع کرنے کا منصوبہ تھا لیکن غالب کے یوم وفات 15 فروری 1930 کو پندرہ روزہ اخبار شاعر کا اولین شمارہ منظر عام پر آیا، اس کے نگراں خود سیماب اور مدیر ان کے بڑے صاحبزادے منظر صدیقی مرحوم تھے۔ سرورق پر ایک جانب غالب کی تصویر تھی اور دوسری جانب 'جمعیت الشعرائے ہند کا واحد اخبار' تحریر تھا اور ساتھ ہی حضرت سیماب کی نظم کا یہ شعر تھا۔

پیدا ہوا ہے فکر کی مشکل کشائی کے لیے
شاعر ہے آوازِ خدا ساری خدائی کے لیے

(حامد اقبال صدیقی، سیماب اکبر آبادی، ساہتیہ اکادمی، دہلی 2009، ص 41-42)

سیماب اکبر آبادی اجمیر شریف سے رسالہ 'فانوس خیال' جاری کیا۔ بعد ازاں ادارہ 'قصر الادب' سے ماہنامہ ''پیمانہ'' جاری کیا اور پھر 1929 میں اسی ادارے سے اخبار 'تاج' جاری کیا، جس میں ماہنامہ شاعر کے اغراض و مقاصد کو پیش کیا گیا تھا۔ عرصہ دراز سے ان کا یہ خواب تھا کہ ایک ایسے ادبی رسالے کا اجرا کیا جائے جو صرف جماعت شعرا کا متفقہ آرگن ہو جس کے ذریعے مشرقی فن شاعری کو انحطاط کی پستیوں سے نکال کر معراج ترقی پر پہنچایا جا سکے۔ چنانچہ 'شاعر' کے اجرا سے انھوں نے اپنے اس خواب کو شرمندہ تعبیر کیا۔ 'شاعر' کے تعلق سے جو اہم نکات اخبار 'تاج' میں شائع کیے گئے تھے وہ حسب ذیل ہیں:

1. ایک آل انڈیا لٹریری کانفرنس کا قیام اور اس کے متعلق انتظامی کوششیں۔
2. ہندوستان کے تمام شعرا کو ایک رشتۂ تنظیم و اخوت میں منسلک کرنا۔
3. شاعری کو موجودہ مبتذل انحطاط پذیر حالت سے ابھارنا۔
4. موجودہ شاعری کو اس قابل بنانا کہ وہ ترقی قوم و ملک کا باعث ہو۔
5. شعرا کے حالات و واقعات ہفتہ وار شائع کرنا۔
6. ایک ایسا ادارۂ اشاعت قائم کرنا جو شعرا کے دیوان اور مجموعہ کلام کی طباعت اور اشاعت کر سکے۔
7 شعرا کو گمنامی اور بے قدری کی پستی سے معراج شہرت پر لانا اور ہفتہ وار ان کی غزلیں، نظمیں اور کلام شائع کرنا۔
8. قدیم اور جدید شاعری کی حمایت کرنا اور فن شریف کو مٹنے سے بچانا۔

مذکورہ نکات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ماہنامہ 'شاعر' کی اشاعت کا مقصد اردو شاعری کا فروغ اور بالخصوص ہندوستان کے شعرا کے کلام کی ترویج و اشاعت تھا۔ 'شاعر' نے اپنے ابتدائی دور سے ہی بہت سے شعرا کو گمنامی اور بے قدری کی پستی سے نکال کر معراج شہرت عطا کی۔ ابتدا معاصر اخبارات و جرائد کی نظر میں 'شاعر' محض شاعری کا گلدستہ تھا اور ان کا مجموعی ردعمل یہ تھا کہ اس میں نومشق شعرا اور ادبا کی غیر معیاری تخلیقات جمع کر دی جاتی ہیں۔ 'شاعر' میں نہ صرف ان اعتراضات کا جواب دیا جاتا تھا بلکہ بعض معیاری رسائل و اخبارات میں شائع شدہ تخلیقات کے فنی سقم کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ نئے شعرا کے کلام کی اصلاح بھی کی جاتی تھی۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اکثر بڑے عروضی شعرا کو دعوت دی جاتی تھی، جن میں جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، جگر مرادآبادی، ریاض خیر آبادی، عزیز لکھنوی، ساغر نظامی اور سیماب اکبر آبادی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان شعرا کے افکار عالیہ شروع سے ہی 'شاعر' کی زینت بنتے رہے۔ 'شاعر' میں آئینے کے سامنے، شاعرانہ معلومات، اصلاح سخن، استفسار اور مشورے، محاکات، معیار اور عام فہم عروض کے مستقل عنوانات کے تحت ان ماہرین اور اساتذۂ فن کے مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ ماہنامہ 'شاعر' کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس نے 'مناظمہ' اور 'مناثرہ' کو رواج دے کر ان شعرا میں بھی نثر و نظم لکھنے کا شوق پیدا کر دیا جو صرف غزل کہتے تھے۔ اس تعلق سے 'شاعر' کے ایک شمارے میں 'مناظمہ سے استغفار' کے عنوان سے مدیر نے لکھا ہے کہ:

''ابھی ہمارے شعرا نظم کہنے کے عادی نہیں ہیں، بعض لوگ نظموں کے اسالیب دیکھنے کے منتظر ہوں گے۔ بعض پہلی مرتبہ نظم اچھی نہ کہہ سکے ہوں گے، اس لیے ہم اس شعبہ کو بدستور جاری رکھتے ہوئے ان تمام شعرا سے جو شاعر کے خریدار ہیں یا شاعر کو کسی نہ کسی طرح دیکھتے ہیں۔ التماس گزار ہیں کہ وہ آئندہ اس

خصوص میں پوری توجہ فرمائیں اور جس طرح غزلیں کہنے میں التزام سے کام لیا جاتا ہے اسی طرح نظمیں کہنے میں بھی کشادہ دلی سے کام لیں۔ ان شاء اللہ مناظمہ کی ترویج طبقہ شعرا کے لیے بہت زیادہ مفید اور دلچسپ ثابت ہوگی۔''

(ماہنامہ شاعر ممبئی، ہم عصر اردو ادب نمبر 1997، ص105)

ماہنامہ 'شاعر' اپنے ابتدائی تقریباً بیس سالوں تک اردو شاعری کی ترویج و ترقی پر زور دیتا رہا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ رسالہ اپنے بانی علامہ سیماب اکبر آبادی کی سوچ کا مظہر تھا۔ یہاں یہ بات بھی واضح کرتا چلوں کہ اگرچہ 'شاعر' کے بانی سیماب اکبر آبادی تھے لیکن انھوں نے رسالے کی شروعات کے وقت ادارت کے فرائض کی ذمے داری اپنے بڑے بیٹے اور شاعر منظر صدیقی کو دی تھی۔ منظر صدیقی نے فروری 1932 تک ادارت کے فرائض بخوبی انجام دیے، اس کے بعد علالت کے سبب وہ دہلی چلے گئے اور ادارت خود حضرت سیماب کے ذمے آگئی اور شریک کار کی حیثیت سے ان کے دوسرے فرزند اعجاز صدیقی رسالے سے وابستہ ہوگئے بلکہ ستمبر 1935 سے وہ باقاعدہ مدیر شاعر بنا دیے گئے۔ سیماب اکبر آبادی تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہیں کراچی میں 1951 کو وفات پا گئے۔ سیماب کی وفات کے وقت ان کے چاروں بیٹے منظر صدیقی، اعجاز صدیقی، سجاد صدیقی اور مظہر صدیقی ان کے ساتھ تھے۔ اعجاز صدیقی والد کی رحلت کے بعد ماہنامہ 'شاعر' کے دفتر کو آگرہ سے کراچی منتقل کرنے کے لیے ہندوستان آگئے، لیکن وہ واپس پاکستان نہیں جاسکے۔ آگرہ میں ان کی طبیعت نہیں لگ رہی تھی اس لیے دوستوں کے مشورے سے 1951 کے آخری مہینوں میں ماہنامہ 'شاعر' کے دفتر کو لے کر مع اہل و عیال ممبئی منتقل ہوگئے۔ یہاں سے ماہنامہ 'شاعر' کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ممبئی میں یہ شجر سایہ دار پھلتا پھولتا رہا اور اعجاز صدیقی اسے اپنے خون جگر سے سینچتے رہے۔ اعجاز صدیقی نے 'شاعر' کو کامیاب بنانے کے لیے ایک طویل جدوجہد کی اور ہندوستان کی ادبی صحافت میں اسے ایک الگ اور بلند مقام عطا کیا۔ 1935 سے 1978 تک، وہ تقریباً بیالیس سال ماہنامہ 'شاعر' کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اعجاز صدیقی کی وفات (9 فروری 1978) کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے تاجدار احتشام صدیقی کو رسالے کا مدیر اعلیٰ مقرر کیا گیا اور چھوٹے بیٹے افتخار امام صدیقی معاون مدیر ہوئے۔ تاجدار احتشام صدیقی ماہنامہ 'شاعر' کے بہتر مستقبل کے لیے سعودی عرب چلے گئے اور وہیں 4 فروری 1981 کو انتقال کر گئے۔ ان کی وفات کے بعد 'شاعر' کی وراثت افتخار امام صدیقی کے حصے میں آئی، جسے انھوں نے آخری دم تک اپنے بھائی نعمان صدیقی اور حامد اقبال صدیقی کے تعاون سے جاری رکھا۔

افتخار امام صدیقی (1947-2021) علامہ سیماب اکبر آبادی کے پوتے اور اعجاز صدیقی کے فرزند تھے۔ جنھوں نے اپنی پوری زندگی ماہنامہ 'شاعر' کے لیے وقف کر دی۔ ان کی ذات بہت سارے اوصاف کی جامع خوبیوں کی حامل تھی۔ وہ صحافتی، علمی، ادبی، غرض ہر میدان میں ایک انفرادی مقام رکھتے تھے۔ باکمال صحافی و شاعر ہی نہیں باوصف انسان بھی تھے۔ 1981 سے 4 اپریل 2021 تک یعنی ان کی وفات تک ماہنامہ 'شاعر' ان کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ اردو کی ادبی صحافت میں بہت کم ایسے مدیران ہیں جنھوں نے چار دہائیوں تک کسی رسالے کی ادارت کے فرائض انجام دیے ہوں۔ ان کی وفات کے بعد ماہنامہ 'شاعر' کا مستقبل متاثر ہونے کا اندیشہ کیا جا رہا تھا اور جس کا ڈر تھا وہی ہوا، مالی دشواری اور وسائل کی کمی کی وجہ سے جنوری 2022 میں رسالے کو بند کر دیا گیا۔ ایک عہد ساز رسالے کا نو دہائیوں کے بعد مالی وسائل کے سبب بند ہونا اردو داں طبقے کی بے حسی قرار دیا جاسکتا ہے۔

افتخار امام صدیقی نے جب ماہنامہ 'شاعر' کی ادارت سنبھالی تب ان کے سامنے بھی بہت سے چیلینجز درپیش تھے لیکن انھوں نے 'شاعر' کو بلاناغہ اسی آن بان اور شان سے جاری رکھا جس طرح ان کے والد اور دادا مرحوم نے رکھا تھا۔ انھوں نے چالیس سال تک بڑی جانکاہی سے اس پودے کی پرورش کی جس کو ان کے دادا مرحوم نے لگایا تھا۔ اردو صحافت میں نہ معلوم کتنے اقتصادی بحران آئے مگر اس کی جڑوں کو جنبش نہیں ہوئی۔ اس دوران بہت سے ادبی اور علمی رسالے افق ادب پر طلوع ہوئے اور قلیل عرصے کی زندگی کے بعد چراغ سحری کی طرح جھلملا کر خاموش ہوگئے۔ یہ صرف افتخار امام صدیقی کی پر خلوص کوششوں اور ان کی بے نظیر صحافتی قابلیت اور صلاحیت کا نتیجہ تھا کہ ماہنامہ 'شاعر' کو ایک طویل عمر نصیب ہوئی جو اس کے کسی ہم عصر رسالے کو میسر نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ 2002 میں افتخار امام صدیقی ایک ٹرین حادثے میں بری طرح زخمی ہوکر اپنی دونوں ٹانگوں سے معذور ہوگئے تھے۔ اس حادثے کے بعد سے مشاعروں میں ان کے لامتناہی اسفار کا سلسلہ ضرور منقطع ہوگیا تھا مگر ماہنامہ 'شاعر' کی عظمت اور اس کو ترقی دینے کی رفتار میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ علامہ اقبال نے رسالۂ 'شاعر' کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا تھا:

''رسالۂ 'شاعر' اب مبتدیوں کے مذاق سے گزر کر منتہیوں کے مفاد کا باعث ہوتا جاتا ہے۔ خدا اس کی عمر دراز کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر صوبہ کے سررشتۂ تعلیم میں 'شاعر' منظور کرلیا جائے۔ خود بھی کوشش کر رہا ہوں، آپ بھی توجہ فرمائیں۔''

(شاعر۔ شمارہ جون 1932، ص5)

شاید علامہ اقبال کی دعا 'خدا اس کی عمر دراز کرے' قبول ہوئی کہ آج 'شاعر' کا شمار اردو کے سب سے قدیم ادبی رسائل میں ہوتا ہے جو تقریباً بیانوے سال تک اردو زبان و ادب کی خدمات انجام دیتا رہا۔ اس طویل مدت میں ماہنامہ 'شاعر' کے مزاج میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس نے ترقی پسند تحریک کے عروج و زوال کو بھی بہت قریب سے دیکھا تھا اور اس کے بعد جدیدیت کے کمالات کا مشاہدہ بھی کیا تھا۔ لیکن 'شاعر' کی یہ خوبی رہی کہ کسی مخصوص تحریک کا علمبردار نہیں رہا لیکن ہر دور کے بدلتے ہوئے رجحانات کا ساتھ ضرور دیتا رہا۔ اعتدال پسندی کو اس نے اپنا شعار بنایا کیوں کہ 'شاعر' کا مقصد اعلیٰ ادب کی ترویج تھا اس لیے ہمیشہ ادبی معیارات کو اولیت دی۔

ماہنامہ 'شاعر' نے سیاسی اور مذہبی موضوعات سے ہمیشہ گریز کیا۔ خالص ادبی و لسانی مواد کو زیر بحث لایا گیا۔ 'شاعر' کی کامیابی کا راز شاید اسی میں مضمر ہے کہ اس نے اپنے دامن کو ہمیشہ وسیع رکھا۔ جہاں اس نے نامور قلمکاروں کو اپنے صفحات پر جگہ دی وہیں اردو کی نئی نئی آوازوں اور نئے نئے چہروں کو ادبی دنیا سے روشناس کرایا۔ غالباً اردو کا یہ واحد رسالہ ہے جس میں غیر ملکی ادبا اور شعرا کی نگارشات دلکش اور منفرد انداز میں شائع ہوتی رہیں۔ ان نگارشات سے بین الاقوامی سطح پر اردو کی صورت حال کا پتا چلتا ہے۔

ماہنامہ 'شاعر' کی نمایاں ترین خصوصیت اس کے موضوعاتی خاص نمبر ہیں جو اپنے آپ میں بے مثال اور دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ابتدا میں اعجاز صدیقی کی ادارت میں نکلنے والے خصوصی نمبرات میں کار امروز نمبر 1935، آگرہ نمبر 1936، سالنامہ نمبر مئی 1937، افسانہ نمبر 1954، سعادت حسن منٹو نمبر 1955، خاص نمبر اپریل 1959، غالب نمبر 1969، گاندھی نمبر 1969، ناولٹ نمبر 1971، قومی یکجہتی نمبر 1974، کرشن چندر نمبر 1967 اور ہم عصر اردو نمبر 1977 خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اعجاز صدیقی کے بعد افتخار امام صدیقی نے بہت کم وقت میں اپنی بے حد تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ 'شاعر' کے متعدد متنوع رنگ کے شمارے شائع کر کے ادبی حلقوں میں اعتبار قائم کر لیا۔ ان کے یادگار اور تجرباتی خصوصی شماروں میں ایک شمارہ 1980 کے نام خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر 1980، نثری نظم اور آزاد غزل نمبر 1983، یگانہ نمبر 1985، اقبال نمبر 1988، افسانہ نمبر 1992 اور ہم عصر اردو ادب نمبر 1997 وغیرہ شامل ہیں۔

'شاعر' کے ابتدائی خصوصی شماروں میں 'سالنامہ نمبر' کافی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ شمارہ مئی 1937 میں شائع ہوا جو 525 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا نصف حصہ 'آگرہ سکول نمبر' کے لیے وقف کیا گیا۔ اس حصے میں 200 کے لگ بھگ شاعروں کے کلام کا انتخاب شائع کیا گیا ہے اور کئی شعرا کے حالات زندگی نہایت سلیقے کے ساتھ مرتب کیے گئے ہیں۔ اس شمارے میں خواجہ میر علی تبریزی موجد خط نستعلیق کی خوش نویسی کے عکس بھی شائع کیے گئے ہیں۔ شمارے میں جدت یہ جلوہ گر ہوئی کہ آگرہ اسکول کے موسس اعلیٰ سیماب اکبرآبادی اپنے تلامذہ کے کلام کی اصلاح جس مہارت اور چابک دستی سے کرتے تھے، اس کے کئی نمونوں کے عکس اس اشاعت میں شامل کیے گئے ہیں۔ آخر میں 112 شاعروں کے تذکرے درج ہیں اور ساتھ ہی 105 شاعر تصویر کی صورت میں رونق افروز ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں شعرا کی تصویر شاید ہی اب تک کسی شمارے کی زینت بنی ہوں۔

'ہم عصر اردو ادب نمبر' ماہنامہ 'شاعر' کا سب سے مقبول ترین خصوصی نمبر ہے، جس کی پہلی جلد مئی تا دسمبر 1997 میں منظر عام پر آئی۔ یہ جلد 1240 صفحات پر مشتمل ہے۔ اردو رسائل کی تاریخ میں شاید یہ سب سے زیادہ ضخیم نمبر ہے، جسے اردو شعر و ادب کا عالمی گاؤں بھی کہا گیا ہے۔ اس خصوصی نمبر میں آگرہ اسکول، علامہ سیماب اکبرآبادی، معاصر تنقید، مکاتیب، مشاہیر، ہم عصر افسانہ، معاصر اردو شاعری پر پرمغز مقالات اور بہترین شعرا اور نثر نگاروں کی اعلیٰ تخلیقات و نگارشات شائع کی گئی ہیں۔ مزید برآں مختار صدیقی، اوپندر ناتھ اشک، رام لعل اور مالک رام کے خصوصی گوشے بھی شائع کیے گئے ہیں۔ شمارے کے اختتام پر اردو شاعروں اور ادیبوں کی ایک ڈائرکٹری بھی دی گئی ہے۔ جس میں غیر ممالک کے ادیبوں اور شاعروں کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ مدیر 'شاعر' افتخار امام صدیقی اس شمارے کے اداریے میں یوں رقمطراز ہیں:

''اردو شعر و ادب کا یہ کوئی انتخاب نہیں ہے۔ کسی طرح کی کوئی انتھولوجی بھی نہیں ہے۔ یہ کوئی سالانہ جائزہ یا کوئی دس سالہ جائزہ یا پھر پچاس سالہ ادب کا محاکمہ بھی نہیں ہے۔ بظاہر اس کا عنوان 'ہم عصر اردو ادب نمبر' (اردو شعر و ادب کا عالمی گاؤں) ہے اور 1990 کے بعد شعر و ادب کو عمل میں رکھا گیا ہے لیکن ترقی پسندوں اور جدیدیوں کے ادبی کارناموں کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس حوالے سے آزادی ہند اور ہندوستان کی تقسیم کے آس پاس کے شعر و ادب کی بات بھی ہوئی ہے لیکن طے شدہ موضوع کو اس کے میکانکی مضمرات کے ساتھ یا خاص نمبر کے کسی بھی تصور سے الگ ہو کر 'ہم عصر اردو ادب نمبر' کی تینوں جلدوں کو دیکھنا اور سمجھنا ہوگا۔''

(ماہنامہ شاعر، اداریہ، ہم عصر اردو ادب نمبر 1997 ص 25)

مذکورہ شمارے کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے 1999 میں لندن میں اسے ایک ادبی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔ یہ خصوصی نمبر افتخار امام صدیقی کی سات سالہ کاوشوں کا ثمرہ تھا جسے اردو زبان و ادب کا کوئی بھی سنجیدہ قاری کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ 'شاعر' کے دیگر خصوصی شماروں میں غالب نمبر، افسانہ نمبر، کرشن چندر نمبر، گاندھی نمبر، ناولٹ نمبر اور خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر وغیرہ بھی دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں اور اردو دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ خصوصی نمبرات کے علاوہ 'شاعر' نے 1970 میں پہلی بار گوشوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ اولین کاوش 'گوشہ راجندر سنگھ بیدی' کی تشکیل سے ہوا۔ اس کے بعد مختلف قلمکاروں کے تقریباً سو سے زائد خصوصی گوشے شائع ہو چکے ہیں، جن میں انور خان، نثار احمد فاروقی، مشفق خواجہ، احمد ندیم قاسمی، دیپتی مشرا، قمر جمالی، جوگندر پال اور پروفیسر مسعود حسین خان کے گوشے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان خصوصی گوشوں کی ایک اہم خوبی افتخار امام صدیقی کے ادبا و شعرا سے لیے گئے انٹرویوز ہیں جو 'فنکار اب بھی مستور ہے' کے عنوان سے شائع ہوتے تھے۔ افتخار امام صدیقی نے ہی ہندوستان کے اردو قارئین کو 'اردو کی نئی بستیوں' سے متعارف کروایا۔

ادبی صحافت کی ترقی کا دارومدار اداریوں پر بھی ہوتا ہے۔ اور ماہنامہ 'شاعر' اپنے بے باکانہ اداریوں کے لیے کافی مشہور ہے۔ اس میں لکھے گئے اداریے حالات حاضرہ پر ہوتے ہیں۔ خواہ وہ ادبی حالات حاضرہ ہوں یا سیاسی، عام طور پر ادبی رسائل میں ادبی مباحث کو ہی جگہ دی جاتی ہے۔ بقول فرانسیسی فلسفی ژاں پال سارتر، جو ادیب سیاسی شعور نہیں رکھتا اور سیاسی حالات حاضرہ سے بے خبر ہو وہ ادیب ہی نہیں ہے۔ 'شاعر' کے مدیر اعجاز صدیقی ہوں یا ان کے بیٹے افتخار امام صدیقی، دونوں ہی بیدار ذہن کے مالک اور مستقل حالات کی نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ افتخار امام صدیقی تو ایک نڈر اور بے باک صحافی تھے۔ 'شاعر' میں لکھے گئے اداریے ان کی شخصیت کے عکاس ہیں۔ انھوں نے بغیر کسی نتائج کی پرواہ کیے ہوئے اداریے تحریر کیے ہیں۔ جن موضوعات پر بھی انھوں نے اداریے لکھے، وہ فنی معیارات پر پورے اترتے ہیں۔ ان کے اداریوں سے اردو زبان و ادب کی صورت حال اور فروغ و اشاعت کے علاوہ ادبی منظرنامے کا بھی پتا چلتا ہے۔

مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ ماہنامہ 'شاعر' اپنی گونا گوں صفات اور خصوصیات کے باعث ہندوستان کے ان چند مایہ ناز اور اہم ادبی رسائل میں شامل ہے، جن کی خدمات کو اردو زبان و ادب اور صاف ستھری و بے داغ صحافت کے لیے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ رسالے کو یہ بلندی اور سرفرازی عطا کرنے میں افتخار امام صدیقی کی علمی بصیرت اور ادب شناسی کا بڑا ہاتھ ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ماہنامہ 'شاعر' ایک رسالہ ہی نہیں بلکہ ایک صدی پر محیط داستان ہے جو افتخار امام صدیقی کی وفات کے بعد اپنے اختتام کو پہنچی تو بے جا نہ ہوگا۔

■

Dr. Qammer Ahmed
Lecturer, Vishwa Bharti Womens College,
Rainawari, Srinagar, 190003 (J&K)
Mob: 7006014038
Email: qammerahmed3@gmail.com

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورت حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وما علیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کر کے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

انٹرویوز

روبرو: ادب اور فلمی ہستیوں کے انٹرویوز

مصنف: صدر عالم گوہر

صفحات: 192، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: صدر عالم گوہر، موضع و پوسٹ، پرسولیا، ضلع، مدھوبنی (بہار)

مبصر: ایم۔ اشفاق، 604، چھٹی منزل، اربنا اپارٹمنٹ ملت نگر 2، بھیونڈی۔1، تھانے 421302 (مہاراشٹر)

صدر عالم گوہر ایک ہمہ جہت فعال قلم کار ہیں۔ شعر و ادب کی مختلف صنفوں پر ان کی کتابیں ہیں۔ کئی زبانیں جاننے کی وجہ سے انھوں نے مختلف زبانوں سے فیض حاصل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابیں نہ صرف اردو میں ہیں بلکہ مختلف زبانوں میں ہیں۔ ان کے مضامین اردو زبان کے معتبر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

صدر عالم گوہر نے شاعری، افسانے، بچوں کا ادب، صحافت، تراجم اور تحقیق پر کتابیں تصنیف کی ہیں۔ زیر نظر کتاب میں انھوں نے فلم و ادب کی معروف شخصیتوں سے گفتگو کی ہے۔ اس گفتگو کے ذریعے ان کی زندگی اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان گوشوں کو وا کیا ہے جو اب تک قارئین کے سامنے نہیں آئے تھے۔

انٹرویوز کا مجموعہ 'روبرو' میں انھوں نے ادب اور فلموں سے متعلق سرکردہ شخصیات کا انٹرویو لیا ہے۔ اس انٹرویو کا خاصہ یہ ہے کہ یہ انٹرویوز ٹیلیفونک نہیں ہیں اور نہ ہی خط و کتابت پر مبنی ہیں بلکہ صدر عالم گوہر نے بذات خود جا کر ان سرکردہ شخصیات سے ملاقات کی ہے، گفتگو کی ہے اور گفتگو کا جو ماحصل ہے اس کو اس انٹرویوز کی کتاب 'روبرو' میں شامل کیا ہے۔ یہ انٹرویوز مخصوص اس لیے ہیں کہ اس میں ایسی ایسی مشہور ہستیاں ہیں جن کو عام لوگ جانتے تو ہیں، ان کے بارے میں پڑھا ہے۔ ان کی کتابوں کو پڑھا بھی ہے۔ ان پر بہت زیادہ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن ان کی زندگی کے چند گوشے ابھی بھی منظر عام پر نہیں آئے ہیں۔

زیر نظر کتاب 'روبرو' میں ادب اور فلم سے وابستہ تیرہ شخصیات کے انٹرویوز شامل ہیں۔ جن نامور ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں سے بات کی گئی ہے ان کے نام ہیں ادیب شموئل احمد، موسیقار خیام، شاعر و نغمہ نگار ندا فاضلی، موسیقار روی، شاعر و نغمہ نگار نقش لائل پوری، گلوکارہ مبارک بیگم، گلوکار محمد عزیز، گلوکار کمار سانو، ریڈیو براڈ کاسٹر امین سایانی، نغمہ نگار یوگیش، ہدایت کار لیکھ ٹنڈن، موسیقار پیارے لال اور افسانہ نگار ایم مبین۔

انٹرویوز کے مرکزی موضوعات ان معروف ہستیوں کی زندگی اور ان کے تخلیقی کارنامے ہیں۔ جن سے قارئین کو یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی بھی آدمی کو کسی بھی صنف میں شہرت و مقبولیت حاصل کرنے میں کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور یہ باتیں ہمیں بہت کچھ سکھاتی ہیں۔ جیسے مستقل مزاجی، عمل پیہم اور مسلسل جدوجہد کامیابی کی کلید ہے۔

کتاب میں جن مشہور شخصیات کے انٹرویوز شامل ہیں ان سے مصنف نے ان کے کیریئر، کامیابیوں، ناکامیوں اور ذاتی زندگی کے پہلوؤں پر سوالات کیے ہیں۔ جو کافی دلچسپ ہیں۔ اور معلومات میں اضافہ کرتے ہیں، خاص طور سے شموئل احمد سے فکشن سے متعلق سوالات بڑے اہم ہیں جن میں اردو فکشن میں کیا کیا خوبیاں اور خامیاں ہیں۔ شموئل احمد کے ہم عصروں کا کیا حال ہے، کیا لکھ رہے ہیں، کیسا لکھ رہے ہیں اس پر دوران گفتگو شموئل احمد نے روشنی ڈالی ہے۔ جس سے فکشن کی سمت و رفتار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

موسیقار خیام کو ہندوستانی فلم انڈسٹری میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انھوں نے دوران گفتگو اردو، ساحر لدھیانوی اور اپنی مقبول فلموں جیسے شگون، بازار، امراؤ جان، کبھی کبھی، ترشول وغیرہ فلموں اور ان کے نغموں سے متعلق اہم باتیں کی ہیں۔

ندا فاضلی شعر و ادب کی قد آور شخصیت تو تھے ہی علاوہ ازیں فلم سے بھی منسلک رہے۔ ان کے ادبی اور شعری انٹرویو تو بہت ہوئے۔ لیکن فلم پر بات نہیں کے برابر ہے۔ یہ انٹرویو ندا فاضلی کے فلمی کارناموں پر مرکوز ہے، جس سے ان کی فلمی فتوحات کا علم ہوتا ہے۔

معروف موسیقار روی کے انٹرویو میں روی نے شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی کے ساتھ ساتھ محمد رفیع اور اپنی فلمیں نکاح تک کے فلمی سفر پر روشنی ڈالی ہے۔ کس طرح فلم نکاح کے نغمے 'دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے' کے لیے سترہ دھنیں انھوں نے بنائیں تب جا کر اس فلم کی ہیروئن اور گلوکارہ سلمیٰ آغا اس نغمے کو گا سکیں۔ اس کے علاوہ بھی فلم میں اپنا مقام بنانے کے لیے کتنی جدوجہد کرنی پڑی اس کا بھی ذکر انھوں نے کیا ہے۔

نقش لائل پوری جن کا اصلی نام جسونت رائے ہے۔ انھوں نے بھی ادب اور اردو کا دامن فلمی نغمہ نگاری کے دوران نہیں چھوڑا۔ وجہ یہ تھی کہ ان کی تعلیم اردو میڈیم سے ہوئی تھی۔ انھوں نے ہندوستان اور پاکستان کا بٹوارہ دیکھا تھا اور بٹوارے کا دکھ جھیلا تھا۔ کئی بار وہ موت کے منھ میں جاتے جاتے بچے تھے۔ جس کا ذکر انھوں نے انٹرویو میں کیا ہے۔ معروف گلوکارہ مبارک بیگم کا انٹرویو اہم اس وجہ سے ہوجاتا ہے کہ اس میں بتایا گیا ہے کہ اتنی ماہر فن گلوکارہ کس طرح فلمی دنیا کی سیاست کا شکار ہوگئیں۔

معروف گلوکار محمد عزیز کی گفتگو ان معنوں میں اہم ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مدو جزر کو بیان کرتے ہوئے معروف کامیڈین جانی واکر کی کہی ہوئی بات کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ کوئی آدمی ہمالیہ پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی ماؤنٹ ایوریسٹ پر چڑھ کر پرچم لہرا کر وہیں قیام نہیں کرتا ہے بلکہ اسے نیچے آنا ہی پڑتا ہے۔ ہر عروج کے بعد زوال ہے۔ اور یہی حقیقت ہے۔ انھوں نے وہ زمانہ بھی دیکھا جب ان کے نغموں کے بغیر کوئی فلم نہیں بنتی تھی۔ اپنے وقت کے سب سے مقبول اور درجہ اول کے گلوکار تھے۔ پھر ان پر وہ زمانہ بھی آیا جب ان کے پاس کام نہیں تھا۔ وہ پرائیوٹ شوز اور علاقائی زبان کے نغمے گا رہے تھے، پھر بھی خوش تھے اور اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے۔

ہر کمال کو زوال ہے۔ اس کی مثال ہم کو کمار سانو کے انٹرویو سے ملتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ محمد عزیز کو بہت پیچھے چھوڑتے ہوئے کمار سانو صف اول کے گلوکار بن گئے۔ کمار سانو کے پاس وقت نہیں تھا۔ کئی سالوں تک فلم فیئر ایوارڈ ملتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ بات پھیلی کہ کمار سانو نے فلم فیئر ایوارڈ آئندہ نہ لینے کی بات کہی ہے۔ پھر انھوں نے وہ زمانہ بھی دیکھا کہ ان کے پاس بھی کام نہیں تھا۔ صدر عالم گوہر کے سوال پر کہ آج کل آپ فلموں میں نظر نہیں آتے کا جواب وہ یوں دیتے ہیں کہ آج کل کے گانے ہمارے معیار کے نہیں ہیں۔

معروف ریڈیو براڈ کاسٹر امین سایانی سے کی گئی گفتگو بھی کم دلچسپ نہیں ہے۔ اس میں وہ بتاتے ہیں کہ ریڈیو پر فلمی نغموں کو کیسے بند کردیا گیا۔ نیز یہ بھی بتاتے ہیں کہ اگر کسی محکمے میں کوئی غلط آدمی آجائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ وہ محکمہ کیسے برباد ہوجاتا ہے۔ ریڈیو سیلون کی مقبولیت کی کیا وجہ تھی۔ وہ پطرس بخاری، ذوالفقار بخاری جیسے معروف براڈ کاسٹر کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

معروف نغمہ نگار یوگیش کی گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی زندگی کسی دلچسپ افسانے سے کم نہیں ہے۔ احساس کمتری ان کی زندگی کا سب سے کمزور پہلو تھا، جس کا خمیازہ انھوں نے ساری زندگی اٹھایا۔ ایک باصلاحیت نغمہ نگار ہوتے ہوئے بھی انھیں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ حقدار تھے۔

معروف ہدایت کار لیکھ ٹنڈن نے اپنی گفتگو میں اردو سے اپنی محبت کا ذکر کیا اور رسالہ آج کل اور ان کے سابق مدیر جوش ملیح آبادی کو یاد کرتے ہوئے ہندو پاک بٹوارے میں جوان پر گذری اس کا بیان کیا ساتھ ہی اپنے فلمی کیریئر کا ذکر کیا ہے۔

معروف موسیقار لکشمی کانت پیارے لال اپنے زمانے کے سب سے مہنگے اور کامیاب موسیقار تھے۔ اس انٹرویو میں موسیقار لکشمی کانت پیارے لال کی جوڑی کے پیارے لال نے مجروح سلطانپوری، راجہ مہدی علی خان، ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی اور محمد رفیع کو اپنے انٹرویو میں یاد کیا اور ان سے جڑے واقعات بتائے ہیں۔

معروف افسانہ نگار ایم مبین نے اردو زبان کے قارئین سے شکایت کی ہے کہ وہ کتابیں خرید کر نہیں پڑھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اردو ادبا و شعرا کو کتابوں کی فروخت سے وہ منافع اردو ادیب کو نہیں مل پاتا جو دنیا کی دیگر زبانوں کے ادیبوں کو ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں اردو کے ذریعے ایک لاکھ روپے ماہانہ کمانے والا فرد بھی اردو کے پانچ روپے کا اخبار نہیں خریدتا ہے۔ جب کہ وہی شخص سگریٹ، پان اور چائے پر روزانہ تین سو روپے خرچ کر دیتا ہے۔

زیر نظر انٹرویو کی کتاب 'روبرو' کا سرورق بہت جاذب نظر اور خوبصورت ہے۔ مصنف نے ہر انٹرویو کو بہت عمدگی سے پیش کیا ہے۔ کچھ تیکھے سوالات پوچھے ہیں۔ انٹرویو کے وہ حصے بہت متاثر کرتے ہیں جن میں خاص طور پر جب شخصیات اپنی جدوجہد اور کامیابیوں کی کہانیاں بیان کرتی ہیں۔

'روبرو' ان قارئین کے لیے ایک بہترین کتاب ہے جو ادب، فلم اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مشہور شخصیات کے خیالات جاننا چاہتے ہیں۔

ترتیب

سہیل انجم کی صحافتی خدمات

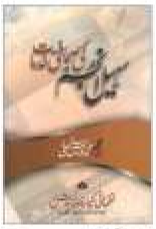

مرتب: محمد اویس سنبھلی

صفحات: 352، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: نعمانی کیئر فاؤنڈیشن، بارود خانہ گولہ گنج لکھنؤ

مبصر: مشیر احمد، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

'سہیل انجم کی صحافتی خدمات' محمد اویس سنبھلی کی مرتبہ تازہ ترین کتاب ہے، جو 2024 میں شائع ہوئی ہے۔ سہیل انجم کا اصل میدان تو صحافت ہے، لیکن انھوں نے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی موضوعات پر بھی مضامین رکالم لکھے ہیں۔ ان کے مضامین ملک کے موقر ادبی رسائل و جرائد کے علاوہ نامور اور معروف روزناموں میں بھی پابندی سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ سہیل انجم خاکہ نگار، سفرنامہ نگار کی حیثیت سے بھی اہل علم کی توجہ کا مرکز ہیں۔ خاکہ نگاری کی اگر بات کی جائے تو ان کی دو کتابیں نہایت مقبول ہوئیں۔ اولاً 'نقش برآب' جس کا پہلا اڈیشن 2016 میں اور دوسرا ایڈیشن 2023 میں شائع ہوا۔ خاکوں کا دوسرا مجموعہ 'نقش برسنگ' ہے۔ اس کی اشاعت 2021 میں عمل میں آئی۔ جہاں تک سفرنامہ نگاری کی بات ہے تو سہیل انجم نے صرف مقدس اور روحانی اسفار یعنی حج اور عمرہ کے تعلق سے تین سفرنامے تصنیف رمرتب کیے ہیں، جن میں 'پھر سوئے حرم لے چل' (2007)، 'بازدید حرم' (2015) اور 'زیارت حرمین شریفین' (2023) عمدہ اور قابل ذکر سفرنامے ہیں۔

سہیل انجم کا اصل میدان صحافت ہے۔ اس میدان میں ان کی ایک درجن سے زیادہ کتابیں ہیں، جو اہل علم و ذوق سے داد و تحسین حاصل کرچکی ہیں۔ صحافت کے حوالے سے ان کی بعض کتابوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں: میڈیا روپ بہروپ (2006,2008 اور 2014)، باتیں اخبار نویسوں کی (2016)، دینی رسائل کی صحافتی خدمات (2017 اور 2022)، جدید اردو صحافت کا معمار: قومی آواز (2022)، اردو صحافت اور علما (2016 اور 2021)، مولانا محمد عثمان فارقلیط: حیات و خدمات (2016 اور 2021)، مولانا محمد عثمان فارقلیط کے منتخب اداریے (2014)، مولانا محمد عثمان فارقلیط: صحافی مناظر مفکر (2023) احوال صحافت (2012)، دہلی

کے ممتاز صحافی (2015)، موہن چراغی اور قومی آواز (2016)، محفوظ الرحمٰن: صحافت کا نشان امتیاز (2015) اور اردو صحافت کے فروغ میں غیر مسلم صحافیوں کی خدمات (2024) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

صحافت کے میدان میں اس وقیع اور اہم خدمات کے پیش نظر محمد اویس سنبھلی نے یہ ارادہ کیا کہ ان کے شایان شان ایک ایسی کتاب مرتب کی جائے جس میں سہیل انجم کی صحافت کے حوالے سے تمام پہلوؤں رگوشوں کا احاطہ ہو۔

'سہیل انجم کی صحافتی خدمات' کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اویس سنبھلی نے نہایت عرق ریزی اور جانفشانی سے اس کتاب کو تیار رمرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں سہیل انجم کی صحافتی خدمات کے تعلق سے اب تک جتنی بھی تحریریں رمضامین رتبصرے لکھے گئے ہیں، انھیں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس میں شامل بعض مضامین پہلے کے لکھے ہوئے ہیں اور کچھ مضامین کتاب میں شامل کرنے کی غرض سے از سر نو لکھوائے گئے ہیں۔ مضمون نگاروں کی فہرست پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بزرگ ادیب اور شاعر کے ساتھ نئی نسل کے لکھنے والے بھی شامل ہیں۔ مثلاً پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر خالد محمود، حکیم وسیم احمد اعظمی، انجم عثمانی، حفیظ نعمانی، معصوم مرادآبادی، ڈاکٹر تابش مہدی، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر شافع قدوائی، حقانی القاسمی، ڈاکٹر یامین انصاری، ڈاکٹر نوشاد منظر، ڈاکٹر شاہ نواز فیاض اور ڈاکٹر سلمان فیصل وغیرہ اہم ہیں۔

'سہیل انجم کی صحافتی خدمات' کو دو باب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول، شخصی وفنی گوشہ پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں سہیل انجم کی شخصیت اور خدمات کے حوالے سے لکھے گئے مضامین ہیں، جن میں ان کی بھرپور شخصیت اور جملہ صحافتی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں سہیل انجم کے دو اہم انٹرویوز بھی شامل ہیں۔ پہلا انٹرویو وائس آف امریکہ کے لیے براڈ کاسٹر شہناز عزیز نے کیا ہے اور دوسرا علیزے نجف نے کیا ہے۔ ان انٹرویوز سے جہاں ایک طرف سہیل انجم کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، وہیں دوسری جانب ان کی فکر اور ملک کے موجودہ حالات کو سمجھا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کا باب دوم، سہیل انجم کی منتخب تصنیفات: تبصرے وتاثرات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس حصے میں ان کی 16 کتابوں پر شائع ہونے والے تاثرات، تعارفی کلمات اور تبصراتی مضامین رتحریروں کو شامل کیا گیا ہے۔ آخری مضمون سہیل انجم کے سوانحی کوائف پر مشتمل ہے۔ جو اختصار اور جامعیت کا عمدہ نمونہ ہے۔

سہیل انجم کی مجموعی خدمات کے پیش نظر اس کتاب کا مطالعہ طلبا کے لیے خاص طور پر ناگزیر ہے۔ کیونکہ یہ کتاب نصابی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ اس میں سہیل انجم کی شخصیت کے علاوہ ان کی جملہ خدمات (بطور خاص صحافتی خدمات) کا مکمل اور بھرپور احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اردو ادب میں ایک اضافہ ہے اور اہل ذوق کے لیے عموماً اور سہیل انجم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے خصوصاً ایک گراں قدر اور قیمتی تحفہ ہے۔

قوی امید ہے کہ اردو دنیا میں اس کتاب کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور اہل علم وادب اسے داد وتحسین سے نوازیں گے۔ کتاب کا سرورق عمدہ اور جاذب نظر ہے۔

شاعری

شور سکوت شب: ایک جمالیاتی تعارف و تجزیہ

شاعر: احسان اعظمی

صفحات: 208، قیمت: 300، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: نایاب بکس نئی دہلی

مبصر: نازش احتشام اعظمی

ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

ادب کے افق پر وہ ستارے ہمیشہ چمکتے رہتے ہیں، جن کی تخلیقات وقت کے دھارے سے آگے نکل کر انسانی شعور کی گہرائیوں کو چھوتی ہیں۔ احسان اعظمی اردو ادب کے ایسے ہی درخشاں ستارے ہیں، جن کے کلام میں جذبے کی صداقت، فکر کی بلند پروازی، اور اظہار کی دلکشی نمایاں ہے۔ ان کا شعری مجموعہ 'شور سکوت شب' جدید اردو شاعری کا ایک ایسا آئینہ ہے، جو انسانی جذبات واحساسات کے پیچ وخم کو منفرد استعاراتی انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہ کتاب محض اشعار کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک فکری سفر ہے، جو قاری کو زندگی کی حقیقتوں، کائناتی فلسفے اور داخلی دنیا کے بے کراں سمندر میں لے جاتا ہے۔

'شور سکوت شب' اردو شاعری میں ایک نادر اضافہ ہے۔ 'شور' اور 'سکوت' دو متضاد عناصر ہیں، لیکن جب یہ رات کے حوالے سے جڑتے ہیں تو ایک نیا مفہوم تخلیق کرتے ہیں۔ یہ عنوان سکوت کے پردے میں چھپے شور کو بے نقاب کرتا ہے۔ احسان اعظمی نے اس عنوان میں ایک ایسی فلسفیانہ کیفیت سمو دی ہے، جو قاری کو نہ صرف متوجہ کرتی ہے بلکہ سوچنے پر مجبور بھی کر دیتی ہے۔

احسان اعظمی کی شاعری جذبات اور خیالات کے ایسے امتزاج کا نام ہے، جو دل و دماغ دونوں کو مسحور کر دیتا ہے۔ 'شور سکوت شب' میں شامل اشعار محبت، تنہائی، جدائی، خوشی، اور بے چینی جیسے جذبات کا مرقع ہیں۔ لیکن یہ جذبات محض سطحی نہیں بلکہ گہرے فکری پہلوؤں سے مزین ہیں، جو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔

احسان اعظمی کے اشعار میں جذبات کی ایسی شدت ہے جو قاری کے دل میں گونج پیدا کرتی ہے۔ وہ الفاظ کو اس مہارت سے برتتے ہیں کہ ہر لفظ ایک کہانی سناتا ہے۔ مثلاً:

کمال شدت احساس ہمدردی بھی کیا شے ہے   کسی کا درد ہو ہم کو ہمارا درد لگتا ہے

اس شعر میں وہ جذبۂ ہمدردی کو نہایت سادگی مگر بے حد مؤثر انداز میں بیان کرتے ہیں۔

احسان اعظمی نے اپنی شاعری میں کائنات، وقت، اور انسانی وجود کے فلسفے کو بڑی خوبصورتی سے سمویا ہے۔ ان کے اشعار میں کائناتی بے چینی کی جھلک بھی ملتی ہے اور وقت کی بے رحم رفتار کا ذکر بھی۔ ان کی شاعری میں جدیدیت کی تازگی اور روایت کی خوشبو ایک ساتھ ملتی ہے۔ انھوں نے کلاسیکی شاعری کے رموز کو جدید طرزِ فکر کے ساتھ یکجا کیا ہے، جس کی بدولت ان کا کلام منفرد اور پرکشش بن جاتا ہے۔

احسان اعظمی کے اشعار کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی زبان اور اسلوب کی سادگی ہے، جو قاری کے دل پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ ان کے کلام میں استعارات، تشبیہات، اور دیگر ادبی وسائل کا استعمال نہایت مہارت سے کیا گیا ہے۔

ان کے کلام میں علامتوں کا استعمال قاری کو مختلف جہانوں کی سیر کراتا ہے۔

احسان اعظمی کے اشعار میں موسیقیت کا عنصر قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ان کے کلام میں ایک روانی ہے جو دل کو بہالے جاتی ہے۔ ان کی تصنیف 'شور سکوت شب' ایک فکری سفر ہے، جو قاری کو نہ صرف اپنے اندر جھانکنے پر مجبور کرتی ہے بلکہ اسے زندگی کی حقیقتوں کو سمجھنے کا ایک نیا زاویہ فراہم کرتا ہے۔

اس کتاب میں محبت، فرقت، تنہائی، وقت، اور انسانی کشمکش جیسے موضوعات کو بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کے اشعار قاری کے دل میں جذبات کی گہرائی اور فکری وسعت کو بیک وقت بیدار کرتے ہیں۔

'شور سکوت شب' اردو ادب میں ایک نایاب تخلیق ہے، جو جذبات، فلسفے، اور فکری گہرائی کو ایک ساتھ پیش کرتی ہے۔ احسان اعظمی کی یہ تصنیف اردو شاعری کے خزانے میں ایک قیمتی اضافہ ہے، جو ادب کے ہر قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ادب کے طالب علموں بلکہ ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے، جو زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بہتر طور پر سمجھنا چاہتا ہے۔

یہ شعری مجموعہ احسان اعظمی کی تخلیقی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے اور اردو ادب کے آسمان پر ایک روشن ستارے کی مانند ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔

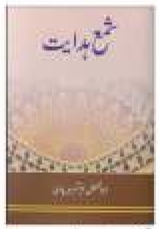

شمع ہدایت (حمد و نعت کا مجموعہ)

شاعر: ابوالفیض عزم سہریاوی
صفحات: 196، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت:
ملنے کا پتا: B-274، المرتضیٰ اپارٹمنٹ، III فلور، اوکھلا، نئی دہلی۔ 25
مبصر: ڈاکٹر منور حسن کمال، N-93، فورتھ فلور، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 25

سرور کائنات، رحمت عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدحت، تعریف وتوصیف اور شمائل وخصائص کے منظوم انداز بیان کو نعت یا نعت خوانی یا نعت گوئی کہا جاتا ہے۔ عربی زبان میں نعت کے لیے 'مدح رسول' استعمال ہوتا ہے۔ تاریخ اسلام میں بہت سے صحابۂ کرامؓ نے نعتیں لکھیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری وساری ہے۔ روایات سے پتا چلتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب اور اصحاب میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ پہلے نعت گو شاعر اور نعت خواں تھے۔ تاریخ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ حضرت کعب بن زبیرؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے ترنم سے نعت پڑھی ہیں۔

دور صحابہ سے لے کر آج تک جہاں صحابۂ کرامؓ اور علما وصلحا نے نعتیہ شاعری کو فروغ دیا اور اولیائے کرام اور صوفیائے عظام نے حضور اکرمؐ کے عشق کو ایمان کی تکمیل کے لیے ناگزیر قرار دیا اور عشق رسولؐ کے لیے نعت خوانی کو ایک بہترین ذریعہ قرار دیا ہے۔ حمد اور نعت میں ذرا سا فرق ہے اور شاعر کو یہاں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنے پڑتے ہیں۔ ابوالفیض عزم سہریاوی کا تعلق بھی شاعروں کے اسی قبیل سے ہے۔ وہ کم وبیش نصف صدی سے شاعری وسخن وری کی دنیا سے وابستہ رہے ہیں۔ اب تک ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اس سے قبل حمد ونعت اور منقبت ومناجات کے دو مجموعے منظر عام پر آکر عوام وخواص سے خاطر خواہ پزیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ معروف شاعر وادیب اور ناقد ڈاکٹر تابش مہدی نے 'عزم سہریاوی کی حمد ونعت گوئی' کے عنوان سے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

''... نعت گوئی ایک سہل اور آسان صنف بھی ہے اور مشکل ودشوار بھی۔ سہل اور آسان اس لیے کہ اس کے لیے کسی زمین یا صنف کی قید نہیں ہے۔ ہر زبان اور ہر صنف میں نعت کہی جاسکتی ہے اور کہی گئی ہے، لیکن مشکل ودشوار اس لیے کہ اس میں خالق ومخلوق، عبد ومعبود اور رسالت ونبوت کی حدوں کا خصوصیت کے ساتھ خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ذرا سی غفلت یا لغزش انسان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔ مجھے شک نہیں کہ جناب ابوالفیض عزم سہریاوی کے نعتیہ اشعار فنی ولسانی اعتبار سے خواہ کسی بھی معیار کے ہوں، وہ نعت گوئی کے مذکورہ بالا معیار پر بڑی حد تک پورے اترتے ہیں۔''

اس حوالے سے جب ہم عزم سہریاوی کی حمدیہ ونعتیہ شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو امر واقعہ ہے کہ ایسی شاعری سامنے آتی ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

جو کام بھی کرو تم بس اتنا یاد رکھنا — ہر کام کو تمھارے اللہ دیکھتا ہے

ہمیں ڈوب جانے کا خدشہ نہیں ہے — کہ ہم تو نبیؐ کے سفینے میں آئے

امت کو بخشوانے کا وعدہ ہے روز حشر — ایسی ہے ہر بشر سے محبت رسولؐ کی

کتاب کے آخر میں معروف شاعر وادیب اسرار رازی قاسمی نے ابوالفیض عزم سہریاوی کی اہلیہ کی وفات پر جو خراج عقیدت پیش کیا ہے، اس نے اس کتاب کی افادیت میں بیش از بیش اضافہ کیا ہے۔ اسرار رازی غزل ونظم دونوں میں اپنا ایک انفراد ومقام رکھتے ہیں اور اکثر شعری نشستوں میں اپنے تہذیب وشائستگی سے پر کلام کے ذریعے محفل لوٹ لیتے ہیں۔ یہ خراج عقیدت دراصل عزم سہریاوی سے ان کے تعلق خاطر اور بزرگوں کے تئیں ان کی گہری عقیدت ومحبت کا غماز ہے۔ اس منظوم خراج عقیدت نے اہلیہ عزم سہریاوی کی زندگی کے کئی اہم گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ درج ذیل شعر آپ بھی پڑھیے اور خراج عقیدت میں شامل ہوجائیے۔

سر میں شورش، درد دل میں، لب پہ آہیں، چشم نم — اے 'صبیحہ' فیض تیرا عزم ہے یوں نوحہ خواں
اب ضعیفی میں اٹھائے عزم کیسے بار غم — ناتواں ہے، ناتواں ہے، ناتواں ہے، ناتواں

مضامین

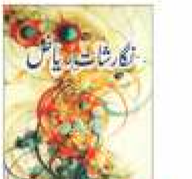

نگارشات ریاض

مصنف: ڈاکٹر ریاض احمد
صفحات: 130، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2024
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی 6
مبصر: صبیحہ اطہر، 322، گلی نمبر 9، للیتا پارک، لکشمی نگر، دہلی۔ 92

'نگارشات ریاض' ایک نثری کتاب ہے جس کے مصنف ڈاکٹر ریاض احمد ہیں۔ ان کے مضامین موقر جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس کتاب کی تقریظ انصاری اطہر حسین نے لکھی ہے مذکورہ کتاب میں 22 مضامین ہیں۔ اس کتاب میں بیشتر موضوعات وہ ہیں جو عہد حاضر میں نہایت اہمیت کے حامل ہیں جن کی ہر قدم پر ہمیں ضرورت ہوتی ہیں۔ مضمون نگار نے بھی یہی کاوش کی ہے کہ ان موضوعات کو حقیقت پسندانہ زاویے میں شامل کرسکیں۔ وہ اپنے پیش لفظ میں کہتے ہیں:

''میرے مضامین میں سماجی مسائل اور ایسے تعلیمی چیلنجز پر گفتگو کی گئی ہے، جن کا ہماری معاشرت اور طلبہ کی ذہنی نشوونما پر گہرا اثر ہے۔ یہ موضوعات ہر دور میں اہم رہے ہیں، اور آج بھی ان کی افادیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ میری تحریریں اسی سلسلے کی ایک

ادبی سی کاوش ہیں، جن کا مقصد معاشرے میں فکری تحریک اور تعلیمی ترقی کو اجاگر کرنا ہے۔"

'سرسید احمد خان: بصیرت افروز رہ نما' میں انیسویں صدی کی عظیم تاریخی شخصیت سرسید احمد خان کو ہندوستانی مسلمانوں میں جدید تعلیم کے فروغ کے لیے ان کی انقلابی کاوشوں کے باعث یاد کیا جاتا ہے۔ برطانوی راج کے دوران زندگی گزارنے والے سرسید نے مسلمانوں کو تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کے لیے تیار کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا۔ انھوں نے مسلمانوں میں جدید سائنسی تعلیم، انگریزی زبان کی اہمیت، اور توہمات وفرسودہ رسومات کے خلاف ایک مہم چلائی جس نے فکری وثقافتی بیداری کی بنیاد رکھی۔ اس مضمون میں ان کی تعلیمی اصلاحات اور اہم کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے، خاص طور پر سائنٹیفک سوسائٹی آف علی گڑھ کے قیام کے حوالے سے۔

انھوں نے سرسید احمد خان اور علامہ اقبال: دوراندیش شاعر اور فلسفی، میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔ سب سے پہلے سرسید احمد خان کے کردار پر روشنی ڈالی ہے اور پھر علامہ اقبال کی شاعری اور فلسفے کے اہم پہلوؤں کا ذکر کیا ہے۔ ان دونوں مفکرین کو انسانی نفسیات اور جذبات کا گہرا شعور تھا۔ ان مضامین کے مطالعے سے ان کی فکری اور سچی عکاسی ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں جذبات نگاری پر اچھی خاصی دسترس حاصل تھی۔

عظیم مفکر و رہ نما مولانا ابوالکلام آزاد پر مصنف نے روشنی ڈالنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ان کے والد نے انھیں اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم حاصل کرنے کی طرف بھی راغب کیا۔ وہ ایک نہایت ذہین طالب علم تھے۔ انھیں بچپن ہی سے اپنی سرزمین اور اپنے لوگوں کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ تھا۔ ایک بار ان کے استاد نے ان سے پوچھا کہ وہ بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں، تو انھوں نے جواب دیا "میں اپنے ملک کے لیے وہ کچھ کرنا چاہتا ہوں جس سے میرے لوگ خوشحال ہوں" ان کے بچپن کا یہ عزم بعد میں ان کی آزادی کی جدوجہد میں واضح نظر آتا ہے۔

اس کتاب کے دوسرے مضامین مختلف نوعیت کے ہیں۔ مذکورہ کتاب قارئین کے ساتھ ساتھ طلبا کے لیے مفید ثابت ہوگی۔ مذکورہ کتاب میں زندگی کا ہر رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ میرا بھرپور یقین ہے کہ نگارشات ریاض کو اردو دنیا میں چہار سو پذیرائی ملے گی۔

رسائل وجرائد

رسالہ جامعہ (میر تقی میر نمبر جلد اوّل)

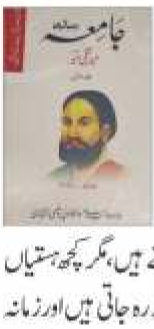

مدیر: پروفیسر شہپر رسول

صفحات: 352، قیمت: 300 روپے، اپریل-ستمبر 2023

زیراہتمام: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-110025

مبصر: ڈاکٹر نشاط حسن، دہلی

یوں تو دنیا میں لاکھوں لوگ روزانہ پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں، مگر کچھ ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی یاد صدیوں تک لوگوں کے دلوں میں محفوظ رہ جاتی ہیں اور زمانہ انھیں کبھی فراموش نہیں کر پاتا۔ ایسی ہی ایک شخصیت میر تقی میر کی ہے۔ میر اردو کے ان چند عظیم شعرا میں سے ہیں جن کی عظمت ہر دور میں تسلیم کی گئی ہے۔ ان کے ہم عصر اور بعد کے تذکرہ نگاروں میں ایک بھی ایسا نہیں جو ان کا ذکر احترام سے نہ کرتا ہو۔

رسالہ جامعہ میر تقی میر نمبر کا مطالعہ کرنے سے اتنی بات تو معلوم ہو جاتی ہے کہ میر صاحب شعرگوئی کو ایک ہنر اور فن سمجھتے تھے۔ وہ الفاظ کی ایسی ترتیب قائم کرتے ہیں جو قاری میں جذبے اور احساس کی انوکھی کیفیت پیدا کر دے کہ فن کا بنیادی وظیفہ حسن کی تخلیق ہے۔ الفاظ کی مخصوص ترتیب کے ذریعے قاری کے ذہن پر جو نقش قائم ہوتا ہے وہ ایسی مسرت سے ہمکنار کرتا ہے جو جمالیاتی تجربے سے مخصوص ہے۔

میر کی شاعری میں غم کا اظہار بھی ملتا ہے۔ ان کے یہاں ذاتی غم عالم گیر حیثیت کے احساس سے بھرا ہوا ہے۔ میر کے اس غم میں ان کے شعور کی جھلک نمایاں ہے۔ میر کا غم ان کی ذات تک محدود نہیں، وہ بیشتر بنی نوع انسان کا غم ہے، وہ غم کائنات ہے۔ یہ اپنے دل کی اندرونی فضا میں محدود ایک فرد کی شکست نہیں بلکہ ایک پورے عہد کی شکست ہے جس کو میر نے اپنی ذات میں سمیٹ لیا ہے۔ میر کا غم ذاتی نہیں۔ ساری کائنات کا غم ہے، میر کی زندگی میں غم ابتدا سے تھا۔ والد کے مرنے کے بعد میر نے جتنی پریشانیاں اور مصیبتیں اٹھائیں۔ شاید اردو کے کسی شاعر نے اٹھائی ہوں گی۔ میر کا دور سیاسی، سماجی اور اخلاقی ہر اعتبار سے بڑا پرآشوب دور تھا دہلی کو کئی بار لوٹا گیا۔ شرفا کی پگڑیاں اچھالی گئیں۔ مکانوں اور محلوں میں آگ لگا دی گئی۔ اگر میر نے یہ زمانہ پرآشوب زمانہ اور زمانے کے نشیب وفراز محسوس نہ کیے ہوتے تو ممکن تھا کہ وہ اپنے غم میں الجھ کر رہ جاتے اور معمولی غزل گو شاعر کی طرح اپنی ناکامیوں کا رونا روتے رہتے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ انھوں نے خود سے گزر کر اس غم کو دیکھا اور محسوس کیا۔ میر نے پاس وضع داری اور خودداری اس وقت بھی رکھی جب کہ زندگی کی عظیم قدریں پسپا ہو رہی تھیں۔ میر نے اپنی زندگی اور وقت کی سختیوں کے سامنے سپر نہیں ڈالی۔ اس لیے ان کے یہاں غم اٹھانے کا کام بہت خوش اسلوبی سے انجام دیا گیا ہے۔

پیش نظر رسالے میں اردو کے مشہور ادبا، محققین اور شعرا جیسے محمد حسین آزاد، نثار احمد فاروقی، کلب علی خاں فائق، سید محی الدین زور، علی احمد فاطمی، خواجہ احمد فاروقی، آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی، ناصر کاظمی، محمد حسن عسکری، شمیم حنفی، احمد جاوید، عبدالمغنی، قاضی افضال حسین، قاضی جمال حسین، ابوبکر عباد اور آکاش عشرت وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین مختلف اور متنوع حیثیت کے حامل ہیں جو ادبی، تحقیقی وتنقیدی صلاحیتوں کا پتا دیتے ہیں۔ یہ رسالہ عام ڈگر سے ہٹ کر اپنی انفرادی شناخت رکھتا ہے۔ رسالہ جامعہ میر تقی میر نمبر کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں پروفیسر شہپر رسول کا پرمغز اداریہ بھی شامل ہے جو کافی اہمیت کا حامل ہے ساتھ ہی اس رسالے کی ترتیب وتزئین میں بہت ہی سلیقے سے کی گئی ہے۔

بہرحال رسالہ جامعہ میر تقی میر نمبر میں شامل مضامین کا مطالعہ کرنے سے علم ہوتا ہے کہ میر اپنے دور کی پیداوار ہیں، لیکن ان کی شاعری آفاقی ہے۔ وہ اپنے اظہار میں اپنے دور سے بلند بھی ہو جاتے ہیں اور ذہن انسانی کے ایسے سربستہ رازوں سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں جو ہر دور کے لیے کشش رکھتے ہیں۔ رسالہ جامعہ میر تقی میر نمبر جلد اول' میر کے مختلف گوشوں سے آشنا کراتا ہے۔ رسالہ جامعہ میر شناسی میں ادب کے طالب علموں اور اسکالرز کے لیے معاون و مددگار ثابت ہوگا اور علمی وادبی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوگی۔ اس

■

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبر نامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی وثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان وادب کی سمت ورفتار کا بھی۔
یہ خبر نامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

جشن بچپن، ممبئی کے تعلق سے قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں میٹنگ

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں جشن بچپن، ممبئی کے تعلق سے ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں ممبئی سے فاروق سید (مدیر: گل بوٹے)، خورشید صدیقی، ڈاکٹر قاسم امام، وسیم سلیم شیخ اور عرفان علی پیرزادہ (ممبر قومی اردو کونسل نئی دہلی) نے شرکت کی۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال

نے کہا کہ فاروق سید گذشتہ کئی برسوں سے مختلف مقامات پر جشن بچپن کا انعقاد کرتے رہے ہیں اور بچوں کو کتاب کلچر سے جوڑنے کی کوشش کے علاوہ بچوں کے ادیبوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے رہے ہیں۔ جشن بچپن بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے مزید کہا کہ اس وقت بچوں کی شخصیت سازی اور ان کی ذہنی وفکری رہنمائی کی شدید ضرورت ہے۔ نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں حکومت ہند نے بھی بچوں اور مادری زبان کا خاص خیال رکھا ہے۔ بچوں کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے ہمیں وکست بھارت @2047 کے تناظر میں بھی کام کرنا ہوگا تاکہ ملک کی تعمیر وترقی میں بچے بھی اہم کردار ادا کرسکیں۔ فاروق سید (مدیر: گل بوٹے) نے کہا کہ جشن بچپن کے ذریعے ہم بچوں اور بچوں کے ادیبوں کو نہ صرف جوڑتے ہیں بلکہ ان کے اندر تحرک پیدا کرنے بھی کوشش کرتے ہیں۔ ہم مستقبل کے لیے صرف قاری نہیں بلکہ قلمکار بھی تیار کرنا چاہتے ہیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 6 جنوری 2025

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام پونہ بک فیسٹیول میں ’میرا تخلیقی سفر: مصنفین سے ملاقات‘ پروگرام

پونہ/دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے زیر اہتمام پونہ بک فیسٹیول فرگیوسن کالج پونہ میں ’میرا تخلیقی سفر: مصنفین سے ملاقات‘ کے عنوان سے پروگرام کا انعقاد کیا گیا، جس میں بطور مصنف ڈاکٹر صادقہ نواب سحر، نورالحسنین، قاضی مشتاق احمد اور رفیق جعفر نے شرکت کی۔ اس موقعے پر مصنفین اور تخلیق کاروں نے اپنے تخلیقی سفر کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ فکشن نگار ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہم اپنی کئی خوبیوں اور دلچسپیوں کو آزماتے رہتے ہیں، محنت اور قسمت ہمیں راستہ فراہم کرتے ہیں۔ انھوں نے پروگرام کے تعلق سے بتایا کہ اس طرح کے فیسٹیول زندگی میں خوبصورتی اور رنگ کا نہ صرف اضافہ کرتے ہیں بلکہ آج کے موبائل کلچر میں ہر نسل کو کتابوں سے جوڑنے کا مثبت اور دلچسپ ذریعہ بھی ہیں۔ ممتاز فکشن نگار نورالحسنین نے کہا کہ میرا تخلیقی سفر پروگرام آسان نہیں ہے اس سے ایک فائدہ ہوتا ہے کہ اپنے اندر جھانکنے کا موقع ملتا ہے، اور پتہ چلتا ہے قارئین کس طرح کا ادب پسند کر رہے ہیں، زندگی کے مسائل پر بات کرنے کی ضرورت ہے۔

مشہور کہانی کار اور ڈرامہ نویس قاضی مشتاق احمد نے کہا کہ اردو زبان نے ہمیشہ دوسری زبانوں کے ساتھ تعاون کر کے اچھا منظرنامہ پیش کیا ہے۔ اس کام کو آگے بڑھانے میں قومی کونسل نے بڑا اچھا کام کیا ہے۔ اس کے لیے کونسل اور اس کے اراکین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ادب زندگی ہے اور اس کی روح تخلیقی ادب ہے۔ کہانیاں افسانے

ڈرامے بڑے پیمانے پر غیر اردو ماحول میں پیش کر کے اس مہم کو اور جاندار بنایا جا سکتا ہے۔

مشہور شاعر اور مصنف رفیق جعفر نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ جب سے ڈاکٹر شمس اقبال نے ذمے داری سنبھالی ہے کونسل نئے منصوبوں کے ساتھ زیادہ فعال نظر آ رہا ہے، ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں تیز ہوئی ہیں، شمس اقبال کے ادارے این سی پی یو ایل کے منصوبوں اور ارادوں کی غمازی کرتے ہیں۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ممبر عرفان علی پیرزادے، اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر عبدالباری، شاہ تاج پونے، ڈاکٹر عظیم راہی وغیرہ کے علاوہ بڑی تعداد میں سامعین موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 20 دسمبر 2024

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ ’اردو دنیا‘ کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے ’اردو دنیا‘ میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

اردو زبان و ادب کی تدریس: مسائل اور جدید طریقہ کار

نئی دھلی: اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی اور قومی کونسل

برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے مشترکہ طور پر اردو زبان و ادب کی تدریس: مسائل اور جدید طریقہ کار' کے عنوان پر ایک روزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا۔ سمینار کا افتتاحی اجلاس 19 دسمبر کو شروع ہوا جس میں ملک بھر سے معروف ماہرین تعلیم محققین، پریکٹیشنرز اور طلبہ اردو میڈیم کے ذریعے اردو زبان و ادب کی تدریس، آموزش اور ان کے مسائل اور خدشات پر غور کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت شیخ الجامعہ پروفیسر مظہر آصف نے کی۔ وہیں این سی پی یو ایل، نئی دہلی سے ڈاکٹر کلیم اللہ نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا، اور سمینار کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ افتتاحی اجلاس کے دوران مہمانوں کے ہاتھوں دو اہم کتابوں کا اجرا کیا گیا۔ پروفیسر جسیم احمد نے اپنے خطاب میں اردو زبان کے فروغ پر توجہ دینے کے ساتھ ساتھ طلبہ کی زندگیوں میں اساتذہ کے کردار پر روشنی ڈالی۔ کلیدی خطبہ ڈاکٹر محمد فاروق انصاری، سربراہ این سی ای آر ٹی، دہلی نے پیش کیا جنھوں نے آج کے تعلیمی اور پیشہ ورانہ تناظر میں مادری زبان کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے موضوع کا بصیرت انگیز جائزہ پیش کیا۔ مہمان خصوصی پروفیسر مظہر آصف نے سامعین سے خطاب کیا اور ہندوستان کے لسانی تنوع کا تذکرہ کرنے کے ساتھ سماجی لسانی بیداری اور بین الثقافتی رابطے کا ذکر کیا۔ افتتاحی اجلاس ڈاکٹر حنا آفرین، اسسٹنٹ پروفیسر جامعہ کے اظہار تشکر کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ اختتامی اجلاس، بی آئی ٹی کانفرنس ہال، جامعہ میں ہوا جس میں سمینار میں پڑھے گئے مقالے کا خلاصہ پیش کیا گیا اور سمینار کی رپورٹ پڑھی گئی اور اہم نکات پر روشنی ڈالی گئی۔ اس سیشن کی صدارت پروفیسر شہزاد انجم، شعبہ اردو، جامعہ نے کی اور پروفیسر شہپر رسول نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے اختتامی اجلاس میں شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 دسمبر 2024

کرشنا سوبتی کے صدسالہ یوم پیدائش کے موقعے پر سمینار

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام کرشنا سوبتی کے صدسالہ یوم پیدائش کے موقعے پر منعقدہ دو روزہ سمینار اختتام پذیر ہوگیا جس میں کرشنا سوبتی کے افسانے اور خواتین پر ان کی بحث پر توجہ مرکوز کی گئی۔ گوپیشور سنگھ کی صدارت میں 'کرشنا سوبتی کے افسانوی ادب' پر ندھی اگروال، سدھانشو گپتا اور سنیتا نے اپنے اپنے مضامین پیش کیے۔ کرشنا سوبتی کا ادب اور خواتین پر سیشن کا اختتام کشما شرما کی صدارت میں ہوا اور اپنا مشرا، سویتا سنگھ اور اپاسنا نے مضامین پیش کیے۔ کرشنا سوبتی کے افسانے پر بات کرتے ہوئے ندھی اگروال نے کہا کہ 70-60 سال پہلے کرشنا سوبتی نے خواتین کے شعور کے ہمہ جہت پہلوؤں کو پیش کیا ہے جن کے بارے میں اس وقت کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ سدھانشو گپتا نے ان کا موازنہ ہمعصر مصنفین منو بھنڈاری اور اوشا پریم ودا سے کرتے ہوئے کہا کہ منو بھنڈاری نے متوسط طبقہ کے تضادات کی تصویر کشی کی ہے، اوشا پریم ودا نے ازدواجی تعلقات، خاندان اور رشتوں کی تصویر کشی پر روشنی ڈالی، جب کہ کرشنا سوبتی نے خواتین کی جسمانی ساخت کو مختلف طریقے سے اپنایا ہے۔ آزادی ان کی کہانیوں کا مرکز ہے۔ کرشنا سوبتی کی کہانیوں پر بات کرتے ہوئے سنیتا نے کہا کہ ان کی کہانیاں پنجاب کے متوسط طبقے کے خاندانوں پر مرکوز ہیں اور ان میں حقیقت محسوس کی جاسکتی ہے۔ گوپیشور سنگھ نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ان کی ہر تخلیق نے قارئین اور ناقدین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ کرشنا سوبتی کے ادب پر بات کرتے ہوئے اپاسنا نے کہا کہ ان کی خواتین کی بحث میں زندگی کے تئیں بغاوت اور خوشی شامل ہے۔ پروگرام کی نظامت اکادمی کے ڈپٹی سکریٹری دیویندر کمار دیویش نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 دسمبر 2024

شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پروگرام

نئی دھلی: شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ڈاکٹر عبدالحلیم لائبریری میں عربی زبان اور ہندوستانی زبانوں کے باہمی رشتے پر ایک پروگرام منعقد کیا گیا جس میں شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق طالب علم عزیز نبیل نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن نے ادا کیے۔ پروفیسر حبیب اللہ خان، ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نے مہمان کا استقبال کرتے ہوئے ان کی علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ عزیز نبیل اردو دنیا کے لیے ایک معروف شخصیت

ہیں۔ اردو ادب اور شاعری میں ان کی کئی تصنیفات ہیں، نیز ان کے دو دیوان شائع ہوکر اہل علم و ادب سے خراج تحسین حاصل کرچکے ہیں، جلد ہی ان کے منتخب اشعار کا عربی ترجمہ بھی منظرعام پر آئے گا۔ اس موقعے پر عزیز نبیل نے اپنی کئی غزلیں اور نظمیں بھی سنائیں۔ پروفیسر نسیم اختر ندوی صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے صدارتی خطاب میں عزیز نبیل کی شاعری پر گفتگو کی اور کہا کہ ہمارے شعبہ کے فارغین زندگی کے مختلف میدانوں میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں، آج ہمیں خوشی ہورہی ہے کہ ہم عزیز نبیل صاحب کی شاعری سے محظوظ ہوئے۔ آخر میں آپ نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 13 دسمبر 2024

'بی اماں صدی' پر معصوم مرادآبادی کا کلیدی خطبہ

نئی دھلی: مولانا محمد علی جوہر کی والدہ بی اماں نے نہ صرف جنگ آزادی کے دو عظیم مجاہدین کی پرورش

و پرداخت کی بلکہ انھوں نے خود بھی آزادی کی جنگ لڑی۔ ان خیالات کا اظہار 10 دسمبر کو سینئر صحافی اور محقق معصوم مرادآبادی نے مولانا محمد علی جوہر کے یوم پیدائش کی تقریب میں 'بی اماں' پر کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ اس تقریب کا اہتمام مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی نے کیا تھا۔ واضح رہے کہ بی اماں کے انتقال کو گزشتہ نومبر میں ایک صدی پوری ہوگئی ہے۔ ان کا انتقال 13 نومبر 1924 کو دہلی میں ہوا تھا۔ اس خطبہ کا اہتمام اسی مناسبت سے کیا گیا تھا۔

معصوم مرادآبادی نے کہا کہ "بی اماں کے والد کو جب انگریزوں نے سزائے موت دی تو ان کی عمر محض پانچ سال تھی۔ ان کی شادی رامپور میں ہوئی۔ شادی سے قبل وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھیں، لیکن شوہر عبدالعلی خاں تعلیم یافتہ تھے اور ان ہی کی صحبت میں بی اماں نے لکھنا پڑھنا سیکھا، لیکن افسوس جوانی میں ہی شوہر کا انتقال ہوگیا۔ بی اماں نے اپنے بل بوتے پر سات بچوں کی پرورش کی اور مولانا محمد علی کو اعلیٰ تعلیم کے لیے آکسفورڈ بھیجا۔ مولانا محمد علی جوہر کا بیان ہے کہ "میری والدہ عملی طور پر بالکل ان پڑھ تھیں مگر مجھے زندگی میں جن لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، ان میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں ملا جو میری والدہ سے زیادہ صاحب فہم ہو۔" مولانا محمد علی یہ بھی کہتے تھے کہ وہ جو کچھ بھی ہیں اور جو کچھ ان کے پاس ہے، وہ خداوند کریم نے انھیں ان کی والدہ کے ذریعہ پہنچایا تھا۔"

مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی کے صدر خواجہ محمد شاہد نے 'یوم جوہر' کی تقریب میں مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ یافتگان کو مبارکباد پیش کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول اور اوما شرما نے شرکت کی۔ جن لوگوں کو جوہر ایوارڈ سے نوازا گیا، ان میں سینئر ایڈووکیٹ اہل نوریا، پروفیسر اخلاق آہن، پروفیسر روی کے تریاٹھی، ڈاکٹر سحر

قریشی اور صحافی یامین انصاری کے نام شامل ہیں۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر سید فاروق نے کی اور شکریہ جوہر اکیڈمی نے جنرل سکریٹری احمد ندیم نے کیا۔

پریس ریلیز: معصوم مرادآبادی، دہلی، 10 دسمبر 2024

اردو کی تدریس کو درپیش مسائل

نئی دھلی: اردو کی اپنی مٹھاس اور اپنی توانائی ہے جس نے اس کو دنیا میں اہمیت دلائی۔ اسی نے اس کو سخت نامساعد حالات میں بھی زندہ رکھا ہے۔ اردو کی تدریس کو درپیش مسائل میں زیادہ سنگین مسئلہ اپنی زبان کی طرف سے ہماری مایوسی، اساتذہ کی تربیت اور نئی ٹیکنالوجی سے استفادہ کا ہے۔ ان خیالات کا اظہار انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز کے آڈیٹوریم میں 'اردو کی تدریس کو درپیش مسائل' پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر

محمد کاظم نے کیا۔ پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ یہ ایک بہت پھیلا ہوا موضوع ہے، ابتدائی، ثانوی اور یونیورسٹی، ہر سطح پر ہمارے گوناگوں مسائل ہیں۔ پروفیسر حسینہ حاشیہ نے کہا کہ ڈکشنری کو اپڈیٹ کرنے، اصطلاحات کے متبادل وضع کرنے اور اردو میں معاون درسی کتب کی خاطر خواہ اشاعت کا نظم کرنے کی ضرورت پر توجہ دلائی، ڈاکٹر شعیب رضا خان نے کہا کہ اردو کے طلبہ کے لیے نصاب کی ساری کتابیں دستیاب ہیں، این سی ای آر ٹی اور این آئی او ایس نے نصاب کی معیاری کتابیں تیار کرائیں ہیں حتیٰ کہ این آئی او ایس نے سینئر سیکنڈری میں قانون کا نصاب بھی متعارف کرایا ہے۔ مقررین نے اپنے اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں تعلیم و تدریس کے عملی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے کمیوں، کوتاہیوں اور خامیوں کی تفصیل کے ساتھ نشاندہی کی۔ پروگرام کا آغاز انجم نعیم کے خیر مقدمی کلمات سے ہوا۔ نظامت احمد جاوید نے کی۔ پروگرام کا اختتام کنوینر کے کلمات تشکر پر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 دسمبر 2024

حسین الحق: ناول نگار، کہانی کار اور صوفی

نئی دھلی: پروفیسر حسین الحق کی وفات کے تین سال مکمل ہونے پر حسب روایت مولانا انوار الحق اردو لائبریری، گیا بہار اور میران فاؤنڈیشن ٹرسٹ کے زیراہتمام ایک ویبینار بعنوان 'حسین الحق: ناول نگار، کہانی کار اور صوفی' کا انعقاد کیا گیا۔ آن لائن پروگرام میں متعدد اہم شخصیات اور ریسرچ اسکالروں نے شرکت کی۔ اس موقعے پر کلیدی گفتگو کرتے ہوئے منفرد لب و لہجے کے فکشن نگار اور جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبہ اردو کے استاد پروفیسر خالد جاوید نے حسین الحق کی تخلیقی صلاحیتوں کے حوالے سے کہا کہ حسین الحق کا معاملہ یہ ہے کہ انھوں نے قرۃ العین حیدر کے بعد اردو ناول کو جس عروج پہ پہنچایا وہ شاید کسی اور نے نہیں پہنچایا۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے ناول لکھے۔ 'بولو مت چپ رہو' اور 'فرات' ناول کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے استاذ پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ حسین الحق سے میرے بہت اچھے تعلقات تھے۔ میں ان کے افسانوں کا انتخاب کررہا تھا تو انھوں نے کہا کہ دوستی کو کنارے رکھ

کر انتخاب کرنا جس کا نتیجہ یہ رہا کہ حسین الحق کے افسانوں کے انتخاب کو کافی مقبولیت ملی۔ ڈاکٹر علی امام نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے ایک بات یہ محسوس ہوتی ہے کہ مضامین جتنے بھی لکھے جارہے ہیں، ان سارے مضامین میں فنکار کے اندر جو تخلیقی اشارات موجود ہیں، اس کا ذکر کم ہوتا ہے اور لوازمات پر بہت زیادہ بات کی جاتی ہے۔ معروف مترجم اور کنگ سعود یونیورسٹی، ریاض کے پروفیسر سرور حسین نے کہا کہ قربانی صبر اور محبت ان کے ناول 'اماوس میں خواب' کا تھیم ہے۔ حسین الحق اس ناول سے ہندو مسلم اتحاد کا ایک نیا آغاز کرتے ہیں۔ پروگرام کی صدارت مرزا غالب کالج، گیا بہار کے سابق صدر شعبہ انگریزی پروفیسر عین تابش نے کی اور نظامت کے فرائض نئی نسل کے نمائندہ افسانہ نگار اور شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی سے وابستہ ڈاکٹر نورین علی حق، دہلی اور جے این یو کی طالبہ ثمن رضوی نے انجام دیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 19 دسمبر 2024

غالب انسٹی ٹیوٹ میں سہ روزہ سمینار

دھلی: غالب کے کلام میں نالہ و فریاد کا ایک بڑا سرچشمہ تھا۔ ان کے ذہن میں معانی و شوق کا جو وفور تھا

وہ اظہار کے کسی پیرائے کی گرفت میں نہ آتا تھا۔ اس کی وجہ سے ان کے کلام میں لفظ و معنی کی آویزش اکثر محسوس ہوتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر قاضی جمال حسین نے بین الاقوامی غالب سمینار کا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ غالب تقریبات کا افتتاح 20 دسمبر کو شام چھ بجے ایوان غالب میں سابق چیف انفارمیشن کمشنر جناب وجاہت حبیب اللہ نے کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ غالب تقریبات کے تحت ہونے والی سرگرمیاں ہماری علمی اور ثقافتی وابستگی کو واضح کرتی ہیں۔ سمینار کا موضوع 'فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے'، غور و فکر کے بہت سے زاویے اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ اجلاس کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی انھوں نے کہا کہ انسان کی تمناؤں کا، خوابوں کا اور اس کے عزم کا جس قدر خوبصورت اور پر اعتماد بیان غالب کے یہاں ہے کہیں اور نہیں ملتا۔ جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر پروفیسر محمد افشار عالم نے افتتاحی اجلاس میں بطور مہمان خصوصی شرکت کی اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ ہر برس بین الاقوامی غالب تقریبات کا انعقاد کرتا ہے۔ غالب کو یاد کرنا ایک اعتبار سے تازہ دم رہنے کا ہم معنی ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا غالب انسٹی ٹیوٹ ہر برس غالب کے یوم پیدائش کے موقعے پر دسمبر میں غالب تقریبات کا اہتمام کرتا ہے اور یہ تقریبات محض رسمی نہیں ہوتیں بلکہ ہم نے پورے سال کیا کیا اس کی ایک رپورٹ بھی ہوتی ہے یہ رپورٹ کتابوں کی رونمائی کی شکل میں پیش کی جاتی ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی کو فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے تحقیق و تنقید، پروفیسر محمد رضا نصیری (ایران) کو فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے فارسی تحقیق و تنقید، اور پروفیسر عبدالرشید کو غالب انعام برائے مجموعی ادبی خدمات پیش کیا گیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کی درج ذیل نئی مطبوعات کی رسم رونمائی ہوئی: (1) غالب اور جشن زندگی، ڈاکٹر ادریس احمد (2) غالب راز حیات اور اضطراب آگہی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی (3) توضیحی اشاریہ غالب نامہ، پروفیسر فاروق انصاری (4) اردو ادب کی تشکیل جدید، پروفیسر ناصر عباس نیر (5) کچھ غالب کے بارے میں، ڈاکٹر محضر رضا (6) دیوان غالب (مکمل ترجمہ ڈاکٹر سید رفیق پاشا حسینی) (7) غالب نامہ کے دو شمارے (8) ڈائری کلینڈر 2025۔ افتتاحی اجلاس کے بعد معروف غزل سرا ڈاکٹر رادھیکا چوپڑا نے غالب اور دوسرے شعرا کی غزلیں پیش کیں۔

سمینار کے دوسرے دن ملک و بیرون ملک سے تشریف لائے مقالہ نگاروں نے شرکت کی۔ 21 دسمبر کو چار ادبی اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت سابق صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے کی۔ صدارتی تقریر کے دوران انھوں نے کہا کہ تجسس غالب کی شاعری کی بنیادی شناخت ہے اور ہمارے تمام اہم نقادوں نے اس تعلق سے لکھا ہے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر توصیف ڈار، ڈاکٹر نوشاد منظر نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شاہد اقبال نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر عبدالحق نے کی۔ مقالات پر گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ غالب ہوں یا اقبال ان کی شاعری کو فارسی سے واقفیت کے بغیر باقاعدہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ مجھے خوشی ہے کہ آج کے اجلاس میں غالب کی فارسی نویسی پر بھی مقالے پڑھے گئے لیکن آئندہ نسل کو اس طرف زیادہ متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر خالد علوی، پروفیسر شافع قدوائی، ظہیر انور، ڈاکٹر معید رشیدی نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر عالیہ نے انجام دیا۔ تیسرا اجلاس آن لائن منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور پروفیسر قاضی جمال حسین نے کی۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ اس سال سمینار کا عنوان ایک قسم کی آزمائش بھی ہے تاکہ تکرار سے محفوظ رہا جاسکے۔ پروفیسر قاضی جمال حسین صاحب نے کہا کہ کسی شاعر کا مطالعہ کرتے وقت یہ احتیاط رکھنا چاہیے کہ اس کی تخلیقی شخصیت اور ظاہری شخصیت میں ایک فاصلہ قائم رہے۔ ظاہری شخصیت کا کچھ عکس تو تخلیق میں ہوتا ہے لیکن بعینہٖ نہیں ہوتا۔ اس اجلاس میں پروفیسر تحسین فراقی، پروفیسر اصغر ندیم سید اور پروفیسر ناصر عباس نیر نے مقالات پیش کیے اور پروفیسر سرورالہدیٰ نے مقالہ نگاروں کا تعارف پیش کیا۔ چوتھے اجلاس کی صدارت سابق صدر شعبہ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے کی۔ اپنی صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے بین الاقوامی سمینار کی یہ خصوصیت بھی

ہے کہ یہاں فارسی دنیا کے نامور محققین کو بھی مدعو کیا گیا ہے جنھوں نے غالبیات کے تعلق سے ایران میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ اس اجلاس میں پروفیسر محمد رضا نصیری، پروفیسر کریم نجفی، پروفیسر اخلاق احمد آہن اور ڈاکٹر ارشد القادری نے 'غالب اور احساس غم' کے عنوان سے مقالات پیش کیے اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر سید وجاہت مظہر نے کی۔ اجلاس سے قبل آغا محمد باقر شمس کی کتاب 'داستان لکھنؤ' اور 'دبستان لکھنؤ' اور پروفیسر کریم نجفی برزیگر کی مرتبہ کتاب 'مہر نیم روز' کی رسم رونمائی عمل میں آئی۔ اس موقعے پر آغا محمد باقر شمس کے نواسے جناب وقار حیدر اور پروفیسر انیس اشفاق نے بھی مختصراً اظہار خیال کیا۔ سمینار کے بعد عالمی مشاعرے کا انعقاد ہوا جس کی صدارت جناب وقار حیدر (امریکہ) نے کی، جناب جلیل نظامی (قطر)، جناب امیر مہدی (لندن) نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی اور نظامت جناب منصور عثمانی نے کی۔

جن شعرا نے کلام پیش کیا ان کے نام اس طرح ہیں: پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر نواز دیوبندی، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر فاروق بخشی، جناب شکیل حسن شمسی، پروفیسر مہتاب حیدر نقوی، ڈاکٹر شبنم عشائی، جناب اعجاز پاپولر، شکیل اعظمی، جناب معین شاداب، ڈاکٹر مجاہد فراز، جناب ماہر سیوہاروی، جناب سیف بابر، جناب مصداق اعظمی، محترمہ عصمت زیدی شفا، جناب صہیب احمد فاروقی اور جناب سالم سلیم۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے آخری دن تین اجلاس ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر ارتضی کریم نے کی۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ پوری اردو دنیا کی نظر یہاں کے بین الاقوامی سمینار پر ہوتی ہے، اس لیے ہمیں اپنی ذمے داریوں کا احساس زیادہ ہونا چاہیے۔ اس اجلاس میں جناب امیر مہدی، جناب سیفی سرونجی، اور ڈاکٹر احسان حسن نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر حنبل رضا نے کی۔ دوسرے اجلاس کے صدر جناب ظہیر انور نے اپنی تقریر میں کہا کہ تنہائی ہر تخلیق کار کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے لیکن یہی اس کا کرب بھی ہے۔ ہر شخص کی تنہائی اپنا منفرد مفہوم رکھتی ہے۔ اس اجلاس میں پروفیسر انیس اشفاق، پروفیسر سرورالہدیٰ اور ڈاکٹر جاوید نجار نے مقالات پیش کیے۔ آخری اجلاس کا صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ علمی مذاکروں کا فیضان یہ ہے کہ یہاں بہت سارے مقالہ نگار اپنے مطالعے کا نچوڑ پیش کرتے ہیں اس طرح ہم چند لمحوں میں بہت ساری کتابوں کا مطالعہ کر لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے سمیناروں میں شرکت بڑے فائدے کا سودا ہے۔ اس اجلاس میں پروفیسر مظہر مہدی، ڈاکٹر شاہد پٹھان، ڈاکٹر خالد مبشر نے مقالات پیش کیے۔ اختتامی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ بین الاقوامی غالب تقریبات میں مقالہ نگاروں اور شرکا کی شرکت ہمیں نئی توانائی عطا کرتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ بھی آپ کا تعاون اسی طرح برقرار رہے گا۔ پروفیسر انیس اشفاق نے کہا کہ غالب تقریبات نے ایک پوری نسل کی تربیت کی ہے۔ میری کئی تحریریں اس سمینار کی وجہ سے وجود میں آئی ہیں۔ پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ غالب کا سرمایۂ شعر دوسرے بہت سے شعرا کے مقابلے میں مختصر ہے لیکن یہ ایسا سر چڑھ کے بولتا ہے کہ دوسرا کوئی شاعر اس کے مقابلے نہیں ٹھہر سکتا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ادریس احمد نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ ہر سال کسی اہم موضوع پر سمینار منعقد کرتا ہے اور اس کے پیچھے منصوبہ یہی ہوتا ہے کہ غالب اور ان کے تمام ادبی سرمایہ پر نئے سرے سے غور کیا جائے۔ سمینار کے بعد اردو ڈرامہ 'نظیر کتھا کیرتن' پیش کیا گیا۔ اس کے ڈائرکٹر جناب رجنیش بشٹ تھے اور پیش کش ہم سب ڈرامہ گروپ اور کھیل تماشا تھیٹر گروپ کی تھی۔

قندیل آن لائن ڈاٹ کام

اردو گھر میں جوش ملیح آبادی کے شعری و نثری مجموعوں پر مذاکرہ

نئی دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام بہ اشتراک عبارت پبلی کیشنز جوش ملیح آبادی کے آخری شعری مجموعہ 'محمل وجرس' اور آخری نثری مجموعہ 'فکر و ذکر' پر ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ اردو گھر میں منعقدہ اس مذاکرے میں جوش ملیح آبادی کے فکری، شعری اور شخصیت انفراد کا اعتراف کیا گیا اور اردو شعر و ادب میں جوش کے مرتبے کے از سر نو تعین پر زور دیا گیا۔ یہ کتابیں امریکہ کے ہیوسٹن میں مقیم نامور شاعر و ادیب عدیل زیدی نے ترتیب دی ہیں۔ پروفیسر اختر الواسع کی صدارت میں ہوئے اس جلسے میں نامور اور معتبر اسکالروں نے شرکت کی۔ پروفیسر اختر الواسع نے صدارتی تقریر میں کہا کہ کسی بھی اعتبار سے جوش کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اپنی نظموں، غزلوں، رباعیات اور قطعات سے اردو کے ادبی ذخیرے کو متمول کیا۔ پروفیسر خالد علوی نے جوش کی شخصیت اور ادبی خدمات کے حوالے سے پر مغز گفتگو کی۔ حقانی القاسمی نے جوش کے فکر و فن پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جوش کثیر الاسالیب شاعر و نثر نگار تھے۔ انھوں نے کہا کہ جوش نے متروک اور مرحوم الفاظ کو استعمال کر کے انھیں زندہ کیا، ساتھ ہی غیر مانوس اور علاقائی لفظوں کو بھی نظم و نثر کا حصہ بنایا۔ پروفیسر اخلاق آہن نے جوش کی شاعری کے رنگ و آہنگ کو واضح کرتے ہوئے اس پر فارسی ادب کے اثرات کا تجزیہ کیا۔ مذاکرے کا آغاز کرتے ہوئے معین شاداب نے کہا کہ جوش کو کسی نے شاعر شباب کہا، کسی نے شاعر رومان و جذبات کہا، کسی نے اشتراکیت سے ان کا رشتہ جوڑا، لیکن وہ دراصل شاعر انسانیت تھے۔ انس فیضی نے تمہیدی کلمات پیش کیے۔ کلمات تشکر پیش کرتے ہوئے صحافی جاوید رحمانی نے جوش کی شعری و نثری کاوشوں کے باقیات کی اشاعت کو خوش آئند بتایا۔ تقریب میں مختلف شعبوں سے وابستہ شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 دسمبر 2024

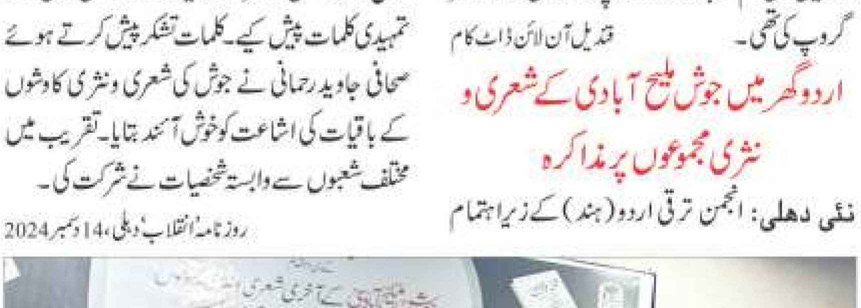

غالب کے 227 ویں یوم پیدائش پر تقریب کا اہتمام

نئی دھلی: غالب اکیڈمی میں وزارت ثقافت حکومت ہند کے تعاون سے غالب کے 227 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر جلسے کا انعقاد کیا گیا۔ غالب کے پیدائش کے موقعے پر منعقدہ پروگرام میں پروفیسر جانکی پرساد شرما نے غالب کی شاعری میں تصوف کے عنوان سے لیکچر دیتے ہوئے کہا کہ غالب جس اونچائی اور جس انداز میں گفتگو کرتے ہیں اس میں تصوف کی اقدار کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکلتا ہے۔ ان کی بہت سی باتیں صوفیائے کرام کے اقوال سے مطابقت رکھتی ہیں، جگہ جگہ ان کے یہاں ہمہ است کی گونج سنائی دیتی ہے۔ دراصل انسان دوستی صوفیا کی تعلیمات کی توسیع ہے۔ پروفیسر ظہیر حسین جعفری نے کہا کہ غالب اپنے معاشرے سے متاثر تھے۔ وہ بادشاہ اور نوابین سے وظیفہ حاصل کرنے کی جدوجہد میں رہے اور نئی حکومت سے خاندانی پنشن حاصل کرنے کے لیے کلکتے کا سفر بھی کیا۔ اس موقعے پر متین امروہوی نے اپنا کلام پیش کیا۔ ممبئی سے تشریف لائی اندرا نائک نے غالب کی کئی غزلیں موسیقی کے ساتھ پیش کیں۔ محفل کلام غالب کی نظامت ڈاکٹر شفیع ایوب نے کی۔ اس موقعے پر عربی اور اردو سیکھنے والے طلبا کو اسناد تقسیم کی گئیں۔ اس پروگرام میں کثیر تعداد میں شائقین غالب موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 دسمبر 2024

اردو گھر میں جشن ڈاکٹر افروز طالب

نئی دھلی: ڈاکٹر افروز طالب اردو- ہندی شاعری کا سنگم ہیں، ان کی شاعری میں دونوں زبانوں کا ایک ایسا امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے جو عام طور پر کم شعرا کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ اردو اور ہندی الفاظ اتنی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، جس سے شاعری کی خوبصورتی میں بہت اضافہ ہوتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار یوپی کے ضلع بلرام پور سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر افروز طالب کے یوم ولادت کے موقعے پر نئی دہلی کے اردو گھر میں شیخ الہند سیوا سنستھان کے زیر اہتمام محفل بیان اور مشاعرہ و کوی سمیلن میں کیا گیا۔ محفل بیان اور مشاعرہ و کوی سمیلن کی صدارت دہلی اردو اکیڈمی کے وائس چیئرمین اور ممتاز شاعر پروفیسر شہپر رسول نے کی۔ بطور مہمان خصوصی رئیس مظفرنگری نے شرکت کی جب کہ مہمان ذی وقار کے طور پر معروف شاعر عزم سہریاوی موجود رہے۔ نظامت کی ذمے داری معین شاداب نے نبھائی۔ اس موقعے پر مہمان شاعر معید رہبر لکھنوی کے پہلے شعری مجموعے 'منظور نظر' اور ممتاز شاعر ارشد ندیم کی کتاب 'سنگ میل' کی رسم رونمائی بھی ہوئی۔ استقبالیہ کلمات شیخ الہند سیوا سنستھان کے صدر اور آرگنائزر محمد اکمل شیخ نے اور کنوینر طالب میموریل سوشل اینڈ ایجوکیشنل ٹرسٹ کے سکریٹری اور تقریب کے کنوینر سراج طالب نے پیش کیا۔ نوجوان صحافی ڈاکٹر نثار احمد خان نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے والد مرحوم محمد طالب علمی، ادبی، رفاہی اور سیاسی حلقوں میں پہچان رکھتے تھے۔ ڈاکٹر افروز بھی اپنے والد کے نقش قدم پر چل کر خاص و عام میں بے حد مقبول ہوئے۔ مشاعرہ اور کوی سمیلن میں مختلف شعرا نے اپنے کلام پیش کیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 16 دسمبر 2024

ایران کلچر ہاؤس میں خطاطی ورکشاپ

نئی دھلی: ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی میں انجمن خطاطان ہند کے باہمی اشتراک سے ایرانی اساتذہ کے فن پارو ں کی نمائش اور خطاطی ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا جس میں ایران سے آئے دو جید استاذ ڈاکٹر احسان نعمان پور اور استاد ڈاکٹر علی رضا بخشی نے شرکت کی۔ اس ورکشاپ میں عالمی شہرت یافتہ ایرانی خطاط استاد میر عماد الحسنی کی 60 صفحات پر مشتمل کتاب 'سرمشق خوشنویسی نستعلیق' کا اجرا بھی عمل میں آیا جس میں طلبہ کو مشق کرنے کے طریقے و تمام رموز و اوقاف سے آشنا کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ خطاطی ایک بہترین اور اہم ترین فن ہے۔ اس فن کے ماہرین کو دنیا نے بڑی قدر و اہمیت دی ہے۔ ایران کے جید اور مشہور استاد ڈاکٹر احسان نعمان پور اور ڈاکٹر علی رضا بخشی نے فن خطاطی سے متعلق طلبہ و طالبات کو اس فن کی باریکیوں سے آشنا کرایا اور جو طلبہ نے اب تک لکھا ہے اس کی اصلاح بھی کرائی۔ استاد نعمان پور نے کہا کہ ہندوستانی طلبہ اور اساتذہ سے مل کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ میں بہت جلد ایک خطاطی گروپ بنا کر ان طلبہ کو مزید فن خطاطی سکھانے کی کوشش کروں گا۔ ایران کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر فریدالدین فرید عصر نے کہا کہ فن خطاطی میں اپنی بے مثال مہارت کے مایہ ناز استاد میر عماد الحسنی ایک عظیم شخصیت اور اچھے اخلاق کے مالک تھے۔ استاد علی رضا بخشی نے کہا کہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ خطاطی کی تربیت آسان حروف اور الفاظ کی مشق سے شروع ہوتی ہے اور پھر ہم مزید پیچیدہ خطوط کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس ورکشاپ میں مختلف شہر اور مراکز کے طلبا نے شرکت کی، جیسے کشمیر، غازی آباد، نوئیڈا، بریلی، آسام، سہارنپور، مظفرنگر، علی گڑھ، لکھنؤ اور خصوصاً دہلی کے خطاطی مراکز اردو اکادمی، غالب اکادمی اور ہنر اکادمی اوکھلا کے طلبہ نے ورکشاپ میں فن خطاطی کو سیکھنے میں بہت ہی دلچسپی دکھائی۔ آخر میں انجمن کے جنرل سکریٹری قاری محمد یسین نے تمام اساتذہ اور طلبہ کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 جنوری 2024

اتر پردیش

جشن یوم جوہر

رامپور: صولت پبلک لائبریری میں پہلی بار جشن یوم جوہر کا انعقاد مولانا محمد علی جوہر کے خاندان کے قریبی فرد ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی کی صدارت میں کیا گیا۔ مذاکرے میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے مین پوری کے جوڈیشیل مجسٹریٹ جسیم خان نے شرکت کی۔ رضا لائبریری کی کیڈلا کر شازیہ حسن نے اپنے مقالہ مولانا محمد علی جوہر کی زندگی کے کچھ گوشے کے عنوان سے میں کہا کہ اگر ہم انھیں بھلا دیں گے تو آنے والی نسلوں کو کیسے پتہ چلے گا کہ ملک کو آزاد کرانے میں مولانا محمد علی جوہر کا کیا کارنامہ رہا ہے۔ ڈاکٹر رضیہ پروین نے اپنے مقالہ عظیم مجاہد آزادی محمد علی جوہر میں بتایا کہ 1860 میں مولانا ٹائمز آف انڈیا میں لکھنے لگے بعد میں کلکتہ سے کامریڈ اخبار نکالا۔ پروفیسر ظہیر رحمتی نے کہا کہ اگر مولانا محمد علی جوہر آزادی کی تحریک میں شامل نہ ہوتے تو ملک آزاد نہیں ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ سید عتیق جیلانی سالک نے ثابت کیا کہ مولانا جوہر نجیب آباد میں نہیں رامپور کے کوچہ لنگر خانے میں پیدا ہوئے تھے۔

سینئر جوڈیشیل مجسٹریٹ جسیم خان نے رامپور کی

تعلیمی پسماندگی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی نے کہا کہ مولانا نے اپنی شناخت مسلمان اور ہندوستانی کی حیثیت سے کرائی۔ صولت پبلک لائبریری کے صدر ڈاکٹر محمود علی خاں نے کہا کہ ملک کی آزادی میں جو صعوبتیں مسلمانوں نے اٹھائیں انھیں آج فراموش کیا جارہا ہے۔ جشن جوہر میں اظہر عنایتی، آذر نعمانی، اظہر عنایتی، نعیم انجمی نے محمد علی جوہر کے تعلق سے منظوم تاثرات پیش کیے۔ مذاکرے میں ڈاکٹر کشور سلطانہ، ڈاکٹر تنویر احمد خاں، ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی، ڈاکٹر قاسم، ناصر خان علیگ، مولانا اسلم جاوید قاسمی، اطہر اللہ خاں، حسان آفندی، حامد رضا خاں، مسلم معین قریشی، ماسٹر اسرار احمد، صوفی ابن خاں، ناظم خان، زاہد خان فہیمہ بی آل احمد سرور وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر عدنان ضیائی نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12دسمبر2024

اکیسویں صدی میں تانیثی ادب

میرٹھ: 1948 سے مسلسل ہم تانیثیت پر بات کررہے ہیں۔ یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جس میں صرف عورتوں کے حقوق کی بات ہوتی ہے۔ یہ اکیسویں صدی ہے۔ اب نئی صدی میں عورت کمزور نہیں ہے۔ میڈیا کے ذریعے ہم اب اپنی بات دور تک پہنچا سکتے ہیں اب ہم دوسروں کے خیالات کی محتاج نہیں ہیں۔ یہ الفاظ تھے معروف فکشن نگار پروفیسر قمر جمالی کے جو شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیوسا) کے زیر اہتمام منعقد ادب نما کے ہفت روزہ پروگرام بعنوان 'اکیسویں صدی میں تانیثی ادب' میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنی تقریر کے دوران ادا کررہی تھیں۔ پروگرام کی سرپرستی صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی۔ صدارت کے فرائض ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور پروفیسر قمر جمالی (حیدرآباد) اور مہمانان ذی وقار کے بطور ڈاکٹر نعیمہ جعفری (دہلی)، ڈاکٹر ثروت خان (راجستھان)، ڈاکٹر آمنہ تحسین (حیدرآباد) اور نسترن فتیحی (علی گڑھ) نے شرکت کی جب کہ مقرر کے بطور ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین شریک ہوئیں۔ نظامت کے فرائض ایم اے سال دوم کی طالبہ فرح اور شکریے کی رسم ریسرچ اسکالر محمد ہارون نے ادا کی۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے کہا کہ اردو میں تانیثی ادب پر پہلے بھی کام ہوا ہے اور اکیسویں صدی میں بھی اس حوالے سے کام ہورہا ہے۔ معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے پروگرام کے تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اکیسویں صدی میں تانیثیت میں کون کون سے نئے پہلو ہم دیکھ رہے ہیں ان تمام امور پر گفتگو کی بہت ضرورت ہے۔ مغرب میں تانیثیت بہت آگے ہے۔ ہندوستان میں جو ادب لکھا جارہا ہے اس میں خواتین اب آگے آرہی ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 20دسمبر 2024

ڈاکٹر معراج ساحل کی یاد میں مشاعرہ و مذاکرہ

لکھنؤ: بزم شمس جدید رجسٹرڈ کی جانب سے ڈاکٹر معراج ساحل کی یاد میں پانچویں مذاکرے و مشاعرے کا اہتمام و انصرام مفڈ ماڈل پبلک اسکول گولہ گنج میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ہوا۔ اس موقعے پر ساحل صاحب کے فرزند ارجمند ڈاکٹر اسرار الحق قریشی کی دسویں تصنیف ہمہ رنگ کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ تقریب ایوارڈ میں ابوالفضل شمس لکھنوی ایوارڈ 2024 عارف محمود آبادی اور ڈاکٹر معراج ساحل ایوارڈ 2024 خلیل احسن کو دیا گیا۔ نثری حصہ کی صدارت ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے اور مشاعرہ کی صدارت صاحب دیوان شاعر محمد فاروقی جاذب لکھنوی نے کی۔ نظامت کے فرائض ابرار صارم و فاروق عادل نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔ صدر مشاعرہ نے صدارتی تقریر میں فرمایا کہ لکھنؤ میں غالباً یہ پہلا جلسہ ہورہا ہے جس میں اتنی کثیر تعداد میں ادیب و شاعر اور ادب نواز حضرات شامل ہوئے ہیں۔ اسرار قریشی بہت تیز لکھتے ہیں اور بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ان کے ذریعے سے اردو کی خدمت ہورہی ہے۔ ان کی جو کتاب آئی ہے ہمہ رنگ یقیناً یہ خود ہی ہمہ رنگ ہیں۔ ادیب و شاعر خلیل احسن نے شخصیت و شاعری پر تفصیلی مقالہ پیش کیا۔ جب کہ ڈاکٹر غفران نسیم نے ڈاکٹر اسرار اور 'ہمہ رنگ' تصنیف کے حوالے سے مقالہ پڑھا۔ ساحل صاحب کو شعری خراج تحسین پیش کرنے والوں میں مجیب صدیقی کرنیل گنجوی، یقین فیض آبادی، عزم گونڈوی، فاروق عادل، مسعود احمد فہمی کے نام قابل ذکر ہیں۔ آخر میں ایک مشاعرہ بھی ہوا جس میں شعرا نے اپنے کلام پیش کیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 17دسمبر 2024

قاضی عبدالستار: فکر وفن

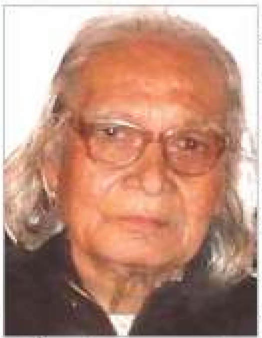

میرٹھ: قاضی عبدالستار کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے فکشن کو کئی اسلوب دیے، تاریخ، گاؤں دیہات اور غالب کے تعلق سے الگ الگ اسلوب ان کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار معروف فکشن نگار سید محمد اشرف نے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیوسا) کے زیر اہتمام منعقد 'پروفیسر قاضی عبدالستار: فکر وفن' میں بحیثیت مہمان خصوصی اپنی تقریر میں کیا۔ پروگرام کی سرپرستی صدر پروفیسر اسلم جمشید پوری اور صدارت پروفیسر صغیر افراہیم نے کی۔ مہمانِ خصوصی کے بطور معروف اور اور منفرد فکشن نگار سید محمد اشرف اور پروفیسر طارق چھتاری نے آن لائن شرکت کی اور مہمانان ذی وقار کے بطور پروفیسر غضنفر اور جی آر سید نے شرکت کی۔ مہمان اعزازی کے بطور آیوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین جب کہ مقالہ نگار کے بطور جموں و کشمیر سے عرفان عارف، عظمیٰ سحر (ریسرچ اسکالر) اور نزہت اختر نے شرکت کی۔ نظامت ڈاکٹر شاداب علیم اور شکریے کی رسم فرحت اختر نے ادا کی۔ پروفیسر قاضی عبدالستار کا تعارف پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر شاداب علیم نے کہا کہ منفرد اور باکمال فکشن نگار قاضی عبدالستار اردو ادب میں اپنے قیمتی سرمایے کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ انتظار حسین، قرۃ العین حیدر اور قاضی عبدالستار نے ایسا فکشن لکھا جس کا کوئی ہمسر نہیں۔ پروفیسر غضنفر نے اپنے استاد کا بے حد عمدہ خاکہ پیش کیا۔ جی آر سید نے پروگرام میں پڑھے گئے مقالوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ میری نظر میں قاضی صاحب کی حیثیت پیر و مرشد کی ہے۔

پروفیسر طارق چھتاری نے کہا کہ قاضی بہت سخت تھے لیکن اندر سے ان کا دل بہت نرم تھا۔ انھوں نے اس دور کے افسانہ نگاروں کی ہمت افزائی کی۔ پروفیسر ریشما پروین نے کہا کہ قاضی عبدالستار کی اصل تصنیف تو ان کے شاگرد یہاں موجود ہیں۔ آخر میں اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ ان کے عہد میں ناقدین ان کی بلندی سے ان کی پہنچ سے بہت ناراض رہتے تھے لیکن وہ جس طرح اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتے تھے آج ان کے شاگرد بھی اسی طرح اپنا نام روشن کررہے ہیں۔ اس موقعے پر عرفان عارف نے 'قاضی عبدالستار کی شخصیت اور فن'، عظمیٰ سحر نے قاضی عبدالستار کی ناول نگاری، داراشکوہ کے حوالے سے اور نزہت اختر نے 'پیتل کا گھنٹہ' ایک مخصوص معاشرے کا ترجمان عنوانات سے اپنے مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 جنوری 2025

شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ادبی تقریب

علی گڑھ: شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک ادبی تقریب منعقد کی گئی جس میں طلبہ، ریسرچ اسکالرز اور اساتذہ نے اپنی نثری کاوشیں اور شعری تخلیقات پیش کیں۔ صدر شعبہ اردو پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ادب کی مثال آئینہ سے دی جاتی ہے جس میں ہمارا اور ہمارے معاشرے کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ اس میں حال بھی نظر آتا ہے، ماضی بھی اور مستقبل بھی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر شہاب الدین ثاقب نے اپنے خطاب میں طلبہ کی ادبی کاوشوں کی ستائش کی اور بغیر کسی جھجک کے اپنا ادبی سفر جاری رکھنے کی تلقین کی۔ نوجوان استاد ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی نے آرٹس فیکلٹی کے حوالے سے لکھے گئے اپنے انشائیے میں یہاں کی علمی وادبی سرگرمیوں اور طلبہ کی بود و باش کا بخوبی احاطہ کیا۔ شعبہ کے استاد ڈاکٹر معید الرحمٰن نے 'اقبال کی نظموں کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ: بانگ درا کی روشنی میں' موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ شعبہ کی طالبہ مہوش ابرار اور صفیہ لیال نے 'انتظار' عنوان سے افسانے پیش کیے۔ شعبے کی اسکالر فرحین شکیل نے 'اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا' عنوان سے خوبصورت نظم پیش کی۔ ذکریٰ حمید، محمد فرید، صدام حسین اور صائن علیگ نے عمدہ غزلیں پیش کرکے داد وتحسین وصول کی۔ شعبے کی اسکالر سیما نے 'علی گڑھ سے وابستہ شعرا' موضوع پر مقالہ پیش کیا جس میں ترقی پسند تحریک، رومانی تحریک، جدیدیت اور مابعد جدیدیت دور کے ان شعرا کا جائزہ لیا گیا، جن کا کسی نہ کسی حوالے سے علی گڑھ سے تعلق رہا ہے۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی نے کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 2 جنوری 2025

بہار

زبیر الحسن غافل کی یاد میں شام غزل اور ایوارڈ پروگرام

اردیہ: مشہور شاعر اور سبکدوش جج زبیر الحسن غافل کی یاد میں شہر کے زیرو مائل میں واقع شاہی پیلیس ہوٹل میں بزم حسن کملد اہا اور شاہی پیلیس کے اشتراک سے شام غزل کا انعقاد ہوا۔ اس موقعے پر بزم حسن کی جانب اسلم حسن نے مہمانان کا استقبال کیا اور تعارفی کلمات پیش کیے۔ انھوں نے شام غزل اور تقسیم ایوارڈ کی غرض و غایت پر بات کرتے ہوئے کہا کہ ادبی ثقافت اور فن انسانی زندگی کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔ بزم حسن اپنے قیام سے ہی ادبی اور سماجی میدان میں سرگرم عمل ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے والد مرحوم زندہ دل اور انصاف پرور شخص تھے اور ان کی شاعری میں انسانیت دوستی کی جھلک ملتی ہے۔

'ابجد' کے مدیر اور شاعر رضی احمد تنہا نے زبیر الحسن غافل پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ بہار کے نامور شعرا میں سرفہرست تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بہار اردو اکادمی سمیت دیگر اداروں کی جانب سے ان کا اعزاز و اکرام ہوا۔ شاعرہ ریحانہ نواب کی شاعری سے سامعین محظوظ ہوئے۔ اس کے بعد ہندی کے ادیب بھولا پنڈت پرنئی، رگھوراج اور کلانائیہ سمیتی کملد اہا کو بزم حسن کے اراکین نے زبیر الحسن غافل ایوارڈ پیش کیا اور شال پوشی کی۔ اسی طرح ڈاکٹر عبدالقادر شمس اور ہارون رشید غافل کو بعد از مرگ زبیر الحسن غافل ایوارڈ پیش کیا گیا۔ شام غزل کی گلوکارہ ڈاکٹر رنجنا جھا نے مختلف گیت، غزل پیش کی۔ پروگرام کی نظامت مشیر عالم نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 دسمبر 2024

مہاراشٹر

عالمی یوم اردو کے موقعے پر نشست کا انعقاد

جلگاؤں: صوبہ مہاراشٹر میں علمی و ادبی سرگرمیوں کے لیے معروف شہر جلگاؤں میں عالمی یوم اردو کے

حوالے سے ایک نشست کا انعقاد مشتاق کریمی کے گوشہ عافیت 'دعائیں' پر کیا گیا۔ جس کی صدارت معروف محقق و ادیب ڈاکٹر شکیل احمد (مئوناتھ بھنجن) نے فرمائی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شفیق ناظم نے اپنی مرصع غزل سامعین کے گوش گزار کی جبکہ مولانا اویس قاسمی نے اپنی مترنم آواز میں کلام اقبال پیش کیا۔ سینئر فکشن رائٹر رشید قاسمی نے کہا کہ ہمیں درست اردو لکھنا چاہیے اور تلفظ کی ادائیگی صحیح طور پر کی جانی چاہیے۔ اردو اساتذہ اپنے بچوں کو بھی اردو میڈیم اسکولوں میں ہی داخل کرائیں تاکہ دیگران کے اس عمل سے تحریک پاسکیں۔ تنویر رضا برکاتی نے کہا کہ اردو کتابوں کی اشاعت جتنی ضروری ہے اتنا ہی ان کی ورق گردانی بھی اہم ہے۔ مشتاق کریمی نے کہا کہ اردو کا دامن اگر ہم چھوڑ رہے ہیں تو برادران وطن اسے بڑی شدت سے اپنا رہے ہیں یہ ایک خوش آئند امر ہے کہ اردو نے اپنی راہ خود نکال لی ہے۔ افتخار غلام رسول نے مطالعہ بیداری مہم کی تفصیلات پیش کیں جبکہ عارف محمد خان نے اردو کوئز کی اہمیت وافادیت بیان کی۔

اپنے صدارتی خطبے میں ڈاکٹر شکیل احمد نے کہا کہ اردو رسم الخط کی حفاظت ہمارا اولین فریضہ ہے۔ اردو کی ترقی، ترویج واشاعت نیز رسم الخط کی حفاظت کے لیے ہماری خواتین اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔ انھوں نے عوامی ادب وکلاسیکل لٹریچر کے مطالعے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے مطالعہ بیداری مہم اور اردو کوئز کی ستائش کی۔ ریحان کریمی کی رسم شکریہ پر نشست کا اختتام عمل میں آیا۔

پریس ریلیز: تنویر رضا برکاتی، جلگاؤں، 20 دسمبر 2024

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 2024 کا اعلان

نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی نے 18 دسمبر کو ’ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 2024‘ کا اعلان کردیا ہے۔ اکادمی کے سکریٹری

کے سرینواس راؤ نے پریس کانفرنس کے دوران 21 زبانوں کے لیے ایوارڈز کا اعلان کیا ہے جس میں 8 شعری مجموعے، تین ناول، دو کہانی کے مجموعے، تین مضامین، تین ادبی تنقید، ایک ڈرامہ اور ایک تحقیقی کتاب شامل ہے۔ قابل ذکر ہے کہ اردو، باڈلہ اور ڈوگری میں ایوارڈ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ ان ایوارڈز کی سفارش 21 ہندوستانی زبانوں کی جیوری کمیٹیوں نے کی تھی۔ اس موقعے پر ساہتیہ اکادمی کے صدر مادھوکوشک کی صدارت میں منعقدہ اکادمی کے ایگزیکٹو بورڈ کی میٹنگ میں ان کی منظوری دی گئی ہے۔ ایوارڈ یافتہ کتابیں ہیں (شعری مجموعے) کے لیے سمیر تانتی (آسامی)، دلیپ جھاویری (گجراتی)، گگن گل (ہندی)، کے جے کمار (ملیالم)، ہوبم ستیہ وتی دیوی (منی پوری)، پال کور (پنجابی)، مکوٹ منیراج (راجستھانی)، دیپک کمار شرما (سنسکرت)، ناول کے لیے: ارن رنجہ (بوڈو)، ایسٹرن کرے (انگریزی)، سوہن کول (کشمیری)، کہانی کا مجموعہ کے لیے: یووا برال (نیپالی)، ہندراج بلوانی (سندھی)، مضمون کے لیے: بکیش تھالی (کونکنی) مہندر ملنکیا (میتھلی)، بیشنب چرن سامل (اوڈیا)، ادبی تنقید کے لیے: کے وی نارائن (کنڑ)، سدھیر رسال (مراٹھی)، پینو گونڈا لکشمی نارائنا (تیلگو)، ڈرامے کے لیے: مہیشور سورین (سنتالی)، تحقیق کے لیے: اے آرونیکٹ چلپتی (تمل) کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ ایوارڈز سال کے آخری پانچ سالوں (یعنی یکم جنوری 2018 سے 31 دسمبر 2022) میں پہلی بار شائع ہونے والی کتابوں کو دیے جاتے ہیں۔ ایوارڈ کے لیے منتخب لوگوں کو 8 مارچ 2025 کو کمانی آڈیٹوریم، نئی دہلی میں منعقدہ ہونے والی ایک پروقار تقریب میں ایک کندہ تانبے کی تختی، شال اور ایک لاکھ روپے کی رقم پر مشتمل یہ ایوارڈ پیش کیے جائیں گے۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 19 دسمبر 2024

اردو اکادمی دہلی کے سالانہ ایوارڈ کا اعلان

نئی دہلی: اردو اکادمی دہلی کے چیئرمین اور دہلی حکومت کے وزیر برائے فن، ثقافت سوربھ بھاردواج نے اکادمی کی ایوارڈ و کلچرل پروگرام سب کمیٹی کی تجاویز اور ایگزیکٹو کمیٹی کے فیصلوں کی توثیق کرتے ہوئے سالانہ ایوارڈز برائے 24-2023 کے اعلان کی منظوری دے دی ہے۔ اس میں کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ، ممتاز ادیب اور ماہر سرسید پروفیسر افتخار عالم خاں (علی گڑھ) کو دیا جائے گا۔ ’کل ہند ایوارڈ برائے فروغ اردو زبان‘ مشہور نغمہ نگار جاوید اختر (ممبئی) کے نام کیا گیا ہے اور ’پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ایوارڈ‘ ممتاز ادیب، ناقد، شاعر اور جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر خالد محمود کو دیا جائے گا۔ یہ تینوں ایوارڈ پانچ لاکھ روپے نقد، سند، شال اور مومنٹو پر مشتمل ہیں۔ ان کے علاوہ ’ایوارڈ برائے تحقیق و تنقید‘ پروفیسر احمد محفوظ، ’ایوارڈ برائے تخلیقی نثر‘، رخشندہ روحی، ’ایوارڈ برائے شاعری‘ سلیم شیرازی ’ایوارڈز برائے بچوں کا ادب‘ طٰہٰ نسیم ’ایوارڈ برائے ڈراما‘ انیس اعظمی اور ’کل ہند ایوارڈ برائے سائنس‘ عابد معز (حیدرآباد) کو دیے جائیں گے۔ یہ تمام ایوارڈز دو لاکھ روپے نقد، شال، سند اور مومنٹو پر مشتمل ہیں۔

روزنامہ ’انقلاب‘ 3 جنوری 2025

پروفیسر جہانگیر وارثی

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات کے سربراہ پروفیسر محمد جہانگیر وارثی کو اردو زبان و

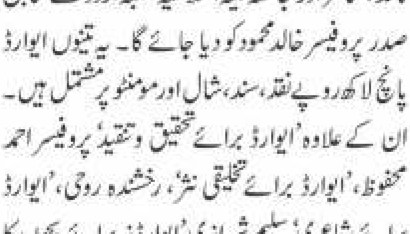

لسانیات میں ان کی گراں قدر علمی خدمات کے لیے اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار پٹنہ اور ضلع اردو زبان سیل دربھنگہ کے زیر اہتمام منعقد تقریب میں اعزاز سے نوازا گیا۔ ضلع مجسٹریٹ جناب راجیو روشن نے انھیں ایوارڈ پیش کیا۔ اس موقعے پر اپنے صدارتی کلمات میں پروفیسر وارثی نے کہا کہ اردو آج دنیا بھر میں بولی جانے والی سب سے بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔ دراصل اردو جنوبی ایشیا میں اسلامی تہذیب، تمدن اور تاریخ کی بنیادی زبان ہے۔ آج اردو کی شہرت ساری دنیا میں اپنے رسم الخط، میٹھے بول اور اپنے ذخیرہ ادب کی وجہ سے بے انتہا بڑھی ہے اور زبان میں تنوع اور ہمہ گیری پیدا ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں سنسکرت کی قدامت بھی ہے، پالی کا تقدس بھی، ہندی کی نزاکت بھی، دکن کی خوشبو بھی۔ کئی صدیوں سے اردو ہماری گنگا جمنی تہذیب کی بہترین مظہر اور معتبر ترجمان ہے جسے عام طور پر مشترکہ تہذیب بھی کہتے ہیں۔ امریکہ، کناڈا، افریقہ، یورپ، مشرق وسطی بالغرض دنیا کے ہر کونے میں اردو پہنچ چکی ہے اور دنیا بھر میں اردو کے اخبارات و رسائل نکل رہے ہیں۔ اردو کی انجمنیں بن رہی ہیں اور شعر و ادب کی محفلیں سج رہی ہیں۔ پروفیسر محمد جہانگیر وارثی معروف ماہر لسانیات ہیں اور ان کی ایک تصنیف ’میتھلی اردو‘ کو بین الاقوامی سطح پر ایک اہم تحقیق کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ علمی و تحقیقی کارناموں کے لیے انھیں کئی عالمی اور قومی ایوارڈ سے نوازا گیا جن میں واشنگٹن یونیورسٹی کے ذریعہ دیا گیا جیمس میکیو رڈ فیکلٹی ایوارڈ اہم ہے۔ پروفیسر وارثی واشنگٹن یونیورسٹی، کیلی فورنیا یونیورسٹی، میشی گن یونیورسٹی (امریکہ) جیسے موقر اداروں میں تدریسی فریضہ انجام دے چکے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی کے اردو مشاورتی بورڈ کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔

روزنامہ ’ہمارا سماج‘ دہلی، 12 دسمبر 2024

ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد

آگرہ: بزم میکش کے تحت ’یادِ میکش‘ پروگرام کے موقعے پر ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد کو قومی میکش ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ادبی تنظیم بزم میکش جو اردو کے کئی مشہور ادیبوں کو اعزاز پیش کر چکی ہے۔ اردو زبان و ادب کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد کو اردو زبان و ادب کی خدمات پر صوفی شاعر علامہ میکش اکبرآبادی کی یاد میں قائم کردہ 2024 کا 29 واں قومی میکش ایوارڈ

پیش کیا۔ یہ تقریب ہوٹل گرانٹ میں منعقد ہوئی جس میں تنظیم کے سرپرست سید اجمل علی شاہ قادری نیازی نے ڈاکٹر خواجہ کو شال اور ٹرافی پیش کی، جب کہ سید فیض علی شاہ نے سپاس نامہ پیش کیا۔ تقریب کے دوران تنظیم کی جنرل سکریٹری پروفیسر (ڈاکٹر) نسرین بیگم نے تنظیم کی رپورٹ پیش کی اور ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد کا تعارف کرایا۔ اس موقعے پر ایک سمینار بھی منعقد ہوا جس کا موضوع تھا 'علامہ اقبال اور تصوف'۔ ڈاکٹر عبدالباری (ماہنامہ اردو دنیا)، حقانی القاسمی نے اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے۔ تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی (سابق صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) تھے، وہیں اردو میں اعلیٰ نمبر حاصل کرنے والے طلبہ کو اس موقعے پر اسناد سے نوازا گیا۔ ان میں ایم اے میں انجم، نساء، نغمہ (سینٹ جانس کالج)، بی اے میں: نفیس الدین، فرحین اور اتل کمار کا نام قابل ذکر ہے۔ تقریب میں ڈاکٹر نسرین بیگم کی کتاب 'جوش ملیح آبادی: تنقیدی جائزہ' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ خاور ہاشمی اور اظہر عمری کو اردو وصحافت میں نمایاں خدمات کے لیے اسناد اور یادگاری شیلڈ سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر آگرہ کے اردو ادب کے شائقین نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 دسمبر 2024

مشتاق صدف

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اردو اکادمی میں استاد اور اردو کے ممتاز شاعر ڈاکٹر مشتاق صدف کو اردو

زبان و ادب کے میدان میں گراں قدر خدمات کے اعتراف میں علامہ اقبال ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ اور حیات فاؤنڈیشن، گوپال گنج، بہار کی جانب سے علامہ اقبال انٹرنیشنل ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے۔ ایک پروقار تقریب میں مہمان خصوصی اے ڈی ایم گوپال گنج، مسٹر ایس ایچ خان کے ہاتھوں ڈاکٹر صدف کو اس ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ ٹرسٹ کے نگراں اور سکریٹری مسٹر نذر حیات نے ڈاکٹر مشتاق صدف کو اس ایوارڈ کے لیے منتخب کیے جانے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ٹرسٹ کی ایوارڈ کمیٹی نے متفقہ طور پر ان کا انتخاب کیا کیونکہ معاصر منظرنامے پر ڈاکٹر مشتاق صدف کی گراں خدمات سے اہل زبان و ادب بخوبی واقف ہیں۔ حال ہی میں وہ بیرون ملک تاجکستان کی معروف تاجک نیشنل یونیورسٹی، دوشنبہ میں آئی سی سی آر چیئر پروزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے تین سال تک درس و تدریس کے فرائض انجام دے کر وطن واپس لوٹے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر مشتاق صدف نے ساہتیہ اکادمی میں پروگرام افسر کی حیثیت سے نو برسوں تک اردو کی خدمات انجام دیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 21 دسمبر 2024

اکبر رضا جمشید اردو ادب ایوارڈ کمیٹی کی جانب سے چار سرکردہ شخصیات کو ایوارڈ

پٹنہ: اکبر رضا جمشید اردو ادب ایوارڈ کمیٹی (جھارکھنڈ) کی جانب سے 25 دسمبر کو بہار اردو اکیڈمی کے کانفرنس ہال میں ایک ایوارڈ تقریب میں اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمات کے لیے چار سرکردہ شخصیتوں کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ ایوارڈ یافتگان میں ارشد فیروز، مفتی ثناء الہدیٰ، اے کے علوی اور بے نام گیلانی کے نام شامل ہیں۔ اس موقعے پر اردو ادب کی گرانقدر ادبی خدمات کے لیے سات اہم شخصیات ڈاکٹر شمع ناسمین نازاں، ڈاکٹر آصف سلیم، جلال اصغر فریدی، بدر محمدی، ڈاکٹر محمد ناصرالدین، پریم کرن اور ڈاکٹر محمد ندیم کو بھی اکبر رضا جمشید اردو ادب ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ایوارڈ حاصل کرنے والوں کو سلور میڈل، توصیفی اسناد اور شال سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر اکبر رضا جمشید کی تصنیف کردہ کتاب 'یادوں کے چراغ' کا اجرا بہار پبلک سروس کمیشن کے سابق چیئرمین امتیاز احمد کریمی و دیگر مہمانان کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس جشن اجرا و تقسیم ایوارڈ کی سرپرستی اکبر رضا جمشید، سابق ضلع جج و صدر اکبر رضا جمشید اردو ادب ایوارڈ کمیٹی (بہار، جھارکھنڈ) نے کیا جب کہ جلسے کی صدارت امتیاز احمد کریمی نے کی۔ مہمانان ذی وقار کی حیثیت سے مولانا مظہرالحق عربی و فارسی یونیورسٹی کے سابق پرووائس چانسلر پروفیسر توقیر عالم بھی موجود تھے۔ اس پروگرام کی نظامت معروف افسانہ نگار فخرالدین عارفی نے کی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی جسٹس ہیمنت کمار شریواستو نے کہا کہ اردو کا علم رکھنے والے ہندی اور انگریزی کا دھڑلے سے استعمال کر رہے ہیں۔ ہم لوگوں کو اردو کا قاری پیدا کرنا چاہیے۔ اردو ایک شیریں زبان ہے۔ اس کی حفاظت ہم لوگوں کی ذمے داری ہے۔ تمام ایوارڈ یافتگان مبارکباد کے مستحق ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 دسمبر 2024

رسم اجرا

خطبات شاہین

حیدرآباد: مولانا محفوظ الرحمٰن شاہین جمالی کے خطبات کا مجموعہ ہے 'خطبات شاہین' جس کی پہلی جلد کی رسم اجرا المعہد العالی حیدرآباد میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اور سابق ممبر پارلیمنٹ کے سی تیاگی نے فرمائی اور مولانا مشہود الرحمٰن شاہین جمالی کو خطبات شاہین کے مرتب کرنے پر مبارکباد پیش کی۔ اس موقعے پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے کہا کہ مولانا محفوظ الرحمٰن شاہین جمالی سابق مہتمم مدرسہ امداد الاسلام صدر بازار میرٹھ کینٹ ایک کامیاب محدث، باکمال مقرر اور مذاہب و ادیان سے واقف اور مقبول مصنف تھے اور ان کی کتابیں ہر حلقے میں پڑھی جاتی ہیں۔ اس موقعے پر سابق ممبر پارلیمنٹ کے سی تیاگی نے کہا کہ مولانا محفوظ الرحمٰن شاہین جمالی ایک بڑے عالم دین تھے جنھوں نے اپنی پوری زندگی سادگی کے ساتھ گزاری اور انسانیت کی خدمت کرتے رہے۔ اس موقعے پر مولانا مشہود الرحمٰن شاہین جمالی نے کہا کہ میرے والد محترم اپنی ذات میں ایک انجمن، محدث، محقق اور باکمال شخصیت تھے جو نام و نمود سے بالاتر رہے، جس کی وجہ سے اللہ نے ان کو شاہین جمالی کا صحیح مصداق بنایا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 دسمبر 2024

تشنہ لبی

علی گڑھ: ابن سینا اکیڈمی اور احسان فاؤنڈیشن انڈیا کے باہمی اشتراک سے ابن سینا اکیڈمی کے وسیع و عریض ہال میں اردو کے البیلے شاعر اسرار الحق مجاز کی

یاد میں ایک پروقار شعری نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پدم شری حکیم سید ظل الرحمٰن نے کی۔ اس موقعے پر معروف شاعر معراج الدین تشنہ کے شعری مجموعے 'تشنگی لبی' کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر سید ظل الرحمٰن نے کہا کہ اسرار الحق مجاز کی شاعری ہر عہد میں زندہ رہے گی۔ ان کی شاعری رومان و انقلاب سے بھری پڑی ہے۔ ڈاکٹر مشتاق صدف نے کہا کہ معراج الدین تشنہ نئے لب و لہجے کے شاعر ہیں جن کی معتبریت کے سب قائل ہیں۔ جانی فاسٹر اور نذر حیات نے بھی معراج الدین تشنہ کو ایک معروف شاعر قرار دیا۔ شعری نشست میں سرور ساجد، مشتاق صدف، معید رشیدی، جانی فاسٹر، مشرف حسین محضر، معراج الدین تشنہ، نسیم نوری، دانش مارہروی، غفران احمد، صدام حسین، شریف خان سامر، نصیر ناداں وغیرہ نے اپنے خوبصورت کلام سے نوازا۔ پروگرام کی نظامت مشرف حسین محضر نے بحسن و خوبی انجام دی۔ جب کہ شکریے کی رسم ڈاکٹر رفیع الدین نے ادا کی۔ اس موقعے پر مجاز سے متعلق کتابوں کی نمائش بھی کی گئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 دسمبر 2024

ریگ ایام

مالیگاؤں: انگریزی زبان کے مشہور و معروف مصنف سڈنی شیلڈن کے انتہائی دلچسپ اور سنسنی خیز

ناول دی 'سینڈز آف ٹائم' کے اردو ترجمے 'ریگ ایام' کا اجرا 29 دسمبر 2024 بروز اتوار، رات 10 بجے اسکس لائبریری ہال میں منعقد ایک شاندار و پروقار تقریب میں عمل میں آیا۔ اس ناول کو 'عثمان غنی اسکس' نے اردو کے روپ میں ڈھالا ہے۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر سعید احمد فارانی نے کی۔ سراج احمد دلار نے مترجم کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی۔ ساجد بیسٹ آئی ٹی نے بے حد خوبصورت سرورق کی رونمائی کی اور ٹائمز آف انڈیا کے اسسٹنٹ ایڈیٹر متین حفیظ کے ہاتھوں کتاب کا اجرا عمل میں آیا۔ تبصرے اور تاثرات کے لیے آصف سبحانی، رئیس احمد انصاری، عمران جمیل اور ڈاکٹر ذاکر خان ذاکر کو دعوت دی گئی۔ سبھی مبصرین نے ریگ ایام کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا اور اپنے تبصروں اور تاثرات سے نوازا۔ متین حفیظ اور ساجد بیسٹ آئی ٹی نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔ صدارتی خطبے میں ڈاکٹر سعید احمد فارانی نے ترجمہ اس کی افادیت اور اہمیت پر سیر حاصل گفتگو کی اور مترجم کی اس کاوش کی بھرپور ستائش کی۔ اسکس لائبریری ٹرسٹ نے عثمان غنی اسکس کی خدمات کا اعتراف کیا اور کیسہ زر و تحائف بھی پیش کیے۔ طارق اسلم نے منفرد انداز سے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ رضوان ربانی نے پروگرام کی کامیاب نظامت کی۔

رپورٹ: منجانب صدر اور اراکین پروگرام کمیٹی، مالیگاؤں، 1 جنوری 2025

منظور نظر

لکھنؤ: کاروان رہبر کے تحت نوجوان شاعر معید رہبر لکھنوی کے پہلے شعری مجموعے کی رسم اجرا و مشاعرہ کا اہتمام سٹی انٹر کالج کے سید نا صدیق اکبر ہال میں ہوا جس کی سرپرستی لندن سے مظفر احمد مظفر نے کی اور منصب صدارت پر رام پور کے استاد شاعر ڈاکٹر عبدالوہاب سخن جلوہ افروز ہوئے۔ شعری مجموعہ 'منظور نظر' کا اجرا عبدالوحید فاروقی کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ نظامت کے فرائض صحافی و شاعر ڈاکٹر ہارون رشید نے انجام دیے۔ شعری مجموعہ 'منظور نظر' پر سینئر صحافی و شاعر محمد مجاہد سید نے تفصیلی مقالہ پیش کیا جسے سامعین نے خوب سراہا۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر اسرار الحق قریشی نے پیش کیا جس میں انھوں نے معید کو اتنی کم عمری میں شعری مجموعہ لانے والا لکھنؤ کا اولین شاعر قرار دیا۔ شاعر و ادیب ڈاکٹر بچے مصرا شوق نے معید رہبر کی شاعری کو دل کی آواز کہا، جب کہ رضوان احمد فاروقی نے انھیں ایک حساس شاعر بتایا، وہیں آل انڈیا ریڈیو کے سابق اردو پروگرامر پرتل جوشی نے انھیں نوجوان شعرا کا رہبر بتایا، درس و تدریس سے وابستہ ادیب پرویز ملک زادہ نے معید رہبر کو اپنے تخلص کا پاسدار قرار دیا۔ معروف صحافی غفران نسیم نے معید رہبر کے کئی شعروں سے ان کی شخصیت کا تعارف پیش کیا۔ صدر محفل معروف شاعر ڈاکٹر عبدالوہاب سخن نے معید رہبر کو نئی نسل کا نمائندہ شاعر بتاتے ہوئے کہا کہ آج اردو ادب کو معید رہبر جیسے فعال اور متحرک سخنوروں کی ضرورت ہے تاکہ اردو شاعری کو پروان چڑھا سکیں اور اپنے اساتذہ سے اکتساب فیض بھی کر سکیں۔ آخر میں پپلو لکھنوی نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 10 دسمبر 2024

ہوڑہ رائٹرز اسوسی ایشن کے بینر تلے تین کتابوں کا اجرا و مشاعرہ

مورخہ 7 دسمبر 2024 بمقام نیف اپارٹمنٹ 163 دکھن بکسرا لین آندول روڈ۔ بوٹانیکل گارڈن۔ بوکل تلہ، ہوڑہ تین کتابوں کا اجرا اور ایک مشاعرہ زیر صدارت

جناب کلیم حاذق انجام پذیر ہوا۔ پہلے حصے کی نظامت جناب نصر اللہ نصر نے کی اور دوسرے کی جاوید مجیدی نے کی۔ اس موقعے پر اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ پہلے شاعر و ادیب کتابوں کا لین دین کیا کرتے تھے اس سے ان لوگوں کے اندر پڑھنے کا شوق ہوتا تھا اب یہ بالکل ناپید سا ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد منصور عالم صاحب (سابق صدر شعبۂ فارسی، گوہاٹی یونیورسٹی، آسام) نے ڈاکٹر معصوم شرقی کی کتاب 'اقبال بحر بیکراں' کا اجرا کیا۔ ڈاکٹر غلام سرور (سابق پروفیسر شعبۂ فارسی، مولانا آزاد کالج، کولکاتا) نے دوسری کتاب 'معصوم شرقی کے تبصرے' کا اجرا کیا۔ پروفیسر امتیاز وحید (کلکتہ یونیورسٹی) نے جناب شکیل انور کا پہلا شعری مجموعہ 'شعریات شکیل' کا اجرا کیا۔ ڈاکٹر منصور عالم نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنف کو ان کی تصنیف پر مبارکباد پیش کی اور سیر حاصل گفتگو کی۔ جناب غلام سرور کی گفتگو صرف تبصرے پر ہوئی۔ انھوں نے ڈاکٹر معصوم شرقی کو ایک اچھا تبصرہ نگار بتایا اور یہ بھی کہا کہ موصوف کے تبصرے بہت ہی نپے تلے ہوتے ہیں۔ پروفیسر امتیاز وحید نے 'شعریات شکیل' کے شاعر جناب شکیل انور کو کتاب کی اشاعت پر مبارکباد پیش کی اور کہا کہ یہ ان کی پہلی کوشش ہے۔ آئندہ یہ اس سے بہتر کتاب لانے کی

کوشش کریں گے۔ جناب سید انجم رومان نے تینوں کتابوں کی اشاعت پر مصنفین کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کیا۔ رانی گنج ٹی ڈی بی کالج کی پروفیسر محترمہ ڈاکٹر صابرہ خاتون حنا نے تمام اہلیان علم و ادب اور سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جناب معصوم شرقی اس عمر میں بھی ادب کا کام کیے جارہے ہیں جو ہم لوگوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ جناب شکیل انور کے بارے میں محترمہ نے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور انھیں اسی طرح سے ادب میں جڑے رہنے کا مشورہ دیا۔ اس کے فوراً بعد ہی جناب معصوم شرقی کی صدارت میں مشاعرہ شروع ہوا۔ جس میں شعرا نے کلام پیش کیے۔ آخر میں جناب نصر اللہ نصر نے تمام حاضرین اور منتظمین کا شکریہ ادا کیا۔

رپورٹ: جاوید مجیدی، سکریٹری، ہوڑہ رائٹرز اسوسی ایشن، 14 دسمبر 2024

افسانہ نما

بیدر: محمود شاہد ادب کا ایک سرگرم نام ہے۔ شاعری اور افسانہ ان کے میدان ہیں۔ انھوں نے پندرہ روزہ 'وسیلہ' کڑپہ سے نکالا۔ اس کے بعد اب دوماہی 'افسانہ نما' لے آئے ہیں جس کے سالنامہ کا اجرا ملپ پورم شہر ریاست کیرلہ میں وہاں کے رکن اسمبلی جناب پی عبید اللہ کے ہاتھوں کروایا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، یکم جنوری 2024

شرارِ گل

ہزاری باغ: انجمن ترقی اردو ہند، ہزاری باغ کے زیر اہتمام محمد وسیم خاں فردوسی عرف ٹنکو کھیا کے دولت کدے پر ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا، جس میں ہزاری باغ کے کہنہ مشق اور سینئر شاعر جناب ہارون شاداں کے شعری مجموعہ 'شرارِ گل' کی رسم اجرا کی تقریب منعقد ہوئی۔ اس نشست کی صدارت جناب شاہ نواز احمد خاں، سابق لیبر کمشنر، ہزاری باغ اور مشیم ہاشمی نے کی۔ اس نشست کی نظامت نٹ کھٹ عظیم آبادی نے کی۔ اس موقعے پر جی ایم جاوید بٹر اور نٹ کھٹ عظیم آبادی نے منظوم اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر زین رامش، سید عبید اللہ ہاشمی اور شاہ نواز احمد خاں نے کتاب اور مصنف کے سلسلے میں اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر زین رامش نے کہا کہ یہ بہت خوش آئند بات ہے کہ ہارون شاداں کا دوسرا شعری مجموعہ منظر عام پر آیا اور وہ اس کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ سید عبید اللہ ہاشمی نے ہارون شاداں کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ایک قطعہ پیش کیا۔ شاہ نواز احمد خاں نے بھی ہارون شاداں کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ اردو کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم ضرور دیں اور ساتھ ہی ساتھ اردو کا ایک اخبار یا رسالہ ضرور خریدیں تاکہ اردو کی ترقی ہو۔ آخر میں ڈاکٹر شمیم احمد ہاشمی نے ہارون شاداں کو مبارکباد دیتے ہوئے صدارتی خطبہ پیش کیا۔ ہارون شاداں نے حاضرین محفل کا شکریہ ادا کیا اور یہ نشست اختتام پذیر ہوئی۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 31 دسمبر 2024

مولانا محمد اسلام قاسمی کی سوانح اور چھ کتابوں کا اجرا

دیوبند: دارالعلوم وقف دیوبند کے سابق استاذ حدیث و شیخ الادب مولانا محمد اسلام قاسمی کی دو جلدوں پر مشتمل

سوانح حیات سمیت مزید 6 کتابوں کا اجرا علما کے ہاتھوں 27 دسمبر کو عمل میں آیا۔ اس پروگرام کی نظامت کے فرائض دارالعلوم وقف کے استاذ مفتی محمد اظہار الحق قاسمی نے انجام دیے اور صاحب سوانح کے حالات زندگی پر روشنی بھی ڈالی۔ کتابوں کے اجرا کے بعد مرحوم کے صاحب زادے اور مولف کتاب مولانا بدرالاسلام قاسمی استاذ جامعہ امام محمد انور شاہ نے تمام کتابوں کا تعارف پیش کرتے ہوئے بتایا کہ کیا شخص زمانے سے اٹھا (2 جلدیں، سوانح حیات)، نگارشات اسلام، چند مقتدر شخصیات، مقالات حکیم الاسلام، دارالعلوم دیوبند کی ایک صدی کا علمی سفرنامہ اور شیخ الادب زندگی کے کچھ پہلو نامی یہ کتابیں اساتذہ و طلبہ مدارس اور نسل نو کے لیے نہایت قیمتی ذخیرہ ہیں۔ اس موقعے پر رئیس الجامعہ اور دارالعلوم وقف دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی نے اپنے بیان میں مولانا اسلام قاسمی کے حوصلے اور محنت سے لبریز زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی۔ جھارکھنڈ سے آئے ہوئے دارالعلوم ندوۃ العلما کے سابق استاذ اور جامعہ ام سلمیٰ دھنباد کے بانی و ناظم مولانا آفتاب ندوی اور سماجی و رفاہی کاموں میں سرگرم مفتی سعید مظاہری نے کہا کہ مولانا اسلام قاسمی اپنی شہرت و مقبولیت اور صلاحیت کے باوجود چھوٹوں کے ساتھ نہایت مشفق و مہربان تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ مولانا سلمان بجنوری نقشبندی، مفتی محمد ساجد قاسمی، ہردوئی اور مولانا اشرف عباس قاسمی نے بھی صاحب سوانح کی خوبیوں کو بیان کیا اور ان کی بہترین خطاطی و فنکارانہ صلاحیتوں پر روشنی ڈالی۔ دارالعلوم وقف کے اساتذہ و مولانا مفتی محمد احسان قاسمی ندوی، مولانا فریدالدین قاسمی، مفتی محمد عارف قاسمی، قاری محمد واصف عثمانی، مولانا محمد شمشاد رحمانی اور مولانا سکندر قاسمی نے بھی صاحب سوانح کے اوصاف حمیدہ کا والہانہ ذکر کیا، ان کی وقت کی پابندی، ہمت و حوصلے اور تحقیق و وسعت مطالعہ کی وجہ سے مقبول تدریس وغیرہ کو طلبہ اور نوجوان فضلا کے لیے اسوہ و نمونہ قرار دیا۔ مولانا قاری شفیق الرحمٰن قاسمی میرٹھی نے مولانا اسلام قاسمی سے اپنے بے تکلفانہ مراسم کا ذکر کیا۔ دارالعلوم زکریا دیوبند کے مہتمم مولانا مفتی شریف خان قاسمی، مظاہر علوم وقف سہارنپور کے استاذ حدیث مفتی ناصرالدین مظاہری، مدرسہ ہدایت البنات کپواڑہ کے شیخ الحدیث مفتی نذیر احمد قاسمی، ایڈوکیٹ اسامہ ادریس ندوی، مولانا مجتبیٰ قاسمی وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا اور مولف کتب کو مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 دسمبر 2024

انشائیہ نگار خواتین، آزادی کے بعد

حیدر آباد: انشائیہ مغرب سے درآمد شدہ ایک غیر افسانوی صنف ہے جس نے اردو ادب میں بہت کم

وقت میں ارتقا کے قابل تحسین مراحل طے کر لیے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر تبسم آرا کے تحقیقی مقالے پر

مبنی تصنیف 'انشائیہ نگار خواتین آزادی کے بعد' ایک اہم کتاب ہے۔ اس میں انشائیے کے فنی ارتقا اور اہم خواتین تخلیق کاروں کے بارے میں بھرپور معلومات جمع کر دی گئی ہے۔' ان خیالات کا اظہار مہمانِ خصوصی، معروف انشائیہ نگار محمد اسد اللہ نے ڈاکٹر تبسم آرا کی تصنیف کے اجرا کے موقع پر کیا۔ تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکادمی، حیدرآباد کے خواجہ شوق ہال میں منعقدہ اس تقریب کی صدارت کے فرائض محترمہ پروفیسر اشرف رفیع (سابق صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی) نے انجام دیے۔ محترمہ سمیہ تمکین نے 'انشائیہ نگار خواتین آزادی کے بعد' کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس کتاب کے مختلف ابواب میں پیش کی گئی معلومات کو انشائیہ نگاری کے سلسلے میں اہم تحقیق سے تعبیر کیا۔ پروفیسر اشرف رفیع کے ہاتھوں 'انشائیہ نگار خواتین آزادی کے بعد' کی رسم رونمائی انجام دی گئی۔ اس موقعے پر اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے کہا کہ انشائیہ ایک ایسی ادبی صنف ہے جس میں ہلکے پھلکے اور بے تکلف انداز میں اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر تبسم آرا کو ان کی اس دوسری تصنیف کے اجرا پر مبارک باد پیش کی۔ ڈاکٹر تبسم آرا نے مہمانوں کے علاوہ اس مقالے کی تحقیق واشاعت کے دوران تعاون کرنے والی شخصیات کا بھی شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض لکچرر ڈاکٹر غوثیہ بانو نے انجام دیے۔

مرسلہ: ڈاکٹر تبسم آرا، حیدرآباد، 19 دسمبر 2024

سونکس آف علی گڑھ

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی کی سینئر استاد پروفیسر سمیع رفیق کی انگریزی نظموں کے

مجموعے 'سونکس آف علی گڑھ' کا اجرا یونیورسٹی کی سرسید اکیڈمی میں منعقدہ ایک تقریب میں ممتاز شاعرہ، مصنفہ اور ایڈیٹر پروفیسر سکریتا پال کمار اور اے ایم یو وائس چانسلر پروفیسر نعیمہ خاتون نے دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر فرحت حسن، ایوارڈ یافتہ ذولسانی مصنف پروفیسر شافع قدوائی، ڈائرکٹر، سرسید اکیڈمی اور پروفیسر عائشہ منیرہ کے ہمراہ کیا۔ اس مجموعے میں فطرت اور ثقافت پر نظمیں شامل ہیں۔ اس موقعے پر انسانی زندگی اور ماحولیات پر جدید ترقی کے اثرات، قدرتی ماحول کی بربادی، شناخت کے مسائل، مکانات، درخت، دریا اور تالاب کے ساتھ انسان کے تعلق اور روزمرہ کی زندگی کی مشکلات کی اشعار میں تصویرکشی پر دلچسپ معلوماتی گفتگو ہوئی۔ پروفیسر سکریتا پال کمار نے کہا کہ نظموں کے اس مجموعے میں علی گڑھ کو ایک استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اے ایم یو کی وائس چانسلر پروفیسر نعیمہ خاتون نے پروفیسر سمیع رفیق کو علی گڑھ پر مبنی فطرت کی نظموں کا مجموعہ شائع کرنے پر مبارکباد پیش کی جو غالباً انگریزی میں اس طرح کا پہلا مجموعہ ہے۔ پروفیسر فرحت حسن نے ماحولیاتی انحطاط کے بارے میں گہری تشویش کا اظہار کرنے پر نظموں کے مجموعے کو سراہا۔ پروفیسر حسن نے کتاب میں گھر، درختوں اور تالابوں جیسی اشیا کے ساتھ شاعر کے رشتوں کے مضبوط احساس کا ذکر کیا۔ پروفیسر شافع قدوائی نے اردو کے مشہور شاعر مجاز کی نظم رات اور ریل اور سمیع رفیق کی علی گڑھ جنکشن کے درمیان مماثلت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ رومانوی شاعر ہمیشہ فطرت کی بات کرتے ہیں، لیکن رفیق کی نظمیں رومانیت سے بالاتر ہیں۔ پروفیسر عائشہ منیرہ رشید نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ سمیع رفیق کی نظمیں شمالی ہندوستان کے ایک چھوٹے شہر کی منظرکشی کرتی ہیں جو اسمارٹ سٹی ہے لیکن یہاں وسیع پیمانے پر قدرتی مظاہر کی تباہی بھی دکھائی دیتی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 18 دسمبر 2024

خراشیں

علی گڑھ: بزمِ نوید سخن علی گڑھ کے زیراہتمام معروف انشائیہ وطنز ومزاح نگار تقدیس نقوی کے مضامین کا مجموعہ 'خراشیں' کی جامعہ اردو علی گڑھ میں رسم اجرا کی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں اردو ادب کے ممتاز اساتذہ کرام، محققین، ناقدین، اسکالرس اور مقالہ نگاروں نے شرکت کی۔ تقریب کا افتتاحی اجلاس مذاکرے پر مشتمل تھا جب کہ اختتامی اجلاس میں ایک شعری نشست منعقد کی گئی۔ تقریب کی صدارت نامور ادیب، محقق، صدر شعبہ ماس کمیونیکیشن اور پروفیسر شافع قدوائی نے کی جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر بصیر الحسن وفا نقوی نے انجام دیے۔ اردو کے نامور ادبا اور ناقدین نے تقدیس نقوی کے اسلوب نگارش اور خراشیں کے مختلف مضامین پر اپنی آرا کا اظہار کیا جن میں پروفیسر قدوائی، مشہور ادیب و محقق، اردو جریدہ سیما کے مدیر اور سابق صدر شعبۂ اردو اے ایم یو علی گڑھ پروفیسر صغیر افراہیم، عالمی شہرت یافتہ فکشن نگار و محقق اور سابق صدر شعبۂ اردو اے ایم یو پروفیسر طارق چھتاری، معروف ادیب اور ناقد پروفیسر عارف حسن خاں سابق صدر شعبۂ اردو ہندو ڈگری کالج مراد آباد، نامور محقق اور موجودہ صدر شعبۂ اردو اے ایم یو پروفیسر قمرالہدیٰ، رثائی ادب کے عالمی شہرت یافتہ محقق اور صدر شعبۂ اردو ڈگری کالج سنبھل پروفیسر عابد حسین حیدری، نامور ادیب اور سینئر صحافی ڈاکٹر جناب شجاعت حسین اور کشمیر سے آئے ہوئے پروفیسر محمد آصف ملک نے تقدیس نقوی کے اسلوب نگارش اور 'خراشیں' کے مختلف مضامین پر ناقدانہ تبصرہ کیا اور سامعین کو مضامین کی خصوصیات اور تقدیس نقوی کے منفرد اور مخصوص انداز تحریر کی ادبی جہات، تہہ داریوں اور باریکیوں سے روشناس کرایا۔ مذاکرے کا آغاز تقدیس نقوی کے فرزندان ڈاکٹر کامران تقدیس، انجینئر ظفر تقدیس اور ان کی خواہر محترمہ ہما نقوی کی مختصر جذباتی تقاریر سے ہوا۔ تقدیس نقوی نے علی گڑھ سے اپنے دیرینہ تعلق اور اپنے مجموعے کے مختلف مضامین کے پس منظر سے سامعین کو متعارف کرایا۔ پروفیسر قدوائی نے تقدیس نقوی کو ان کی کتاب پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ تقدیس نقوی کی تحریر میں طنز ومزاح کے پردے میں اصلاح کا پہلو روشن نظر آتا ہے۔ پروفیسر افراہیم نے تقدیس نقوی کا بینکنگ کے شعبے میں جہاں ادبی ماحول کا فقدان ہوتا ہے طویل عرصے گزارنے کے باوجود طنز ومزاح کی صنف اختیار کرنے کی مماثلت مشتاق یوسفی سے کی اور کہا کہ بینکنگ نے بھی اردو ادب کو دو بڑے طنز ومزاح نگار دیے ہیں۔ پروفیسر قمرالہدیٰ نے اپنی تقریر میں کہا کہ تقدیس نقوی کا انداز تحریر بہت دل نشیں ہے اور وہ اپنے طنز ومزاح سے زخم نہیں بس خراشیں ڈالتے ہیں۔ پروفیسر عارف حسن خاں نے تقدیس نقوی کے اس جذبے کی

قدردانی کی کہ انھوں نے اپنی کتاب کے اجرا کے لیے اپنی مادر درس گاہ علی گڑھ کا انتخاب کیا۔ پروفیسر طارق چھتاری نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ تقدیس نقوی کی تحریر پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا کوئی فکشن نگار ہے۔ ان کی تحریروں میں افسانوی رنگ جھلکتا ہے۔ عابد حسین حیدری نے تقدیس نقوی اور خراشیں پر ایک مکمل مقالہ پڑھا جس میں انھوں نے تقدیس نقوی کے ادبی خاندانی پس منظر اور ان کے اسلوب کی انفرادیت کا احاطہ کیا۔ ڈاکٹر محمد آصف ملک نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے خراشیں میں شامل مضمون 'شیروانی' پر مفصل گفتگو کی۔ اختتام مذاکرہ پر وقفہ کے بعد شعری نشست منعقد کی گئی جس میں نامور شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا۔ اختتام تقریب پر تقدیس نقوی کی بیٹی ڈاکٹر فرح تقدیس نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 4 جنوری 2025

عالمی نامہ

بہ یادِ غالب بین الاقوامی مذاکرہ و مشاعرہ

تولھوا رنیپال: غالب کی شاعری زندگی کے مختلف النوع رنگ سے عبارت ہے۔ زندگی کے مختلف رنگوں کا ایک سچا شعور اور کھرا رنگ غالب کے یہاں ملتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار اردو فاؤنڈیشن نیپال کے صدر سحر محمود نے فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام غالب کی یاد میں منعقد بین الاقوامی مذاکرہ و مشاعرہ کے موقعے پر گوتم بدھ ہوٹل، تولھوا نیپال میں کیا۔ وہ مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے غالب کی مقبولیت اور ان کی شاعری کی خصوصیات پر اظہار خیال کر رہے تھے۔ اس موقعے پر مشہور شاعر ثاقب ہارونی نے کہا کہ غالب کی شاعری میں زبان و تہذیب کا ایک بالیدہ شعور ملتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ غالب کی شاعری کا شمار دنیا کی بڑی شاعری میں کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے غالب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ مذاکرے کے بعد مشاعرے کا آغاز ہوا جس کی نظامت ڈاکٹر عمیر منظر نے کی اور صدارت ڈاکٹر جاوید کمال نے۔ اس موقعے پر اردو فاؤنڈیشن نیپال کی جانب سے شعرائے کرام کو یادگاری نشان پیش کیے گئے۔ فیس بک کے توسط سے مشاعرہ براہ راست بھی نشر کیا گیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر جاوید کمال، ڈاکٹر عمیر منظر، ثاقب ہارونی، سحر محمود، ریاض قاصد، شاداب شبیری، پنکج سدھارتھ، شیو ساگر سحر، انصر نیپالی، شاد حشمت اور سراج انور نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 دسمبر 2024

انسانیت اور محبت کا شاعر ساحر لدھیانوی

احمد آباد: نوجوان مصنف، اسکالر استوتی اگروال کی کتاب 'انسانیت اور محبت کا شاعر ساحر لدھیانوی' کا سرکردہ ادبی شخصیات کے ہاتھوں اجرا عمل میں آیا۔

تقریب کی صدارت پروفیسر محی الدین بامبے والا نے کی۔ اس موقعے پر انھوں نے ساحر سے متعلق کئی واقعات بیان کیے۔ واضح رہے کہ ساحر لدھیانوی پر لکھی گئی کتاب کے مصنف سریندر دیول ہیں جن کا اردو میں ترجمہ استوتی اگروال نے کیا ہے۔ 'ماوئی ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ' (ماوئی) کے زیر اہتمام سردار پٹیل اسمارک بھون میں منعقدہ تقریب میں امریکہ میں مقیم سریندر دیول کا آڈیو پیغام بھی پیش کیا گیا جس میں انھوں نے اردو کی چاشنی اور جاذبیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''انگریزی کو کئی معنوں میں بالادستی حاصل ہو سکتی ہے مگر اس میں اردو جیسی حلاوت نہیں ہے، اس لیے مجھے اپنی کتاب کے اردو ترجمے کو دیکھ کر بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ اس موقعے پر فیروز کمال نے کہا کہ ساحر کی نظم 'تاج محل' منظر عام پر آئی تو گویا ملک دو حصوں میں بٹ گیا تھا، ایک حصہ نظم کی مخالفت کر رہا تھا دوسرا اس کا زبردست حامی تھا۔ تقریب میں جن دیگر شخصیات نے اظہار خیال کیا ان میں احمد خان، شاہد لطیف، سیفی سرونجی، ڈاکٹر قاسم امام، فاروق سید، عزیز اللہ شیرانی، اشفاق عمر اور ڈاکٹر نثار احمد صدیقی شامل ہیں۔ مقررین نے کتاب کا ترجمہ نہایت سلیس، رواں اور بامحاورہ زبان میں کرنے پر استوتی اگروال کو مبارکباد دی اور اردو زبان سے ان کے والہانہ لگاؤ کو فال نیک قرار دیا۔ اردو کے ممتاز شاعر جینت پرمار، تنقید نگار شفاعت قادری اور استوتی کے والد انل اگروال نے اس تقریب کو خاص طور پر رونق بخشی۔ پروگرام کی نظامت بشیر رضوی نے کی، جلسے کے بعد مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 18 دسمبر 2024

رنگ سخن کا

نئی دھلی: نئی دہلی کے ایوان غالب آڈیٹوریم میں 4 جنوری کی رات غزلوں کی مٹھاس اور لفظوں کی گونج سے گرم ہوگئی۔ پروگرام میں حاضرین نے شعرا کو خوب داد دی۔ یہ پروگرام سماجی و ثقافتی تنظیم میزان کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا۔ پروگرام کے پہلے سیشن میں

اردو کے مشہور شاعر ڈاکٹر ماجد دیوبندی کی کتاب 'رنگ سخن کا' کی رونمائی ہوئی۔ انڈیا اسلامک کلچر سینٹر کے صدر اور سابق مرکزی وزیر سلمان خورشید، تسمیہ سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر سید فاروق اور دیگر معززین کی موجودگی میں اس کتاب کا اجرا کیا گیا۔ پروگرام میں مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کو اعزاز سے نوازا گیا۔ سرسید ایوارڈ سراج الدین ہاشمی (ان کے بیٹے برہان الدین ہاشمی نے ان کی غیر موجودگی میں قبول کیا)، فخر اردو ایوارڈ: ندیم عباس زیدی، خدمت خلق ایوارڈ: احمد رضا، فخر الدین بیگ ایوارڈ: قمر الحسن بیگ کو دیا گیا۔ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے سابق مرکزی

وزیر سلمان خورشید نے کہا کہ اس طرح کے پروگرام لوگوں کو قریب لاتے ہیں اور نئی چیزیں سیکھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ تسمیہ سوسائٹی کے بانی ڈاکٹر سید فاروق نے بھی ڈاکٹر ماجد دیوبندی کو مبارکباد دی۔ ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے جس نے اس کی قدر کی وہ ہمیشہ کامیاب ہوا۔ اس نشست کی نظامت ڈاکٹر حبیب الرحمٰن نے کی۔ مشاعرہ کا دوسرا سیشن غزلوں اور گیتوں سے بھرا ہوا تھا، جس میں شعرا نے اپنی غزلوں اور گیتوں سے سامعین کو مسحور کیا۔ پروگرام کی نظامت معین شاداب نے کی، جب کہ ڈاکٹر ماجد دیوبندی کے شکریے پر اس کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 جنوری 2025

باتوں باتوں میں

اورنگ آباد: شہر اورنگ آباد سمبھاجی نگر مہاراشٹرا میں مرصع آرٹ کلچرل اینڈ لٹریری فاؤنڈیشن کی جانب سے ثقافتی پروگرام منعقد کیا گیا، جس میں ڈاکٹر ہاجرہ

بانو کے تحریر کردہ ڈراموں پر مبنی کتاب 'باتوں باتوں میں' کا اجرا محفل کے صدر مقیم خان سابق نیوز ریڈر آکاش وانی آل انڈیا ریڈیو کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ آکاش وانی آل انڈیا ریڈیو کی نشریات کے لیے ڈرامہ تحریر کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کیوں کہ اس میں کئی پابندیوں کو ملحوظ خاطر رکھنا پڑتا ہے۔ شہر اورنگ آباد سے اردو پروگرام بند ہو چکے ہیں لیکن ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے ان ڈراموں کو شائع کر کے اسے دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔ مہمان خصوصی اسلم مرزا نے کتاب کے انتساب کی گہرائی پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ بابائے افسانچہ عظیم راہی نے ڈرامے کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے اپنی نیک تمنائیں پیش کیں۔ اس تقریب میں وشال نکاڑے، سید خرم، سپنا، اور دوست محمد خان نے اپنے گیتوں، رقص اور غزل گوئی سے حاضرین کا دل جیت لیا۔ شیخ

شاعر اور مترجم الحاج ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی کی کتاب 'سحر سندیلوی-حیات اور کلام' کا اجرا

صدام نے اپنے منفرد انداز میں نظامت کے فرائض انجام دیے۔ شہر کے ادبی اور تعلیمی حلقوں سے تعلق رکھنے والے باذوق حاضرین بھی اس موقعے پر موجود تھے۔

قندیل آن لائن ڈاٹ کام

سحر سندیلوی: حیات اور کلام

لکھنؤ: مسرور میموریل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، لکھنؤ کے زیر اہتمام مشہور و معروف صحافی ابراہیم علوی کی زیر صدارت تقریب میں شاعر اور مترجم الحاج ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی کی کتاب 'سحر سندیلوی: حیات اور کلام' کا اجرا سینٹ روز پبلک اسکول واقع گڑھی پیر خاں، پسند باغ، لکھنؤ میں عمل میں آیا۔ اس تقریب میں روزنامہ 'صحافت' برمنگھم (برطانیہ) کے چیف ایڈیٹر جناب امیر مہدی نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت فرمائی۔ انھوں نے کہا کہ مجھے بے حد خوشی کا احساس ہو رہا ہے کہ لکھنؤ میں شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری بھی ہو رہی ہے۔ شمس سندیلوی نے کہا کہ ڈاکٹر سعید کی اب تک تقریباً بارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مہمان اعزازی عبداللہ صدیقی ایڈوکیٹ نے وقت کی اہمیت پر روشنی ڈالی نیز ہر جگہ وقت کی پابندی کیے جانے پر زور دیا۔ تقریب کی صدارت کر رہے ابراہیم علوی نے سندیلہ کی اہم شخصیات اور ان کے اہم کارناموں پر روشنی ڈالی۔ نظامت کے فرائض رضوان احمد فاروقی نے انجام دیے۔ اس کے بعد ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں عمر سندیلوی، ماجد نثار آشتی، نظام الہ آبادی، پروفیسر عتیق احمد فاروقی عتیق غازی پوری، رفعت شیدا صدیقی، اعظم صدیقی، خالد صبر حدی، محسن عظیم انصاری، مسرور شاہجہانپوری، محمد فیصل خان سحر ملیح آبادی اور ارشاد کے نام قابل ذکر ہیں۔ تقریب کے آخر میں سعید سندیلوی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 10 دسمبر 2024

وفیات

علامہ قمرالدین گورکھپوری

دیوبند: دارالعلوم دیوبند کے سینئر استاذ، شیخ الحدیث ثانی علامہ قمرالدین کا 22 دسمبر کو اتوار کی صبح محلہ دیوان میں واقع اپنی رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ مرحوم تقریباً 85 برس کے تھے۔ مولانا کے انتقال کی خبر عام ہوتے ہی ان کی رہائش گاہ

پر دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ، علماء کرام، طلبہ، سیاسی اور سماجی شخصیات سمیت شہر کے سرکردہ لوگوں کا تعزیت کے لیے تانتا لگ گیا اور انھوں نے مولانا کے انتقال کو دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کے ایک باب کا خاتمہ قرار دیا۔ قابل ذکر ہے کہ علامہ کی علمی خدمات کا سلسلہ نصف صدی سے زائد پر محیط ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں انھیں ایک مقبول استاد کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ وہ گزشتہ کچھ دنوں سے سخت علیل تھے۔ مظفر نگر سمیت متعدد ہسپتالوں میں ان کا علاج ہوا۔ تشویشناک حالت کے سبب ڈاکٹروں نے انھیں گھر بھیج دیا تھا۔ مرحوم نے دارالعلوم دیوبند میں تقریباً 50 سال تک تدریسی خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے تلامذہ کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ ان کی نماز جنازہ بعد نماز ظہر احاطہ مولسری دارالعلوم دیوبند میں صدر مدرسین دارالعلوم دیوبند مولانا سید ارشد مدنی نے ادا کرائی۔ قبرستان قاسمی میں مولانا کی تدفین عمل میں آئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 دسمبر 2024

شبیر شاد

سہارنپور: سہارنپور سے روزنامہ 'انقلاب' کے سینئر

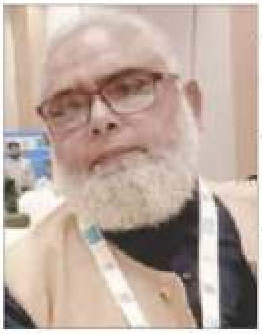

صحافی اور معروف شاعر شبیر شاد کا حرکت قلب بند ہونے سے اچانک انتقال ہوگیا۔ انھیں ان کے آبائی قبرستان قطب شیر سہارنپور میں سپرد خاک کیا گیا۔ اطلاع کے مطابق تقریباً 10 بجے مرحوم کے سینے میں درد کی شکایت ہونے پر انھیں ڈاکٹر محمد کلیم کے یہاں داخل کرایا گیا، لیکن ان کی تشویش ناک حالت کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹروں نے انھیں تاراوتی ہسپتال ریفر کردیا تھا، جہاں دوران علاج ان کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی عمر 66 سال تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ، 3 بیٹیاں اور ایک بیٹا ہیں۔ مرحوم کی نماز جنازہ عشا کی نماز کے بعد ادا کی گئی۔ شبیر شاد نے آبائی تعلیم اسلامیہ اسکول میں حاصل کی۔ وہ نہایت متحرک اور سرگرم صحافیوں میں شمار کیے جاتے تھے، صحافت کے ساتھ ساتھ وہ اردو ادب سے بھی گہرا شغف رکھتے تھے اور شعروشاعری کے باعث اردو محفلوں کی رونق ہوا کرتے تھے۔ وہ گزشتہ تقریباً 40 برسوں سے اردو صحافت کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دے رہے تھے۔ متعدد قومی روزناموں میں ان کی خدمات کو یاد رکھا جائے گا۔ وہ گزشتہ 12 سال سے روزنامہ 'انقلاب' سے منسلک تھے۔ مرحوم نے سہارنپور میں رہ کر ملکی سطح پر ادب وصحافت میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ شبیر شاد کا انتقال یقینی طور پر نہ صرف ضلع سہارنپور بلکہ اردو ادب وصحافت کا ایک بڑا نقصان ہے، ان کے اچانک انتقال سے علمی، صحافتی اور سماجی حلقوں کی فضا مغموم ہے۔ وہ اردو پریس کلب سہارنپور کے جنرل سکریٹری اور ضلع پریس کلب سہارنپور کے رکن تھے۔ اس کے علاوہ وہ متعدد ادبی وصحافتی اور سماجی تنظیموں سے بھی وابستہ تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 جنوری 2025

ابوالخیر احمد

سرائے میر، اعظم گڑھ: سینئر صحافی ابوالخیر احمد کا انتقال ہوگیا۔ بعد نماز عصر آبائی گاؤں نیاؤج میں ہزاروں سوگواروں کے بیچ مرحوم کو سپرد خاک کردیا گیا۔ اطلاع کے مطابق ابوالخیر احمد موضع نیاؤج کی صبح لکھنؤ میں علاج کے دوران انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی صحت گزشتہ کئی برسوں سے متاثر چل رہی تھی مگر حسب معمول وہ اپنا کام کررہے تھے۔ دو روز قبل طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو اہل خانہ لکھنؤ لے گئے جاں علاج کے دوران 65 برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی پوری زندگی صحافت میں گزری، وہ بے خوف صحافی تھے۔ آواز ملک سے انھوں نے صحافت کا آغاز کیا اور زندگی کی آخری سانس تک صحافت سے وابستہ رہے۔ مرحوم کے انتقال کی خبر سے پورے علاقے کی فضا سوگوار ہوگئی۔ جنازے میں صحافی، سماجی سیاسی شخصیات کے علاوہ کثیر تعداد میں عوام شریک ہوئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 جنوری 2024

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

240 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................. بتاریخ.................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/240 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں: دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail: magazines@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کشاف اصطلاحات ادبیات (جلد اول)

مصنف: عتیق اللہ

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: 627+26

قیمت: 340 روپے

کشاف اصطلاحات ادبیات (دوم)

مصنف: عتیق اللہ

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: 644+23

قیمت: 340 روپے

کشاف اصطلاحات ادبیات (سوم)

مصنف: عتیق اللہ

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: 355+21

قیمت: 235 روپے

باقیات شکیل الرحمٰن (جلد اوّل تا پنجم)

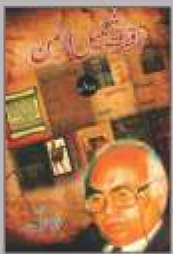

مرتب: شیخ عقیل احمد

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: تقریباً 3400

قیمت: 2190 روپے (مکمل سیٹ)

نوم چامسکی

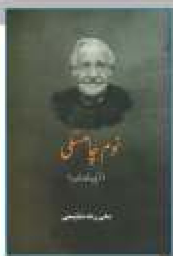

مصنف: علی رفاد فتیحی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 54

قیمت: 70 روپے

حالی کی غزلیں اور قطعات

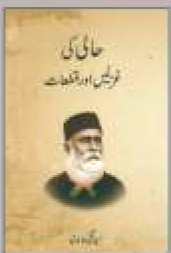

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 185+66

قیمت: 150 روپے

حالی کا سیاسی شعور

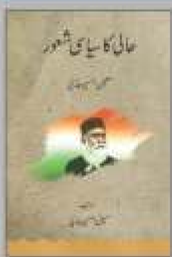

مصنف: معین احسن جذبی

مرتب: سہیل احسن جذبی

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 164، قیمت: 215 روپے

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

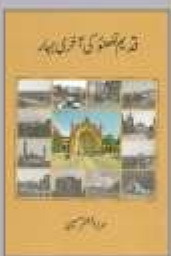

مصنف: مرزا جعفر حسین

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 671

قیمت: 355 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, फ़रवरी–2025,वर्ष:27, अंक:02
URDU DUNIYA Monthly, February-2025, Vol.27, Issue:02
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/01/2025
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ = بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

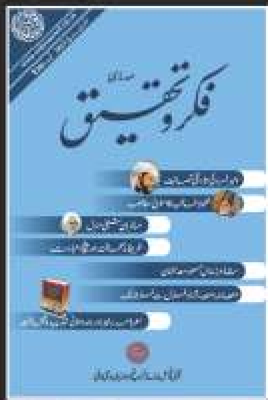

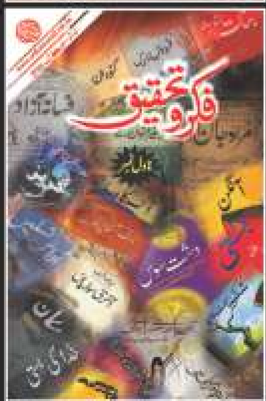

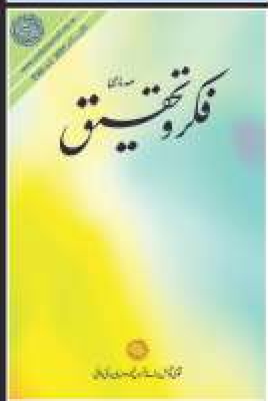

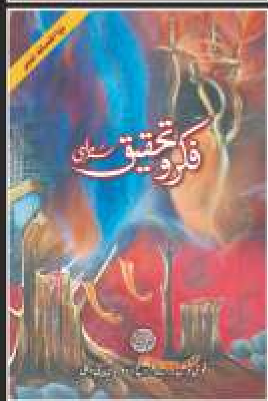

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6